اردو شاعری کے ارتقا
میں
ہندو شعراء کا حصّہ

(تحقیقی اور تنقیدی مقالہ)

مصنفہ

گنپت سہائے سریواستو

ایم۔ اے، ایل۔ ٹی

لکچرر۔ گورنمنٹ انٹر کالج۔ پرتاپ گڈھ۔ اترپردیش

ناشر —— برج باسی لال گوڑ ایم۔ اے
۳۷۹۔ بادشاہی منڈی۔ الہ آباد۔۳

طابع —— اسرار کریمی پریس۔ الہ آباد

خطاط —— ریاض احمد
۳۔ سلطان پور بھاوا۔ الہ آباد۔۳

Rs 40/=

بار اوّل ۱۹۶۹ء

فہرست

معروضات

تحقیق و تفتیش کے راستوں میں سیکڑوں سنگ گراں ہوتے ہیں۔ ان سب کو ہٹانے اور دور پھینکنے میں بڑی دشواریاں لاحق ہوتی ہیں۔ ان پر قابو پانے میں محقق کو بڑی محنت و ریاضت سے کام لینا پڑتا ہے۔ کبھی یہ دشواریاں بہت جلد حل ہو جاتی ہیں اور منزل مقصود تھوڑے ہی عرصہ میں سامنے آجاتی ہے اور کبھی دشواریوں میں دشواریاں اتنی زیادہ نکل آتی ہیں کہ حصول مقصد تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی سابقہ ہوا۔ ریسرچ کا موضوع میری اپنی پسند تھی۔ میں نے ہی اسے منتخب کیا۔ یہ موضوع مجھے بڑا محبوب تھا اور آج بھی ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ جوان عمری میں اس کی وسعت کا اندازہ نہ لگا سکا تھا۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد ریسرچ کے درجہ میں میں نے الہ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ غور و خوض کی ابتدا ہوئی: مواد کی فراہمی میں منہمک ہوتے ہی یہ واضح ہونے لگا کہ کام بہت بڑا ہے۔ موضوع سے عہدہ برا ہونا آسان بات نہیں ہے۔ یونیورسٹی کے کتب خانے سے استعانت کی کوئی خاص امید نہ تھی۔ میری تحقیق کے رہنما پروفیسر سید ضامن علی صاحب سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی تھے۔ موصوف انتہائی مصروف و مشغول انسان تھے۔ سوجھ بوجھ بڑی اچھی تھی۔ نظر بھی کافی وسیع تھی۔ میری اپنی ہی کوتاہی

سمجھے کہ موصوف سے اتنی ہی ہدایت حاصل کر سکا کہ جہاں کہیں ہندو شعرا کا کلام ملے فراہم کیا جائے۔ ایک فرمانبردار شاگرد کی حیثیت سے بس اتنے سے ہی حکم پر میں تلاش مواد میں منہمک ہو گیا۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ مجھے کیسی دوا دوش کرنا پڑی۔ نہ جانے کتنے کنوئیں جھانکنے پڑے اور کہاں کہاں کی خاک چھاننا پڑی۔ بے سروساماں مجھے دہلی، لکھنؤ، آگرہ بریلی بدایوں اور اتر پردیش کے دوسرے شہروں کو متعدد بار جانا پڑا اور ان شہروں کے تنگ و تاریک کوچوں میں جا کر ہندو شعرا یا ان کے افراد خاندان سے منت سماجت کرنی پڑی کہ وہ اپنا یا اپنے بزرگوں کا کلام دیکھنے کہ مجھے اجازت دیں اور زندگی کے حالات بتائیں۔ مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی ہچک نہیں ہے کہ ہندو شعراء کے ورثا نے بڑی ہمت افزائی کی۔ کہیں کہیں مجھے ناکامی بھی ہوئی اور بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔

فراہمی مواد میں میرا بڑا وقت لگا۔ میں نے اپنے ریسرچ کی ابتدا ۱۹۳۶ء میں کی تھی اور کل مواد ۱۹۵۶ء تک فراہم اور مرتب ہو سکا۔ اس اثنا میں میری تحقیق کے نگراں پروفیسر سید ضامن علی صاحب ۱۹۵۵ء میں مرحوم ہو گئے۔ ان کے انتقال کے پانچ برس بعد میں نے اپنا مقالہ بغیر کسی نگرانی اور تفصیلی ہدایت کے اپنے طور پر مکمل کیا۔ بعض احباب کے اصرار سے کہ مجھے پرانے قاعدوں کے مطابق ڈاکٹر آف فلاسفی کے لئے مقالہ پیش کرنے کا اب بھی استحقاق ہے۔ میں نے اپنے استاد محترم ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب سابق صدر شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی سے مشورہ کیا۔

موصوف نے بتایا کہ میں مقالہ پیش کر سکتا ہوں۔ میرے ممتحن بھی مقرر کیے جا چکے ہیں۔ یونیورسٹی کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے مقالہ ضروری فیس ادا کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۶۰ء میں جمع کر دیا۔ مقالہ بارہ سو صفحوں پر مشتمل تھا۔ ظاہر ہے اتنے طویل مقالہ کو پڑھنا اور جانچنا ممتحن حضرات کے لئے وقت طلب بات تھی۔ دو سال تک نتیجہ کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ ممتحن حضرات کی رپورٹوں کا انتظار رہا۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں معلوم ہوا کہ مقالہ میں مجھے کچھ ترمیم کرنی چاہیے۔ ترمیم کی ایسی ہدایتیں موصول ہوئیں جو میرے لئے روح فرسا تھیں۔ طرہ اس پر یہ تھا کہ میں نے جس کام کو بائیس سال میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا اس میں ہدایت کے مطابق ترمیم و تنسیخ کر کے ازسر نو مقالہ لکھ کر چار کاپیوں میں بیس ماہ کے اندر داخل کردوں۔

مقالہ کی ترمیم کی دشواریوں کے مدنظر میں نے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر بلبھدر پرشاد کو درخواست دی کہ میرے نگراں کا انتقال ہو چکا ہے اب کوئی دوسرا نگراں مقرر کیا جائے تاکہ مقالہ کی تسلی بخش تکمیل ہو سکے۔ چنانچہ موصوف نے ڈاکٹر سید رفیق حسین صاحب کو میرے مقالہ کا نگراں مقرر کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے تفصیلی باتیں کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے مقالہ کا ایک نیا خاکہ دی گئی ہدایتوں کے تحت تیار کیا اور تندہی سے مقالہ ازسر نو لکھنا شروع کیا۔ اس وقت میرا تقرر گورنمنٹ انٹر کالج فتحپور میں تھا۔ میں بآسانی الہ آباد آتا جاتا تھا اور ڈاکٹر صاحب

موصوف سے ملتا جلتا رہتا تھا۔ میری دشواریاں حل ہو جایا کرتی تھیں اور مجھے امید ہو چلی تھی کہ میں بہت جلد اپنے مقالہ کو مکمل کر لوں گا۔ میں تو اس خیال میں تھا اور محکمہ تعلیم کے افسران دوسرے خیال میں تھے۔ انھوں نے میرا تبادلہ الہ آباد سے بہت دور پتھورا گڑھ (واقع علاقہ کمایوں) کر دیا۔ میری آمد و رفت منقطع ہو گئی۔ خط و کتابت اور رسل و رسائل کے وسیلہ سے ہی اب میں اپنے نگراں کی ہدایتیں حاصل کر سکتا تھا۔ بہر حال اب بھی جتنی مستعدی سے میں کام کر سکتا تھا میں نے کیا۔ میرے سپرد تدریسی فرائض بھی تھے اسے بھی انجام دیتا تھا اور فرصت کے اوقات میں اپنے مقالہ کی تکمیل بھی کرتا تھا۔ میری بد قسمتی تھی کہ ایسی دشواریوں کے باعث میں بائیس سال کا کام دیئے گئے بیس ماہ کے اندر ختم نہ کر سکا۔ مقالہ اور اور اس کی چار کاپیوں کی تکمیل اس مدت کے چند ماہ بعد ہوئی۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں متعدد درخواستیں دیں کہ مجھے ترمیم شدہ مقالہ پیش کرنے کی اجازت مرحمت کی جائے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ وائس چانسلر ڈاکٹر بلبھدر پرشاد یونیورسٹی کے بنائے ہوئے قاعدوں کی بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ریسرچ کی اعلیٰ قدروں کا احترام ان کی نظروں میں اگر ہوتا تو میری درخواستوں کو بار بار مسترد کر کے مجھے ایسا مایوس نہ کرتے۔ میرے نگراں اور صدر شعبہ اردو نے بار بار سفارش کی کہ یہ مقالہ بڑا اہم ہے اسے داخلہ کی اجازت ملنی چاہئے مگر موصوف کوئی بات ماننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔

مجھے پہلے بھی ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری پانے کا اتنا شوق نہ تھا جتنا کہ اپنے مقالہ کو مکمل کرنے کا تھا۔ میرے دوست، رہبر اور نگراں ڈاکٹر سید رفیق حسین صاحب نے میری ہمت افزائی کی اور مایوسی کی تاریکیوں سے نکال کر فرمایا کہ جب تمھیں اپنا موضوع اتنا محبوب ہے تو مقالہ کو جلد شائع کرانے کی اب فکر کرو۔ مقالہ پر ڈاکٹریٹ کی سند نہ ملنے سے اس کی اہمیت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ پرفیسر سید احتشام حسین صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا۔ ان دونوں حضرات کی فرمائش پر میں مقالہ کی اشاعت کے لئے کوشش کرنے لگا۔

بابو برج باسی لال گوڑ ایم۔ اے ۲۷۹۔ بادشاہی منڈی الہ آباد کا میں بیحد ممنون ہوں کہ وہ مقالہ کی اشاعت کے لئے تیار ہو گئے۔ میرے تحقیقی جدو جہد کی یہ ہے مختصر سی روداد۔

میرا خوش گوار فرض ہے کہ میں اپنے مقالہ کے نگراں ڈاکٹر سید رفیق حسین صاحب کا شکریہ ادا کروں۔ ان کی رہنمائی اور ہمت افزائی اگر میرے شامل حال نہ ہوتی تو یہ تصنیف منظر عام پر نہ آتی۔ مجھ پر وہ جتنی شفقت فرماتے ہیں ان کا صلہ الفاظ میں نہیں دیا جا سکتا۔

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا بھی میں ممنون ہوں کہ موصوف نے برابر مفید مشورے دیئے اور جتنی کچھ وہ میری حوصلہ افزائی کر سکتے تھے ہمیشہ کرتے رہے۔ مقالہ کی اشاعت کی ترغیب بھی موصوف سے ملی۔

بہر حال بے برگ وساماں سفر کرنے کی زحمتیں جو ہونی چاہئے تھیں وہ ہوئیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ انجام بخیر ہوا اور میرے عزیز لمحات جو میں نے اس مقالہ کے لکھنے میں صرف کئے وہ رائیگاں نہ ہوئے۔ کہاں تک میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا اس کا فیصلہ اردو داں حضرات کی نظر کرم پر ہے خوبیوں سے زیادہ خامیوں کا احساس مجھے اب بھی ہے اور اگر میری عمر نے وفا کی اور اور دوبارہ اس کی اشاعت کی نوبت آئی تو میں یقیناً ان فرو گذاشتوں کا ازالہ کر دوں گا جن سے میں مطلع ہوں گا۔

مجھے اپنے موضوع سے محبت تھی اور اب بھی ہے۔ اسی جذبہ سے متاثر ہو کر میں نے اتنی جانفشانی اور سرگرانی اپنے سر مول لی تھی۔ بقول چک بست لکھنوی میں اپنی محنت ہی کو اپنی محنت کا ثمر تصور کرتا ہوں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں ؎

گلستانِ جہاں میں بس اسی نے آبیاری کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

گنپت سہائے سریواستو

گنپت سہائے سریواستو
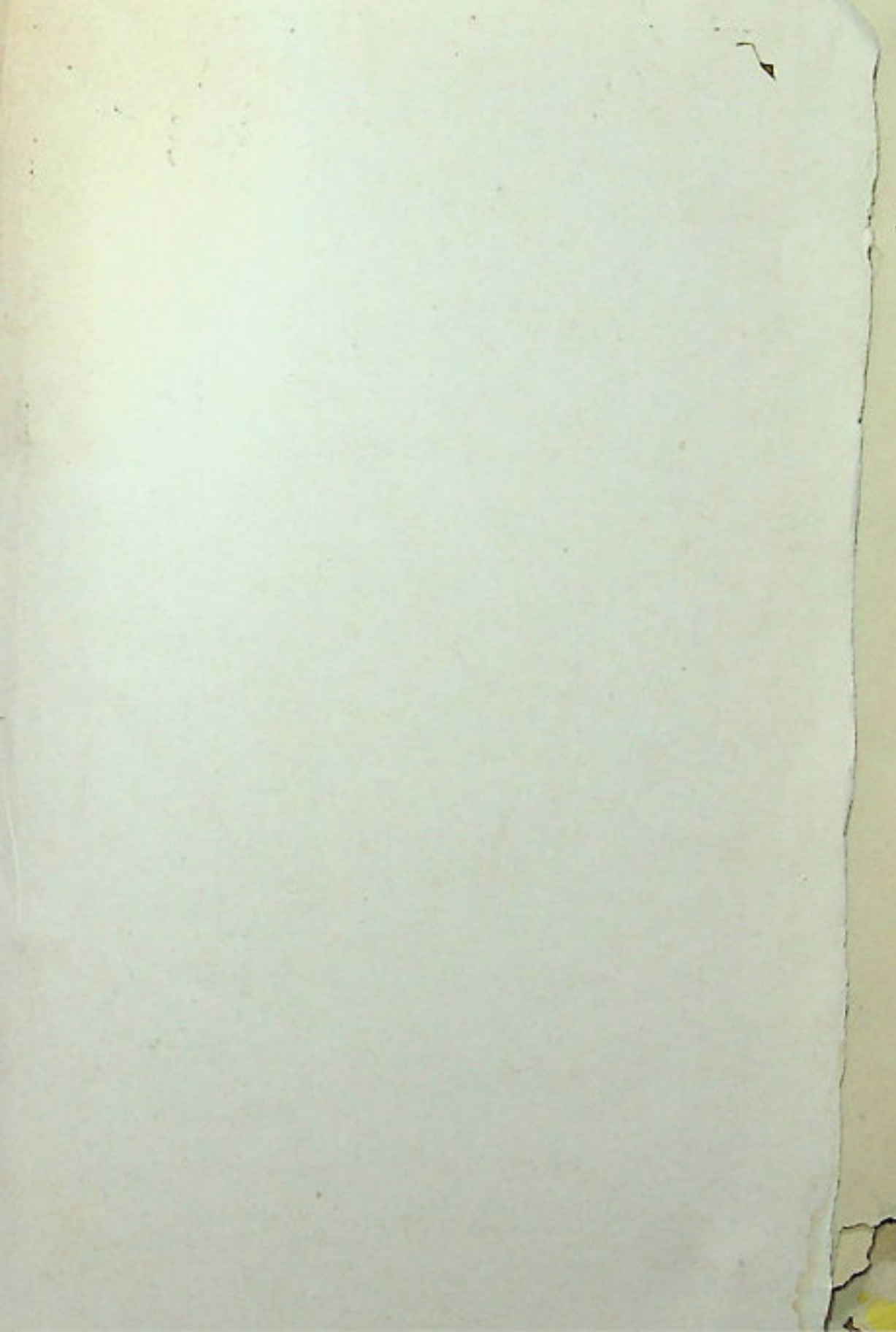
پیش لفظ

از ڈاکٹر سید رفیق حسین
شعبۂ اردو۔ الٰہ آباد یونیورسٹی

ہندوستان کی جدید زبانیں یہاں کے عوام و خواص کی متحدہ جدوجہد اور کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان میں مشترکہ تہذیب و تمدن کی عکّاسی اور ترجمانی ہے۔ اردو بھی ایک جدید ہندوستانی زبان ہے جس کے ادب کی ترقی و ترویج میں ہر مذہب و ملّت کے ادیب و شاعر نے برابر کا حصہ لیا ہے۔ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جہاں کروڑوں انسان روزانہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ بہت سی زبانیں بولتے پڑھتے اور لکھتے ہیں اور برابر لکھتے پڑھتے اور بولتے رہیں گے۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ادیب و شاعر پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔

اردو کے اکثر و بیشتر شعرار کا کلام (وہ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) چند در چند وجوہ کی بنا پر پس پردہ رہا۔ صرف خوش نصیب مقبول و معروف شعرا کی تخلیقات مورخین و ناقدین کے سامنے آئیں۔ انھیں کا تذکرہ ہوا اور انھیں کے کلام پر تبصرہ کیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے شمار ہندو شعرار کا کلام طباعت و اشاعت سے محروم رہا اور اس لئے ادبیات اردو کی تاریخ میں انھیں کوئی جگہ نہ مل سکی۔ شری گنپت سہائے صاحب

اردو کے پرستار ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں موصوف نے ایم۔ اے کی تعلیم پائی۔ دو سال کے بعد ۱۹۳۶ء میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ تحصیل علم کے دوران ہی انھیں محسوس ہو چلا تھا کہ بہت سے ہندو شعراء کے کلام سے اکثر اردو داں حضرات ناواقف ہیں۔ اگر ان سب کے کلام کی چھان بین کی جائے اور انھیں منظر عام پر لایا جائے تو اردو کی شہرت میں اضافہ ہو اور ان کے کلام سے بھی اردو داں متعارف ہو جائیں۔

شعبۂ اردو میں ایم۔ اے کی تکمیل کے بعد انھوں نے اپنے ریسرچ کا موضوع "اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعراء کا حصہ" پسند کیا۔ موضوع بہت وسیع تھا۔ مواد کی فراہمی میں بڑی زحمتیں تھیں لیکن ان کا جوش و خلوص ان زحمتوں کا مانع نہ ہوا۔ موصوف "مشکلے نیست کہ آساں نہ شود" کے مصداق رہے۔ پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب سابق صدر شعبہ اردو ان کے نگراں مقرر ہوئے۔ ان کی ہدایت کے مطابق جہاں کہیں ہندو شعراء کا کلام دستیاب ہوا موصوف نے فراہم کر لیا۔ موضوع بہت وسیع تھا۔ مواد کی فراہمی میں بڑی دشواریاں اور دقتیں لاحق ہوئیں لیکن یہ ایسے مرد میدان تھے کہ ہراساں نہ ہوئے۔

گنپت سہائے صاحب سرکاری محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ریسرچ بھی ان کا دلچسپ مشغلہ رہا۔ ظاہر ہے بیک وقت دو اہم فرائض کی انجام دہی بہت مشکل ہوتی ہے۔ لیکن

موصوف دھن کے پکے اور لگن کے سچے انسان ہونے کی وجہ سے برابر کام کرتے رہے۔ مقالہ اس وقت مکمل ہو سکا جب محترمی پروفیسر سید ضامن علی صاحب مرحوم ہو گئے۔ مرحوم زندہ ہوتے تو شاید ان کی رہنمائی میں اس مقالہ کی تکمیل خوش اسلوبی سے ہو گئی ہوتی۔ گنپت سہائے صاحب نے ان کی زبانی ہدایات کے مطابق اس مقالے کو مرتب کر کے الہ آباد یونیورسٹی میں ڈی۔ فل کی ڈگری کے لئے داخل کر دیا۔ یہ مقالہ بارہ سو صفحوں پر مشتمل تھا۔ تین ممتحنوں میں ایک میں بھی تھا۔ ان کی محنت کی داد تینوں نے دی اور اسے ذرا مختصر کرنے کو کہا اور ضروری ترمیم و تنسیخ کا بھی مشورہ دیا۔ ترمیم و تنسیخ کے مرحلے بڑے سخت اور دشوار گذار تھے۔ گنپت سہائے صاحب کی درخواست پر وائس چانسلر صاحب نے مقالہ کی ترمیم و تنسیخ کا عارضی نگراں مجھے مقرر کیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد موصوف کا تبادلہ ہندوستان کے کوہستانی علاقہ پتھورا گڑھ ہو گیا۔ جو الہ آباد سے بہت دور تھا۔ مجھ سے ملنے جلنے اور خط و کتابت کے باضابطہ رابطے قائم نہ رکھ سکے۔ یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق ترمیم شدہ مقالہ دو سال کے اندر پیش ہو جانا چاہیئے تھا جو نہ ہو سکا۔ اس مدت کے کے بعد جب یہ مقالہ تیار ہوا تو آرڈیننس (ORDINANCE) کی رُو سے یہ امتحان کے لئے داخل نہ ہو سکا۔ موصوف نے متعدد درخواستیں دیں جو مسترد ہو گئیں۔ قاعدوں کی سخت گیری سے موصوف تنگ آگئے اور بہت رنجیدہ ہوئے۔ مجھ سے اور پروفیسر سید احتشام حسین

صاحب سے مشورہ چاہا تو ہم نے انھیں رائے دی کہ زندگی بھر کی محنت شاقہ کے بعد اس مقالہ کی تکمیل ہوئی ہے۔ اسے منظر عام پر ضرور آنا چاہیئے۔ گنپت سہائے صاحب اس مقالہ کی اشاعت پر تیار ہو گئے۔ اس طرح یہ مقالہ آج منظر عام پر آسکا۔

ترمیم شدہ مقالہ میری نظر سے گذرا ہے۔ بہت سی باتیں میرے مشورہ سے اس میں اضافہ ہوئی ہیں۔ مختلف ادوار کی تقسیم، عہد بہ عہد کی تبدیلیاں، ہر دور کی خصوصیات، اس کا سیاسی و سماجی ماحول اور اردو کی اہمیت پر جو کچھ لکھا گیا ہے بہت غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ بہت سے گمنام اور غیر معروف شعراء کے کلام سے پہلی بار ہم سب متعارف ہو رہے ہیں۔ ان تمام باتوں سے اردو کی گراں مائگی کا احساس ہونا لازمی ہے۔ گنپت سہائے صاحب نے اسے بڑی محنت، جاں سوزی، لگن اور خلوص سے لکھا ہے۔ اسے ہندوستان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار اور ان کی ادبی خدمات کا آئینہ سمجھنا چاہیئے۔

مجھے امید ہے کہ جو لوگ اردو کو ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اس تصنیف کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور مصنف کی محنت کی داد دیں گے اور مجھے اس کی بھی قوی امید ہے کہ جب کبھی اردو ادب کا از سر نو منصفانہ جائزہ لیا جائے گا تو مورخین و مبصرین کی نظر انتخاب ان شعراء میں سے بھی کسی نہ کسی پر پڑیگی۔ اس طور سے اس کتاب کے مصنف کے نقطۂ نظر کو تقویت پہنچے گی اور انکی جیسی خواہش و آرزو ہے وہ کسی حد تک آسودہ و مطمئن ہو جائے گی۔

الہ آباد

۱۷ ستمبر ۱۹۶۸ء

(ڈاکٹر) سید رفیق حسین

تعارف

از پروفیسر سید احتشام حسین

صدر شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

زبانوں کی تقسیم مذہب اور فرقہ کی بنیاد پر نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اپنی آسانی کے لئے ہم کبھی ہندی کے مسلمان شعرار کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی اردو کے ہندو شعرار کا۔ تاکہ تاریخ ادب کا ارتقا مختلف پہلوؤں سے ہمارے سامنے آسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں پہنچ کر اولیت زبان اور اصناف ادب کو حاصل ہو جاتی ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے افراد کو نہیں رہتی۔ جناب گنپت سہائے سریواستو صاحب نے اردو کے ہندو شعرار کی خدمات پر اسی جذبہ کے تحت کام لیا ہے۔ انھوں نے برسہا برس کی کاوش اور صحت کو خراب کر دینے والی محنت کے بعد سیکڑوں شعرار کے حالات اور کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ شاعروں اور ان کے اہل خاندان سے مل کر ذاتی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ غیر مطبوعہ کلام کی نقلیں حاصل کی ہیں اور انھیں ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اب یہ کتاب اہل ذوق کے مطالعہ کے لئے مطبوعہ شکل میں پیش کی جاتی ہے۔

گنپت سہائے صاحب نے یہ کام الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ اس وقت انھیں

پروفیسر سید ضامن علی صاحب کی رہنمائی حاصل تھی۔ مرحوم کی صحت کی خرابی اور کام کی پھیلی ہوئی نوعیت کی وجہ سے تاخیر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ یہ مقالہ مرحوم کے انتقال کے بعد مرتب ہو سکا۔ بدقسمتی سے بعض کاغذی اور قانونی دشواریوں کی وجہ سے وہ مقصد پورا نہ ہو سکا جس کے لئے یہ لکھا گیا تھا۔ لیکن علمی اور ادبی کاموں کی اصل قدر یہ نہیں ہے کہ اس پر کوئی سند ملے بلکہ یہ ہے کہ اسے قبول عام حاصل ہو اور مصنف کی جانکاہی کی داد ملے۔ چنانچہ گنپت سہائے صاحب نے ڈاکٹر رفیق حسین صاحب (شعبہ اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی) کے مشورہ سے اس میں ضروری ترمیمیں کر کے اشاعت کے لئے از سرِ نو مرتب کر لیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اپنی موجودہ شکل میں یہ جلد ہی شایع ہو رہا ہے۔ اس مقالہ کا مطالعہ کرنے والے کو آسانی سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مصنف نے اس پر کتنا وقت صرف کیا ہے۔ لیکن جب سفینہ کنارے آ لگے تو صعوبات سفر کی شکایت فضول ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابھی عہد جدید کے شعراء کے متعلق بہت سا مواد گنپت سہائے صاحب کے پاس موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر اس پہلی جلد کی اشاعت پر اہل نظر نے ان کی ہمت افزائی کی تو باقی مواد بھی دوسری جلد کی شکل میں مرتب ہو جائے گا۔

گنپت سہائے صاحب حکومت اتر پردیش کے شعبہ تعلیم سے متعلق ہیں اور اپنے فرائض منصبی کے ساتھ انھوں نے جس علم دوستی کا ثبوت دیا ہے اس کی قدر کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب مختلف حلقوں میں مقبول ہوگی۔

الہ آباد

۸ / اکتوبر ۱۹۶۸ء

سید احتشام حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

اردو زبان کی اہمیت اور آغاز و ارتقا

(الف) اردو زبان کی اہمیت

اردو زبان ہندوستان کے ہندو، مسلم اور دیگر اقوام کے گذشتہ کئی صدیوں کے ارتباط و اتحاد کا ایک گرانقدر سرمایہ ہے۔ یہ ان کے بزرگانِ سلف کا قابلِ فخر ورثہ ہے۔ اس زبان کو ہندو، مسلمان اور عیسائی تینوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔ یہ ہندوستان کی وہ مشترک زبان ہے جو کشمیر سے دکن تک اور افغانستان سے بنگال تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اردو زبان و ادب کی تخلیق، اس کی نشو و نما اور اس کے خزانہ کو مالا مال کرنے میں صدہا ہندو شعرا ادبا نے ہر دور میں مسلم شعرا، و ادبا کے دوش بدوش کام کیا ہے۔ اردو ادب اگر ایک طرف مسلم شعرائے باکمال اور نثارانِ بے مثال کی رہینِ منت ہے تو دوسری جانب وہ متعدد قادر الکلام ہندو شعرا اور گرانمایہ ادبا کی ادبی خدمات پر نازاں ہے، جنھوں نے کبھی چمنستانِ نظم کی آبیاری کی تو کبھی ایوانِ نثر کی گلکاری کی۔

ہندو شعرا اور ادبا کے علاوہ متعدد ہندو راجاؤں اور رئیسوں نے بھی اپنی زندگی اردو ادب کی سرپرستی اور آبیاری میں صرف کی ہے۔ مہاراجہ کشن

رائے ناظم بنگال و بہار کی قدردانی ضرب المثل ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے متعدد شعرار ان کی بارگاہ میں جاکر انعام واکرام سے فیضیاب ہوئے۔ ان کے فرزند راجہ بہادر راجہ صوبہ دار پٹنہ بھی بڑے ادب نواز اور سخن پرور تھے۔ راجہ کلیان سنگھ گورنر صوبہ عظیم آباد (پٹنہ) بھی بڑے علم دوست اور شعرار کے قدردان تھے۔ ان کی ذات سے اردو زبان کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ خود بھی شاعر تھے۔ سید اختر احمد اورینوی فرماتے ہیں[۱] "اس گھرانے اور مہاراجہ رام نرائن موزوں کی بدولت اس عہد میں (اٹھارہویں صدی عیسوی کا آخری اور انیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی حصہ) عظیم آباد پٹنہ دہلی اور لکھنؤ کا ہم پلہ ہو رہا تھا۔ اس کی بڑی شہرت ہوئی اور شاعروں کی کثرت نے اس شہر کو اردو کا ایک اہم مرکز بنادیا۔"

میر تقی میر بھی سب سے زیادہ راجہ جوگل کشور کی سرکار سے اور مومن سرکار الور سے فیضیاب ہوئے تھے۔ مہاراجہ چندو لال شاداں حیدرآبادی دریادلی، سخن پروری اور مہماں نوازی میں مشہور گزرے ہیں۔ ان کے دربار میں اہل سخن اور کاملان فن کا اجتماع تھا۔ ان کی ماہانہ تنخواہ سو روپیہ سے ہزار روپیہ تک فی کس تھی۔

محسنین ادب میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر تاراچند سابق سکریٹری ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، پنڈت منوہر لال زتشی، رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ ادب اردو، پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق مؤلف بہار گلشن کشمیر، لالہ سری رام مؤلف تذکرہ خمخانہ جاوید اور منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر رسالہ زمانہ کانپور کی خدمات بھی نہایت اہم ہیں۔

---

[۱] بہار میں اردو زبان کا ارتقا۔ مؤلفہ سید اختر احمد اورینوی ص۳۴۲، ص۳۴۳

اردو ادبیات کی اشاعت و تبلیغ میں منشی نولکشور سی۔ آئی۔ ای کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان کے مطبع کو ہمیشہ ہندو اور مسلم شعراء و ادباء سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اردو کا مشہور روزنامہ "اودھ اخبار" اسی مطبع سے شایع ہوتا تھا۔ منشی نولکشور خود بھی اردو کے ادیب تھے۔ اسی سلسلہ میں لاہور کے رائے گلاب سنگھ اور الہ آباد کے لالہ رام نرائن لال اور مالکان انڈین پریس بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ کشمیر، صوبہ پنجاب، صوبہ اتر پردیش، حیدرآباد (دکن) اجمیر اور صوبہ بہار میں سبھی مسلمان، کایستھ کھتری، ویش اور اکثر برہمن اردو ہی بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ کشمیری پنڈتوں، کایستھوں اور کھتریوں میں اکثر اشخاص اردو کے علاوہ فارسی میں بھی وہ استعداد رکھتے تھے کہ دونوں زبانوں کے فضلاء میں شمار کئے جاتے تھے۔ چنانچہ دستور الصبیان، انشائے خرد افروز اور انشائے بہار عجم وغیرہ جو فارسی درسیات میں داخل ہیں اہل ہنود کی تصنیف ہیں۔ لالہ ٹیک چند بہار کی "بہار عجم" فارسی لغات کی نہایت مستند اور مشہور کتاب ہے۔ اہل ہنود اردو زبان کے یہاں تک دلدادہ تھے کہ وہ اپنی مذہبی کتب (مثلاً رامائن اور گیتا وغیرہ) کا مطالع اردو نظم و نثر میں کرتے تھے۔ چنانچہ منشی جگناتھ پرشاد خوشتر کی رامائن اسی لئے بہت مشہور رہی۔ مثنویوں میں پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" ایک بے مثل گرانپایہ مثنوی شمار کی جاتی ہے۔ شعلہ علی گڈھی کی مثنوی "برج چھب" بھی ایک نہایت دلچسپ اور سحر آمیز تصنیف ہے۔[1]

اہل ہنود کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوے ڈاکٹر عبدالحق فرماتے ہیں: "ابتدائی

---

[1] بحوالہ "یادرفتگاں" مؤلفہ جگر بریلوی ص ۹

زمانہ میں اردو اپنی ترقی اور اشاعت کے لئے تریب قریب تمام تر ہندوؤں کے ضخیم مذہبی صحیفوں کے ان منظوم و منثور ترجموں کی مرہونِ مست رہی جو ہندوؤں کے قلم کے کارنامے تھے اور جن کا سلسلہ اب تک بند نہیں ہوا ہے۔ ان ترجموں میں مذہبی عقیدت کارفرما تھی اس لئے ان کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ گویا اردو کی مقبولیت تھی۔ ترجموں کے بعد طبع زاد تصانیف کو لیجئے تو اس ذخیرہ کا حساب و شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ شعر و ادب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہندوؤں کے ذہن رسا اور فکر بلند نے معجزے نہ دکھائے ہوں۔ بعض شعبوں کے تو پیشوا یہی ہوئے۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ہندو بلند پایہ شاعر و انشا پرداز نہ ہوئے ہوں۔"

پروفیسر آل احمد سرور تحریر فرماتے ہیں[۱] "اردو ادب کا لہلہاتا ہوا باغ تنہا ایک باغبان کی محنت کا ثمرہ نہیں۔ اس کی آبیاری مختلف جماعتوں مذاہب اور ممالک نے مل کر کی ہے۔ اس کی تعمیر میں بہتوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے فقیروں اور درویشوں نے اس پر برکت کا ہاتھ رکھا ہے۔ بادشاہوں نے اسے منھ لگایا۔ سپاہیوں نے زبانِ تیغ اور تیغ زبان دونوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ پھر بھی یہ جمہور کی زبان اور جمہور کا ادب ہے۔ جمہور نے اسے گویائی بخشی اور جمہور نے اسے پروان چڑھایا۔ اردو ادب کی تاریخ میں مسلمانوں کے دوش بدوش صدہا نام ہندوؤں کے ملیں گے جنھوں نے اپنی گرانقدر کوششوں سے ادب کی مختلف اصناف کو مالا مال کیا اور ہمارا جدید ادب جو انیسویں صدی کے آخر نصف کی پیداوار ہے اس زمرہ خاص میں اور بھی ممتاز ہے۔"

---

[۱] تنقیدی اشارے (دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۹ء) ص ۱۰۳

غرضکہ اردو زبان تمام اقوام وملل کے باہمی اختلاط اور میل ملاپ کی یادگار ہے۔ اس زبان کی خدمت ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سبھوں نے ایک ساتھ کی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد سیاسی اثرات کے تحت ہندوستان کے بعض غیر ذمہ دار لیڈروں کی غلط فہمیوں کی بنا پر کچھ صوبوں میں اردو معرض زوال میں آئی اور پاکستان کے تنگ نظر لیڈروں کی بدظنی کی وجہ سے ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کا زوال پاکستانی علاقوں میں ہوا۔ یہ اچھا رجحان نہیں ہے۔ ان دونوں ممالک کے عوام اردو اور ہندی دونوں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور جب کبھی ان کو موقع اور آسانی ملتی ہے تو ان دونوں زبانوں کو حاصل کرنے کے لئے وہ دل وجان سے کوشاں رہتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں جب الہ آباد یونیورسٹی نے اردو کے درس وتدریس کا انتظام ان لوگوں کے لئے کیا جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے تو بہت سے ہندو طلبا نے اردو پڑھنے کے لئے اپنے نام لکھائے اور اردو پڑھ کر امتحان دیا۔ یہ تحریک جوش کے ساتھ برابر جاری ہے۔ اردو زبان کی عام مقبولیت کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اردو مشاعروں میں ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ سیکڑوں ہندو بھی شریک ہوتے ہیں۔ پاکستان میں بنگالی اور دوسری زبانوں کے حاصل کرنے کی سہولتیں جب سرکار نے بہم پہنچائیں تو بہت سے مغربی پاکستان کے باشندوں نے بنگالی سیکھنا اپنا فرض جانا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ممالک کے عوام کے دل آئینہ کی طرح پاک اور صاف ہیں۔

ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ ہر قوم کی معاشرتی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی زندگی کا عکس اس کے ادب میں صاف نظر آتا ہے۔ ادب ہی پر ہر قوم کی تہذیب وتمدن اور

اخلاق و شائستگی کا انحصار ہوتا ہے۔ جس قوم کا ادبی سرمایہ کم ہوتا ہے دوسری مہذب قومیں اسے گری ہوئی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ جب کسی قوم کا ادبی خزانہ ضائع ہو جاتا ہے تو اس کی تہذیب و تمدن پر ضرب کاری لگتی ہے۔ اس کی تاریخ تاریک ہو جاتی ہے اور اسے صحیح راستہ پر رہنمائی کرنے کے لئے کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لئے اسلاف کے ادبی کارناموں کا تحفظ ہمارا فرض ہے۔

(ب) اردو زبان کا آغاز و ارتقا

اردو زبان کب، کہاں اور کس طرح پیدا ہوئی

اردو زبان کے آغاز کی تاریخ قدرے تاریک ہے۔ یہ مسئلہ آج تک وثوق کے ساتھ طے نہ ہو سکا کہ اردو زبان کی ابتدا کہاں، کب اور کس طرح ہوئی۔ چنانچہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین فرماتے ہیں[1] "اردو زبان کے مخرج اور ارتقا کے متعلق مختلف نظریے جو مختلف ارباب قلم نے پیش کئے ان کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ مجھے خود تشفی نہیں ہوئی اور سچ پوچھئے تو میں کبھی مخرج کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر اس وقت تک نہیں پہنچا تھا جب اس کتاب کا ابتدائی حصہ پریس بھیجا گیا۔"

ڈاکٹر مسعود حسین خاں فرماتے ہیں[2] "ہند آریائی زبانوں پر نئی تحقیق کے باوجود

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ص۱

[2] مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ از ڈاکٹر مسعود حسین خاں (طبع سوم ۱۹۵۸ء) ص۹، ص۱۰

اردو زبان کا مسئلہ ابھی تک دھندلکے میں ہے۔ زمانہ حال میں اس زبان کی ابتدا اور آغاز سے متعلق جو مختلف نظریئے ملتے ہیں ان میں سے بیشتر قیاس آرائیاں ہیں جن کا شاید ذکر بھی کسی علمی اور تحقیقی مقالہ میں نہیں آنا چاہئے۔ اردو کو دکن، گجرات مدراس اور سندھ سے جو نسبت ہے اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے اور بس۔ مسائل زبان کو سمجھنے والے اردو کی ابتدا کے سلسلے میں ان نظریوں کا ذکر تک شاید گوارا نہ کریں۔"

اردو زبان کس طرح وجود میں آئی اس کا جواب اس کی ساخت پر غور کرنے سے مل سکتا ہے۔ اردو زبان کی صرف و نحو، اس کے اسمار، صفات، ضمائر اور افعال وغیرہ و نیز بیشتر روزمرہ و محاورات قریب قریب وہی ہیں جو ہندی بھاشا کے ہیں۔ جب کوئی اردو خواندہ کسی ہندی داں سے گفتگو کرتا ہے تو دونوں ایک ہی سادہ زبان بولتے ہیں جسے اردو بھی کہہ سکتے ہیں اور ہندی بھی۔ نمایاں فرق محض تحریری اردو اور تحریری ہندی و نیز تقاریر میں ہو جاتا ہے جب کہ اردو داں اصحاب فارسی اور عربی الفاظ و تراکیب اور ہندی داں اصحاب سنسکرت کے ادق اور نامانوس الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر اردو سے فارسی اور عربی کے الفاظ و تراکیب اور ہندی سے سنسکرت کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو دونوں میں کوئی نمایاں فرق باقی نہ رہے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان کی ابتدا ہندی بھاشا سے ہوئی ہے۔ میرے اس بیان کی تصدیق مولانا الطاف حسین حالی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتی ہے جسے موصوف نے مقدمہ شعر و شاعری میں تحریر کیا ہے۔[1]

"اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اس کے

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ (پہلا ایڈیشن)

تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسمار کا ہندی سے ماخوذ ہیں۔"

اردو زبان کی بنیادی ساخت اور اس میں فارسی و عربی الفاظ اور تراکیب کی آمیزش سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اختلاط اور ارتباط سے پیدا ہوئی۔ چنانچہ نسیم قریشی صاحب فرماتے ہیں[1] "ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قایم ہونے کے ساتھ ہندو و مسلمانوں میں میل جول اور دوستی و محبت کا جو سلسلہ قایم ہوا اس نے زبان کی بھی نئی تاریخ پیدا کر دی۔ سماجی ضرورتوں نے مسلمانوں کی زبان فارسی اور ہندوستانیوں کی بولیوں میں ملاپ کا ایک رشتہ قایم کیا۔ دھیرے دھیرے تاریخ کے ایک زبردست مگر خاموش عمل نے ایک نئی زبان بننے کے سامان پیدا کر دیئے۔"

رام بابو سکسینہ فرماتے ہیں[2] "حقیقت یہ ہے کہ زبان اردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق سورسینی پراکرت سے بلا واسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے، زبان اردو کی اصل اور ماں سمجھی جاسکتی ہے۔ ... زبان اردو کی صرف و نحو، محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی۔"

جدید تحقیقات کے قبل برج بھاشا کو اردو زبان کا مخرج سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد زبان اردو کی پیدایش کے متعلق فرماتے ہیں[3] "اتنی بات ہر شخص

---

[1] اردو ادب کی جدید تاریخ۔ نسیم قریشی صلا

[2] تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ صـ۲۷

جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔"

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحقیقات کے مطابق مدھ دیش (یعنی مغربی یو۔پی اور مشرقی پنجاب) اردو زبان کا مولد اور شورسینی اپ بھرنس اس کی ماں ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں[1]۔ آریوں کی آمد سے لے کر مسلمانوں کی فتوحات تک ہندوستان میں جس علاقہ کی زبان کا راج رہا وہ مدھ دیش (مغربی یو۔پی اور مشرقی پنجاب) کی کسی نہ کسی بولی پر مبنی تھی۔ عہد قدیم میں ویدک زبان اسی علاقے میں پورے طور پر نکھرتی ہے۔۔۔ کلاسیکل سنسکرت کی بنیاد متھرا کے آس پاس کی کسی قدیم آریہ بولی پر رکھی گئی تھی۔۔۔ ادبی زبان کی حیثیت سے اسی زمانہ میں پالی کو فروغ حاصل ہوا۔۔۔ اس کا ڈھانچہ مدھ دیش ہی کی کسی قدیم زبان پر تیار ہوا تھا۔۔۔ عہد وسطیٰ میں ایک مرتبہ پھر مغربی یو۔پی کی شورسینی پراکرت (جس کا مرکز متھرا تھا) ہندوستان کی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ پڑھے لکھے سماج میں سنسکرت کے بعد اگر کسی زبان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا تو وہ یہی پراکرت تھی جس کی جھلک سنسکرت کے ناٹکوں میں ملتی ہے۔۔۔ عہد اپ بھرنش میں بھی اسی علاقہ کی اپ بھرنش کو عروج حاصل رہا جو پنجاب سے لے کر بنگال تک واحد ادبی زبان کے طور پر رائج تھی۔ ۱۰۰۰ء میں جب ترک پنجاب میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت شورسینی اپ بھرنس اپنے شباب پر تھی۔ سنسکرت اور پراکرت کے ساتھ راجپوتوں کے درباروں میں اس نے بھی ایک خاص مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ ہندوستان کی جدید بولیوں کے بیج اسی کے اندر سے پھوٹنا شروع ہو گئے تھے۔۔۔ جس طرح پراکرتوں کی جگہ عوام کی بولی اپ بھرنش نے لے لی، اسی طرح جب اپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر محدود ہو گئی تو ہندوستان کی موجودہ بولیوں

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو (بار سوم) ص۳۰۔۳۱

نے اس کی گدی چھیننا شروع کی۔ لیکن ابھی تک یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان کی نئی زبانوں کا آغاز کس سن سے ہوتا ہے اور اپ بھرنش کب ختم ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ پرانی اپ بھرنش سنسکرت اور پراکرت سے ملتی ہے اور بعد کی قدیم ہندوستانی سے۔"

ڈاکٹر مسعود حسین خاں جدید زبانوں کے آغاز کا زمانہ اندازاً ۱۰۰۰ء تعین کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں[1]: "رفتہ رفتہ یہ اپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر رہ گئی۔ اپنے آخری دور (۱۰۰۰ء) میں یہ بہت کچھ موجودہ زبانوں کی قدیم شکلوں سے ملتی جلتی ہے۔ ۔۔۔۔ یہ صحیح صحیح بتانا ذرا مشکل ہے کہ اپ بھرنس کس سن میں ختم ہوتی ہے اور موجودہ آریائی زبانوں کا آغاز کب ہوتا ہے۔ لسانی تبدیلیاں نہایت چپکے اور چھپ کے رونما ہوتی ہیں۔ اندازاً کہا جاسکتا ہے کہ جدید زبانوں کا طلوع ۱۰۰۰ء سے ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑے سیاسی الٹ پھیر کا زمانہ تھا۔ مسلمان آناً فاناً شمالی ہند کو زیر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے جلو میں ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان آرہی تھی۔ انھوں نے سنسکرت کے نسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی نئی زبانوں کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا۔"

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحقیق مکانی حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ مدھیہ دیش ایک بہت وسیع علاقہ ہے جو مغربی یو۔ پی اور مشرقی پنجاب پر مشتمل ہے۔ اتنے طویل و عریض علاقہ کو اردو کا مولد بتانا اپنے بیان کو محتاط بنانے کا مصداق ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر بعد کی تحقیق سے کوئی جگہ متعین ہو بھی جائے تو وہ اس وسیع علاقہ میں ہی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف زمانہ کا بھی تعین نہیں کرتے۔ وثوق کے ساتھ وہ نہیں کہہ سکے کہ نئی زبانوں کا آغاز کب ہوا اور اپ بھرنش کب ختم ہوئی۔

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص۴۸، ۴۹

آگے چل کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں اپنے بیان کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ یوں لکھتے ہیں[1]۔ "کھڑی بولی چاہے اُسے دہلوی یا ہندوستانی کسی بھی نام سے یاد کیا جائے۔ قدیم زمانے سے دلّی اور اس کے آس پاس کی زبان ہے۔ یہ مغربی ہندی کے شمالی مغربی علاقہ کی بولی ہے"۔

راقم الحروف اب ذیل میں عام فہم طریقے سے یہ بتانے کی کوشش کرے گا کہ اردو زبان کی تخلیق کب اور اس کی نشو نما کس طرح ہوئی۔

عرب اور ہندوستان کے درمیان سلسلہ تجارت

ظہور اسلام سے بہت پہلے عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلہ تجارت قایم تھا۔ عرب سواحلِ ہند پر تجارت کی غرض سے آتے تھے۔ اپنا مال فروخت کر کے وہ ہندوستان سے مسالا، ہاتھی دانت، لنگور اور مور وغیرہ خرید کر لے جاتے تھے۔ ہندوستان سے تجارت میں ایرانی بھی عربوں کے ساتھ شریک تھے۔ عربوں اور ایرانیوں کا یہ سلسلہ تجارت ہندوستان کے مغربی ساحل پر پرتگالیوں کے عروج تک برابر قایم رہا۔ علاوہ ازیں بہت سے عرب ساحل مالابار کے کئی شہروں میں آباد ہو گئے تھے۔ اس سلسلہ لین دین میں عربی اور ہندوستانی الفاظ کا ادل بدل بھی ہوتا تھا۔ اشیائے خرید و فروخت کے عربی نام ہندوستانی تاجروں کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور ہندوستانی نام عربی تاجروں کی زبان میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس طرح اختلاط الفاظ کا آغاز بہت قدیم زمانہ میں ہو چلا تھا[2]۔

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو صہ ۸۳، صہ ۔ [2] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسین قادری صہ ۲

عربوں کا ایران پر حملہ

عربوں کے تسلط ایران کے بعد حالانکہ اہل فارس نے عربوں کی زبان عربی اختیار نہ کی، مگر پھر بھی یہ عربی سے بہت متاثر ہو چکی تھی اور یہی نئی فارسی تھی جو ترکوں اور مغلوں کے ذریعہ ہندوستان میں داخل ہوئی۔[۱]

ہندوستان پر مسلمانوں کے ابتدائی حملے

۶۳۷ء میں جب حضرت عمر فاروق نے بیت المقدس کو فتح کیا تو مسلمانوں نے ہندوستان کے ساحل سندھ پر حملہ کیا لیکن انھیں فتح نصیب نہ ہوئی۔ اسکے بعد دو مرتبہ پھر حملہ آور ہوئے مگر ناکام رہے۔ خلافت بنی امیہ کے آغاز میں ۶۶۴ء میں کابل کی طرف سے انھوں نے ہندوستان پر پھر حملہ کیا اور کابل سے ملتان تک قبضہ میں کر لیا۔ اس کے بعد عربوں نے ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کی سرکردگی میں علاقہ سندھ پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ۷۱۳ء تک مسلسل فتوحات کر کے ملتان تک قبضہ میں کر لیا۔ محمد بن قاسم تین سال تک ہندوستان میں رہا۔ اس کے دیگر ساتھی سندھ میں آباد ہو گئے اور انھوں نے سندھ میں شادیاں کیں۔ اس سے سندھ میں عرب کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔ انھوں نے بغیر کسی تعصب کے ہندیوں سے ملنا جلنا اور بغیر کسی نفرت کے ملکی زبان سیکھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے سندھی زبان کو بھی متاثر کیا جس سے سندھی بولی کا نام عربی سندھی ہو گیا اور اس کا رسم الخط بھی

[۱] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسین قادری۔ صـ۲

عربی ہوا جو آج تک قایم ہے۔[1]

ابن حوقل اور مسعودی جو دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی وضع اور معاشرت اس قدر یکساں ہیں کہ تمیز کرنا مشکل ہے۔ دونوں قوموں میں نہایت اتفاق وارتباط ہے۔ عربی و سندھی دونوں زبانیں رائج ہیں اور ملتان میں ملتانی کے ساتھ فارسی زبان بولی جاتی ہے۔[2]

سبکتگین کا پنجاب پر حملہ

سبکتگین نے ۹۸۶ء میں پنجاب کے راجہ جے پال پر فوج کشی کی اور اسے شکست دے کر پنجاب سے پشاور تک اپنے قبضہ میں کر لیا اور مسلمان اس مفتوحہ خطے میں رہنے لگے۔

محمود غزنوی کے حملے (۱۰۰۱ء تا ۱۰۲۷ء)

سبکتگین کے بعد اس کے فرزند سلطان محمود غزنوی نے ۲۷ سال میں سترہ حملے کر کے پشاور، ملتان، کالنجر، قنوج، متھرا اور گجرات پر قبضہ کر لیا۔ حالانکہ محمود کی وفات کے بعد سب ممالک مفتوحہ غزنویوں کے ہاتھ سے نکل گئے لیکن پنجاب پر ڈو سو برس تک قبضہ رہا اور لاہور[3] دار الحکومت تھا۔ مختلف اقوام اور ممالک کے

---

[1] ،[2] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسین قادری ص۳، ص۳

[3] سلطان محمود غزنوی نے لاہور کا جدید نام محمود پور رکھا تھا (داستان تاریخ اردو ص۴)

مسلمان (عرب، ترک، مغل، ایرانی اور افغانی) پنجاب میں مقیم رہے اور ہندوؤں کے ساتھ میل جول و معاشرتی تعلقات پیدا کئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی مغربی زبان کے الفاظ اپنی زبان میں ملانے شروع کر دیئے اور ہندوؤں نے عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کئے۔ اس طرح ایک مخلوط زبان بننی شروع ہو گئی۔[1]

سلطان محمود غزنوی کے فرزند و جانشین سلطان مسعود غزنوی کے زمانہ میں ایران کا مشہور شاعر منوچہری ہندوستان آیا تھا۔ اس نے اپنے مندرجہ ذیل فارسی شعر میں ہندی زبان کا لفظ "لنگھن" بمعنی فاقہ یا روزہ استعمال کیا ہے ؎

الا تا مومناں دارند روزہ　　　الا تا ہندوواں گیرند لنگھن[2]

فارسی کے شاعر مسعود سعد سلماں جن کا انتقال ۱۱۲۵ء اور ۱۱۳۰ء کے درمیان ہوا اسی فضا میں ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ وہ ترکی اور فارسی زبانوں کے قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ ہندوستانی زبان کے بھی شاعر تھے۔ انھوں نے اپنا ہندی دیوان بھی مرتب کیا تھا جو دست برد زمانہ سے اب ناپید ہے۔ لیکن محمد عوفی اور امیر خسرو کی تحریروں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے[3]۔ برشکال (ورس کال) یعنی برسات کا موسم ہندی لفظ ہے۔ یہ لفظ مسعود سعد سلماں کے مندرجہ ذیل شعر میں ملتا ہے[4]۔

برشکال اے بہار ہندستاں　　　اے نجات از بلائے تابستاں

خاندان غزنوی کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک

---

[1] تا [4] داستان تاریخ اردو ص۹

رہی۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ گفتگو کے لئے علاوہ فارسی کے ہندوستانی زبان کا بھی سیکھنا اور اس میں اپنی زبان کے الفاظ کو ملا کر بولنا ناگزیر امر تھا۔ غزنویوں نے شروع ہی سے ہندی زبان کی طرف توجہ دی۔ ان میں محمد بن البیرونی قابلِ ذکر ہے۔ اس کا قیام لاہور اور ملتان میں ۱۰۱۷ء سے ۱۰۲۹ء تک تھا۔ اس نے ہندی اور سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کے مذہب اور علوم مثلاً ہیئت، نجوم، ریاضی، جغرافیہ اور طبیعیات پر کما حقہ عبور حاصل کیا۔ اس نے عربی سے سنسکرت اور سنسکرت سے عربی میں متعدد کتابیں ترجمہ کیں۔ عربی میں جو کتابیں اس نے ترجمہ کیں ان کے نام شانکیہ اور پاتنجلی ہیں۔ لیکن البیرونی کی سب سے اہم کتاب تاریخ الہند ہے[1]

محمود کے زمانہ میں ہندی زبان کے ترجمانوں کی ایک جماعت غزنی میں مقیم تھی۔ ان میں تلک ہندی اور بہرام کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ تلک دراصل ایک حجام تھا جو ہندی اور فارسی زبانوں میں بخوبی ماہر تھا۔ وہ ترجمانی سے ترقی کر کے غزنی کی ہندی فوج کا سپہ سالار ہو گیا تھا[2]

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ دربار غزنوی میں ایسے ماہر موجود تھے جو ہندوستانی اور ایرانی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور بآسانی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر دیتے تھے۔ اگر ارتباط گہرا نہ ہوتا تو ترجمہ کرنے کا سلیقہ اور ملکہ ہندوستانیوں میں پیدا نہ ہوا ہوتا اور نہ وہ دربار غزنوی میں ملازم ہو سکتے تھے۔

---

[1]، [2] پنجاب میں اردو ص ۵۷، ص ۵۸

پنجاب پر غوریوں کے حملے ١١٦٨ء سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ١١٩٣ء میں بالآخر محمد غوری دہلی کے آخری راجہ پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی اور اجمیر پر قابض ہوتا ہے۔ قطب الدین ایبک نے ١٢٠٦ء میں دہلی کو دارالسلطنت بنایا جس سے ایک بہت بڑے پیمانے پر لاہور کی آبادی ہجرت کر کے دہلی آگئی۔ اس وجہ سے دہلی کے اطراف میں ایک نئی زبان (کھڑی بولی) کی داغ بیل پڑ گئی۔ "اس طرح لاہوری قافلے کی زبان نہ صرف دوآبہ کے بالائی حصے پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ صوبہ دہلی، کرنال اور حصار کے اضلاع بھی اس کے تحت آجاتے ہیں[1]۔"

"پنجاب سے مسلمان فارسی آمیز پنجابی بولتے ہوئے دہلی آئے۔ دہلی میں اور اس کے آس پاس ان کی مڈبھیڑ کئی بولیوں سے ہوتی ہے۔ آس پاس کے علاقوں میں ایک طرف پرانی کھڑی بولی اور دوسری طرف پرانی ہریانی بولی جاتی تھی۔ چونکہ کسی زمانے میں مشرقی پنجابی زبان خود بھی انھیں دونوں بولیوں کے زیر اثر پیدا ہوئی تھی اس لئے پنجابی بولنے والوں کو برج بھاشا کی بہ نسبت کھڑی بولی اور ہریانی اپنے سے زیادہ قریب دکھائی دی۔ انھوں نے اس کی صوتیات اور صرف و نحو کو پنجابی سے ملتا جلتا پایا۔ اس قربت کی وجہ سے ان کی نظر انتخاب برج بھاشا کے بجائے انھیں بولیوں پر پڑی جسے وہ بہت جلد بولنا سیکھ گئے[2]۔"

مخلوط زبان کی ابتدائی کتابیں

مسلمانوں کی فتح دہلی سے قبل راجپوتی عہد میں جو زبان دہلی کے آس پاس بولی

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ١١٩ ۔ [2] مختصر تاریخ ادب۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین صفحہ ١٤

جاتی تھی وہ نہ برج بھاشا ہے نہ کھڑی بولی بلکہ اس عہد کی قدیم اپ بھرنش کی روایات میں جکڑی ہوئی زبان ہے جس پر راجستھان کا اثر نمایاں ہے دراصل ہندوستان کی جدید بولیوں کی پیدائش صحیح معنوں میں ابھی تک نہیں ہوئی تھی[1]

اس عہد کی زبان کے مطالعہ کے لئے سب سے زیادہ مستند شاعر نرپت نالھ اور چند بردائی ہیں۔ نرپت نالھ نے ۱۱۵۵ء میں بیسل دیوراسو نظم کی جس میں عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً محل، انعام، نیجا (نیزہ)، تاجنو (تازیانہ)، کلا (کلاہ)، کبائی (قبا)، کھرسانڑ (خراسان)، لواجوا (لوازم)، تاجی (تازی) کتمک (قسمت)، باجہ باجہ (بعض بعض) وغیرہ[2]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں بیسل دیوراسو میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کے متعلق فرماتے ہیں[3]، "ممکن ہے کہ یہ لفظ بعد کو اضافہ کر دیئے گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خود شاعر نے استعمال کئے ہوں کیونکہ اس سے قبل مسلمان پنجاب میں عام طور سے پھیل گئے تھے۔ بیسل دیو کے سرداروں میں ایک مسلمان سردار تاج الدین بھی موجود ہیں۔"

راقم الحروف کی رائے میں بیسل دیوراسو میں عربی اور فارسی کے الفاظ نرپت نالھ کے خود استعمال کئے ہوئے ہیں کیونکہ غزنویوں کے طویل عہد میں ترکی، ایرانی، عربی اور افغانی مسلمان کافی تعداد میں پنجاب سے سندھ تک آباد ہو گئے تھے جس سے ہندوستان میں اختلاط زبان کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اس کے علاوہ نقل و حمل کے وسائل جو مابین ہندوستان اور ایران و عرب مدت مدید سے قایم تھے وہ کبھی مسدود نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے عربی

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۲۱ - [2] اردو زبان و ادب مؤلفہ و مرتبہ سید ضامن علی ایم - اے ص ۶

[3] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۰۴، ص ۱۰۵

وفارسی کے الفاظ ادیبوں کی زبان اور تحریروں میں موجود ہونا کوئی ایسا امر نہیں ہے جو ناقابل قیاس ہو۔ ڈاکٹر مسعود حسین کا بیان جیسی دیو راسو کے متعلق مبہم اور مشتبہ ہے۔

چند بردائی اور پرتھوی راج راسو

ہندی کا سب سے پہلا بڑا شاعر ہونے کا فخر چند بردائی (۱۱۵۹ء-۱۱۹۲ء) کو حاصل ہے جس کی مشہور تصنیف پرتھوی راج راسو کے متعلق تحقیق کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ یہ پرتھوی راج کا دوست، وزیر اور درباری شاعر تھا۔

پرتھوی راج راسو ڈھائی ہزار صفحوں کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ۶۹ باب ہیں۔ گریرسن نے راسو کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بتائی ہے۔ اس کتاب میں بھی عربی اور فارسی الفاظ کافی تعداد میں استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً شہر، تلوار، مقام، فرمان، پیش، حکم، نشان، تیغ، فوج، شاہزادے، امرا، کاغذ، سوار، بازار، رعیت، سامان، مال، تخت، دربار، زنجیر، جانور، شکار، کرم، پروردگار، محل، ہنگام وغیرہ۔

پرتھوی راج راسو کو راقم نے خود پڑھ کر دیکھا ہے کہ بہت سے اسم صفت اور فعل وغیرہ جنھیں ہم آج اپنی زبان میں استعمال کرتے ہیں اس وقت بھی ٹھیک اسی صورت میں بولے جاتے تھے۔ مثلاً دن، رات، پھول، دیپک، مالا، لاج، بات، ہاتھ، پاؤں، مکھ، دانت، تن، دھن، سمندر، گھر، رُت، برکھا، بادل، برس، دیس، بھیس، سورج، روپ، بھلا، برا، لوگ، ہنس، سارس، بگلا، بطخ، کچھو، مور، کویل، ہرن، ہاتھی، پانی وغیرہ۔

پرتھوی راج راسو کی زبان کا نمونہ

سات برس جب گئے کانھ دربار نہ آئے

تب پرتھوی راج کمار　　آپ منائے گرہ جائے
تب پھر لیے چند بردائی آئے　　کچھ کہی بات کچھلی سنائے
تہی محل راکھت بھئی　　گئی کھیل سب بھول

پرتھوی راج راسو کا مشہور دوہرہ یہ ہے

بارہ بانس بتیس گج انگل چار پھر مان　　اتنے گھر بادشاہ ہے مت چوک چوہان
پھر نہ جننی جنمے ہے پھر نہ کھینچے بان　　سات بار تم چوکیو اب نہ چوک چوہان

پرتھوی راج راسو کے متعلق بہت کچھ اختلاف آرا ہے۔ بعض اصحاب اسے چند بردائی کی اصلی تصنیف مانتے ہیں اور بعض اصحاب اسے ایک مجہول تالیف خیال کرتے ہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی شیامل داس جی کی رائے کو مستند مان کر راسو کو مشتبہ تصنیف قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ سولہویں صدی کی تصنیف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "راسا میں توپ و بندوق کا ذکر، دس فیصدی اس میں غیر ہندی الفاظ کی آمیزش اور دیگر بیانات کی لغویت وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایسے زمانہ میں لکھی گئی جب کہ توپ و بندوق ہندوستان میں عام طور پر استعمال ہونے لگی ہیں۔ اور فارسی و عربی الفاظ ہندی میں شامل ہو چکے ہیں۔

راسا کے بیانات بھی اس قدر لغویت سے لبریز ہیں کہ یہ کتاب بحیثیت کتاب تاریخ ہمارے احترام کی مستحق نہیں۔ مثلاً پرتھی راج نے شہاب الدین کو سات مرتبہ شکست دی گرفتار کیا اور روپیہ لے کر چھوڑ دیا یا یہ کہ شہاب الدین کا بھائی حسین نامی تھا جو اس کی بیوی سے ناجائز تعلقات رکھتا تھا۔"[1]

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۶۸، ۱۶۹

راقم الحروف نے خود پرتھوی راج راسو کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں فارسی و عربی الفاظ کی آمیزش دس فیصدی نہیں ہے۔ محض کہیں کہیں پر فارسی و عربی کے الفاظ ملتے ہیں۔ کھڑی بولی کے ان الفاظ کی فہرست میں نے اوپر درج کر دی ہے جو آج بھی اردو اور ہندی دونوں میں مشترک ہیں۔

ہندوستان میں توپ اور بندوق کا وجود نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ الفاظ بھی ہندوستان کی سرحد پار کر کے ہندوستانیوں کی زبان پر نہیں آسکتے۔ جب تک کہ یہ یقینی طور پر ثابت نہ کر دیا جائے کہ پرتھوی راج کے زمانہ میں کسی بھی ملک میں ان کا کسی صورت میں وجود ہی نہیں پایا جاتا تھا۔ دور حاضر کی بات ہے کہ ہندوستان میں ہوائی جہاز، راکٹ اور دیگر نئے اسلحے بننے سے پہلے ان کے نام سارے ہندوستان میں رواج پاچکے تھے۔ لہذا اس بنا پر پرتھوی راج راسو کو بعد کی تصنیف قرار دینا صحیح نہیں ہے۔
رہ گیا تاریخی اہمیت کا معاملہ کہ اس میں کچھ لغو بیانات ہیں اس پر مجھے زیادہ تبصرہ نہیں کرنا ہے۔ اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے بھی اتنا عرض کروں گا کہ چند بردائی پرتھوی راج کے دربار کا شاعر ہے اور غوریوں سے اس کی جانی دشمنی تھی۔ اگر اس نے اپنے آقا کو خوش کرنے کے لئے چند ایسے واقعات لکھ دیئے ہوں جو غوریوں کی تذلیل کا باعث ہو سکتے ہوں تو صرف ان غلط واقعات کی بنا پر اسے اس تصنیف کا مصنف ہی نہ سمجھا جائے یہ صحیح نہیں ہے۔ ایرانی شاعروں نے اپنے بادشاہوں کے لیے نہ جانے کتنی لغو باتیں لکھ دی ہیں، جو قیاس اور فطرت دونوں کے خلاف ہیں۔ میرے اس بیان کی کسی حد تک تصدیق ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:[1]

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۰۹

"لسانی اعتبار سے ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر کتاب مذکورہ کا
بیشتر حصہ بعد کی تصنیف ہے تو اس کے اکثر ٹکڑے بارہویں صدی کی زبان سے تعلق رکھتے
ہیں۔ قدیم زبان کی جو خصوصیات اس کتاب میں پائی جاتی ہیں وہ راسو عہد کی دوسری
تصنیف میں نہیں ملتیں۔ اس لئے راسو کے متعلق چند تاریخی شہادتوں کی بنا پر یہ فیصلہ
کر دینا کہ کل تصنیف جعلی ہے کسی طرح درست نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے بیشتر
حصے سولہوی صدی عیسوی کی زبان میں لکھے گئے ہیں، لیکن تلاش کرنے سے اصل مصنف
کے ٹکڑوں کی پہچان کوئی مشکل بات نہیں۔"

پنڈت ہر پرشاد شاستری نے ۱۹۰۹ء میں چند بردائی کے حالات معلوم کرنے
کے سلسلے میں راجپوتانہ کا سفر کیا تھا اور ۱۹۱۳ء میں اپنی رپورٹ ایشیاٹک سوسائٹی
کے سامنے پیش کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ پرتھوی راج نے اپنے زمانہ حکومت میں جب ناگور
آباد کیا تو اُسے چند بردائی کو جاگیر میں دے دیا۔ چنانچہ چند کا خاندان اب تک ناگور میں
آباد ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ نانورام مشہور ہیں۔ شاستری جی ناگور پہنچ کران سے
ملے۔ نانورام نے انھیں بتایا کہ چند بردائی کے چار لڑکے تھے۔ جن میں سے ایک مسلمان ہوگیا۔
اور ایک لاپتہ ہوا اور دو یعنی جل چند (جلہن) اور گن چند سے نسل چلی۔ نانورام کا یہ بھی
بیان ہے کہ چند بردائی نے تین چار ہزار اشلوک لکھے تھے۔ ان کے لڑکے جلہن نے کچھ اضافہ
کرکے گرنتھ مکمل کیا۔ نانورام نے یہ بھی بتایا کہ ان کے پاس بھی پرتھی راج راسو کا ایک نسخہ
ہے جو اصل کے مطابق ہے۔ اس نظم کا ایک نسخہ لندن کی ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ
میں میجر کا فیلڈ کا نذر کردہ موجود ہے[1]

[1] ہندوؤں میں اردو۔ از رفیق مارہروی صفحہ ۶۳

شاستری جی کا بیان بھی تقریباً ویسا ہی ہے جیسا ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ چند بردائی نے چند ہزار اشعار ضرور کہے تھے اور یہ کہ پرتھوی راج راسو اسی زمانہ کی تصنیف ہے۔ اس کے بیٹے نے بھی کچھ اشعار کا اضافہ اس میں کیا ہے۔

چند بردائی ۱۱۵۹ء میں بمقام لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ اجمیر کے راجہ سومیشر کے زمانہ میں لاہور سے راجپوتانہ آیا اور دربار سے منسلک ہو گیا۔ وہ ایسے خطے سے آیا تھا جہاں چند بردائی کی پیدائش سے کہیں پہلے اسلامی اقتدار قایم ہو چکا تھا۔ ہندو و مسلمان ایک دوسرے کی معاشرت اور تہذیب پر پورا پورا اثر ڈال چکے تھے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ انہی اثرات کے زیر اثر چند بردائی کی زبان پر عربی و فارسی کے الفاظ چڑھ گئے ہوں اور ممکن ہے چند بردائی خود فارسی زبان سے واقف رہا ہو کیونکہ وہ چھ زبانوں سے واقف تھا[1]

کھڑی بولی (اردو زبان) کے ابتدائی نمونے

صوفیائے کرام کے ملفوظات

غلام خاندان کے سلاطین کے زمانے سے اس مخلوط زبان نے تصنیفی حیثیت بھی اختیار کرنی شروع کی۔ قطب الدین پہلا حکمراں تھا جس کے زمانہ میں اسلامی زبان اور اسلامی تمدن کو نمایاں فروغ ہوا۔ چنانچہ اسی زمانے سے متعدد صوفیائے کرام کے

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس صفحہ ۱۳

کچھ مقولے ملتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے جسم کو جہاں بادشاہوں نے مسخر کیا وہیں ان کی روحانی تربیت صوفیاے کرام نے اپنے ذمہ لیا جو ہند میں مسلمان بادشاہوں کے ساتھ ساتھ یا ان سے پہلے وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے عقاید کی تبلیغ کے لیے یہاں کی مقامی زبان کو اپنایا۔ اس وقت تک قدیم اردو کے جتنے فقرے دریافت ہوئے ہیں وہ صوفیاے کرام کے ملفوظات ہیں۔ اردو کی بہت سی قدیم مذہبی کتابیں خواہ وہ دکھنی ہوں یا گجراتی صوفیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔

خواجہ فرید شکر گنج

سب سے قدیم تحریری نمونے جو ابھی تک دستیاب ہو سکے ہیں وہ صوفیاے کرام کے ملفوظات سے جابجا چند اردو کے جملے ہیں جن میں شاید سب سے پہلا جملہ وہ ہے جو خواجہ فرید شکر گنج کی زبان مبارک سے ادا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب ۱۱۶۵ء میں قصبہ کھتی وال مضافات ملتان میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۰ء میں سپرد خاک ہوئے۔

سیر الاولیا میں آپ کے مندرجہ ذیل فقرے ملتے ہیں۔

پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے۔ آنکھ آئی ہے۔

امیر خسرو اور اس کا اردو کلام

امیر خسرو کی پہیلیاں۔ مکرنیاں۔ دوہرے اور ریختے وغیرہ:۔

ہندوستانی (کھڑی بولی) کی قدامت کا مزید تاریخی ثبوت امیر خسرو کی تحریروں سے ملتا ہے۔ امیر خسرو کے متعلق حافظ محمود خاں شیرانی فرماتے ہیں [۱] "امیر خسرو ادبی

---

[۱] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۷۵

دنیا کے آفتاب عالمتاب ہیں۔ خاک ہند اب تک ان کے ایسے اوصاف وکمال کا انسان پیدا نہیں کرسکی ہے۔ وہ ایک طرف فارسی کے زبردست ناظم وناثر ہیں تو دوسری طرف عربی وسنسکرت میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ جہاں فارسی پر ان کے احسان ہیں وہاں ہندی بھی ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئی ہے۔ ان کی تصنیفات نظم ونثر کی تعداد ۹۹ بتائی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد چار یا پانچ لاکھ کے درمیان کہتے ہیں۔ جس قدر فارسی میں ان کا کلام ہے اس سے کہیں زیادہ ہندی میں بتایا جاتا ہے۔"

امیر خسرو سلطان بلبن کے دربار کے مشہور شاعر تھے۔ یہ ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۵ء میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کے فارسی الفاظ میں بھی کہیں کہیں ہندی الفاظ کی آمیزش ملتی ہے۔ گرجریوں کی گلی گلی "دہی لیہو دہی" آواز لگانے پر خسرو نے یہ رباعی کہی تھی۔

گجری تو کہ در حسن لطافت چو مہی — آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند وشکر میریزد — ہر گاہ بگوئی کہ "دہی لیہو دہی"

دیگر

زرگر پسرے چو ماہ پارا — کچھ گھڑے سنوارے پکارا
نقد دل من گرفت وبشکست — پھر نہ کچھ گھڑا نہ کچھ سنوارا

دیگر

رفتم بہ تماشا بہ کنار جوئے — دیدم بلب آب زن ہندوے
گفتم صنما چیست بہائے مویت — فریاد برآورد کہ "در در موے"

خسرو سے وہ مشہور غزل (ریختہ) بھی منسوب کی جاتی ہے جس کا مطلع ہے ؂

زحال مسکیں مکن تغافل درآئے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

ایک دیگر ریختہ کے چند شعر یہ ہیں:۔

خوار شدم زار شدم لٹ گیا — در غم ہجر تو کمر ٹوٹا ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوے من — بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھا ہے
گاہ زخسرو نگفتہ کہ بیٹھ — وہ چہ کند بھاگ میرا پھوٹا ہے

خسرو کے مندرجہ ذیل دوہے میں لطافت تشبیہہ ملاحظہ ہو:۔

گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس — چل خسرو گھر آپنے سانجھ پری چودیس

خسرو کی ہندی شاعری کے متعلق سب سے پہلی سند ہمیں وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) میں مل سکی ہے۔ حسب ذیل دوہرہ وجہی نے نقل کیا ہے[1]

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ — منجہ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

(سب رس ص۲۱۸)

خسرو کے متعلق ڈاکٹر مسعود حسین خاں فرماتے ہیں[2] "خسرو اردو ہندی کے مسلّمہ طور پر پہلے شاعر مانے جاتے ہیں لیکن ان کے ہندی کلام کی کوئی سند اب تک حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ خسرو کے صاحب دیوان ہندی شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں..... ان کی ہندی دانی کے ثبوت میں ان کی فارسی مثنوی دولرانی خضر خاں کا یہ اقتباس کافی ہوگا۔

غلط کردم گر از دانش زنی دم — نہ لفظ ہندی است از پارسی کم

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ص۱۳۴۔ [2] مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ص۱۳۴، ۱۳۸، ص۱۳۹

زبان ہند ہم تازی مثال است   کہ آمیزش در آن جاکم مجال است

آپ اس کے آگے فرماتے ہیں ”اس میں شک نہیں کہ مسلم سماج سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خسرو نے اپنی پہیلیوں اور مکرنیوں کے لئے زبان کی عام پسند شکل کو اپنایا ہوگا یعنی وہ زبان جو عام طور سے دہلی کے گھرانوں میں اس وقت رائج تھی لیکن تعجب تو یہ ہے کہ ان کی زبان کہیں سے بھی پرانے پن کا سراغ نہیں دیتی۔ اس پر اپ بھرنس لسانی روایات کا اتنا بھی آب ورنگ نہیں جتنا کہ ہمیں دکھنی ادبیات میں ملتا ہے۔“

جب یہ مسلم ہے کہ امیر خسرو فارسی اور مخلوط ہندی دونوں کے کامل شاعر تھے اور ان کے اشعار کی تعداد بھی معتد بہ تھی اور اس کا بھی علم ہے کہ وہ سرمایہ موجود تھا لیکن اب ناپید ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ان کے ان مخلوط ہندی اشعار کی صداقت میں شبہ کیا جائے جو مختلف کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں اور ابھی تک قطعیت سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ خسرو کے نہیں ہیں۔ رہ گئی یہ بات کہ وہ اپ بھرنش سے مماثلت نہیں رکھتے تو کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ اپ بھرنش کا نظریہ جو آغاز اردو کے متعلق پیش کیا جارہا ہے وہی مشتبہ ہے اور دوسرے ماہرین زبان وادب نے جو نظریے قایم کئے ہیں وہ صحیح ہیں۔ آزاد، حالی اور ڈاکٹر رام بابو سکسینہ جو اردو کی بنیاد ہندی بھاشا پر رکھتے ہیں کیا وہ صحیح نہیں ہو سکتے؟

امیر خسرو اور خالق باری

خالق باری کو پروفیسر شیرانی مرحوم امیر خسرو کی تصنیف نہیں مانتے۔ اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں[1] ”خالق باری کے متعلق تو اب یہ یقینی ہے کہ یہ حضرت امیر خسرو

---

[1] خالق باری مرتبہ پروفیسر شیرانی (انجمن ترقی اردو ۱۹۴۴ء)۔ (بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۳۹)

کی تصنیف نہیں بلکہ عہد جہانگیر کے ایک بزرگ ضیاء الدین خسرو نے اسے سنہ ۱۶۲۱ء میں مبتدیوں کے لیے منظوم لغت کے طور پر تصنیف کیا تھا۔"

چھ سو سال تک ایک مکمل کتاب کی تصنیف کا سہرا جس مصنف کے سر پر بندھا رہا ہو اُسے نوچ کر پھینک دینا بڑی جسارت کا کام ہے جسے حافظ شیرانی مرحوم نے کیا ہے۔ لیکن زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھنا چاہیئے۔ ان کی اس تحقیق کے باوجود ابھی تک دلوں میں یہ بات جاگزیں نہیں ہو سکی ہے کہ خالق باری کا مصنف کوئی دوسرا شخص ہو سکتا ہے۔ اس تردید کے بعد اوروں کو بھی جسارت ہوئی کہ امیر خسرو کا جو کلام دوسری کتابوں میں موجود ہے اسے بھی غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں اسے تنقید کا منفی رخ سمجھتا ہوں جس پر اردو کے بعض نقاد اپنا سارا زور صرف کیا کرتے ہیں۔ میری نگاہوں میں تنقید کی مثبت قدروں کی زیادہ اہمیت ہے تنقید کی منفی قدریں میرے حلق سے بہت کم اترتی ہیں۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم کی تنقید خالق باری کا میری نظر میں وہی درجہ ہے جو بعض معاندین شیکسپیر کو حاصل ہے جو اب بھی مصر ہیں کہ شیکسپیر کے ڈرامے شیکسپیر کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ چنانچہ میرے ہمنوا ڈاکٹر محمد وحید مرزا بھی ہیں۔ وہ اپنی تصنیف "امیر خسرو" میں خالق باری کی نسبت فرماتے ہیں[1]"خالق باری کے کل ۲۱۵ شعر ہیں اور یہی وہ تصنیف ہے جس پر حالی کے زمانہ میں بہت کچھ بحث ہوتی رہی ہے۔ مولانا محمد امین چریا کوٹی نے تمہید کے طور پر جو فاضلانہ مقالہ لکھا ہے اس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے اور اس کے متعلق کسی شبہ کا امکان نہیں۔۔۔

---

[1] "امیر خسرو" از محمد وحید مرزا۔ صدر شعبہ عربی و تہذیب و تمدن اسلامی جامعہ لکھنؤ۔ ص ۲۲۵، ۲۲۶

برخلاف اس کے لاہور کے فاضل استاد حافظ محمود شیرانی کی رائے میں یہ مثنوی خسرو کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اول اس میں عروض کی غلطیاں اور خامیاں موجود ہیں اور دوسرے ہندی الفاظ کی شکل کئی جگہ ایسی ہے جو خسرو کے زمانے میں نہیں تھی۔ ان متضاد رایوں میں کون قابل ترجیح ہے یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے لیکن موافق اور مخالف دلیلوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خالق باری یا اس کا زیادہ تر حصہ امیر خسرو کی تصنیف ضرور ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ امتداد زمانہ سے اس میں تصرف اور تحریف ہوتا رہا ہو اور بعض ہندی الفاظ کی شکل بدل گئی ہو۔ اس کی سب سے زیادہ معقول وجہ ایک تو یہ ہے کہ یہ تصنیف ہمیشہ امیر خسرو کی طرف منسوب رہی ہے اور خود مثنوی میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس عام روایت کو غلط سمجھنے کے لئے کافی ہو اور دوسرے یہ کہ امیر خسرو کے زمانے میں اس قسم کے نصاب کی واقعی ضرورت تھی اور یہی ضرورت اس کی تصنیف کی محرک ہوئی ہے۔"

خسرو سے منسوب پہیلیوں وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر محمد وحید مرزا اس کے آگے فرماتے ہیں "جہاں تک پہیلیوں وغیرہ کا تعلق ہے یہ بات یقینی ہے کہ ان میں بعض تو واقعی امیر خسرو کی تصنیف ہوں گی اور بعض جعلی اور مصنوعی۔ اس لئے کہ پہیلی ایسی چیز ہے کہ جو عام مذاق سے تعلق رکھتی ہے اور یہ بالکل ممکن ہے کہ بہت سی پہیلیاں خسرو کے بعد بنتی رہیں جنھیں خسرو کی طرف منسوب کر دیا گیا۔"

بہر حال اگر خالق باری کو امیر خسرو کے دائرہ تصنیف سے خارج بھی کر دیا جائے تو امیر خسرو کے وہ اشعار جو ذہنوں میں محفوظ ہیں یا دوسری کتابوں میں

بکھرے پڑے ہیں وہ سب اس بات کے شاہد ہیں کہ اردو کی بنیاد دہلی اور مضافات دہلی میں پڑی اور اس کی ابتدائی شکل امیر خسرو کے کلام میں ملتی ہے۔

اردو زبان کے ارتقا کے سلسلے میں سب سے مستند نقش حضرت گیسو دراز کی معراج العاشقین ہے جو ۱۴۱۲ء اور ۱۴۲۲ء کے درمیان کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب چودھویں صدی عیسوی کی 'زبان دہلوی' کی نشان دہی کرتی ہے...... زبان دہلوی یا کھڑی بولی کا ارتقار اگر ایک طرف اردو کی شکل میں خسرو اور دیگر صوفیائے کرام کے ہاتھوں میں ہو رہا تھا تو دوسری طرف وہ لشکریوں اور بیوپاریوں اور سادھوؤں کے ذریعہ پنجاب، دکن اور پورب کے علاقوں میں رواج پا چکی تھی جس کی شہادت ہمیں نامدیو، کبیر داس اور گرونانک کے کلام میں ملتی ہے[۱]

کبیر داس کا زمانہ ۱۴۴۰ء سے ۱۵۱۵ء تک ہے۔ پندرھویں صدی کی ہندوستانی کی سب سے مستند شکل ہمیں کبیر ہی کے کلام میں ملتی ہے۔ کبیر داس کے کلام میں ملی جلی زبان ملتی ہے جس میں کھڑی بولی، برج بھاشا، راجستھانی اور کبھی کبھی پنجابی کے اثرات نمایاں ہیں۔ غرضکہ اس نئی زبان کا خاکہ ہندوستان کی مختلف مروجہ زبان کو سمیٹ کر تیار ہو رہا تھا گویا بقول ڈاکٹر مسعود حسین خاں کثرت میں وحدت کا نقش ابھر رہا تھا۔[۲]

سکندر لودی کا عہد (۱۴۸۹ء-۱۵۱۷ء) اور اردو زبان

شمالی ہند میں خسرو کے بعد سکندر لودی کی تخت نشینی کے زمانہ تک ہمیں ریختہ کا کوئی شاعر یا ادیب نظر نہیں آتا۔ سکندر لودی بڑا علم دوست اور ادب نواز

---

[۱] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص۱۲۱ ۔ [۲] مختصر تاریخ ادب اردو مصنفہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ص۱۷

تھا۔ وہ شاعر تھا اور گلرخ اس کا تخلص تھا۔ اس کے عہد میں علم کی بڑی ترقی ہوئی۔ ہندو خاص کر کایستھ فارسی پڑھ کر دفاتر میں ملازم ہوئے۔ ان کے ذریعہ فارسی اور عربی الفاظ و اصطلاحات کو ملک میں پھیلنے کا زیادہ موقع ملا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ تھا کہ کبیر کے دوہوں، گرونانک کے گرنتھ صاحب اور تلسی داس کی رامائن میں عربی و فارسی کے الفاظ کافی ملتے ہیں۔

شاہان مغلیہ اور اردو

بابر (۱۵۲۶ء - ۱۵۳۰ء)

لودیوں کے بعد دور مغلیہ شروع ہوا۔ اس دور میں ہندو عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرنے لگے تھے۔ ہندوستانی (کھڑی بولی) کی مقبولیت بہت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ نووارد بابر بھی اپنی ترکی زبان کے ایک شعر میں تقریباً ڈیڑھ مصرعہ ہندی زبان میں کہہ کر اسی نئی زبان سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیتا ہے ؎

مج کا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی　　　فقرا ہلیغہ بس بولغوسید وپانی وروتی

بابر ترکی اور فارسی زبان کا ایک باکمال شاعر اور قابل انشا پرداز تھا۔ اس نے اپنی سوانح عمری تزک بابری کے نام سے لکھی ہے۔

ہندوستانی (کھڑی بولی) میں فارسی کے علاوہ عرصہ تک راجستھانی اثرات غالب تھے۔ بابر کے داخلہ دہلی تک ان اثرات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ بابر کا دربار لگا ہوا ہے۔ ابراہیم لودی کا سر کاٹ کر سامنے لایا جاتا ہے اس وقت کوئی

ہندی شاعر کہہ اٹھتا ہے (جمعہ ۸ رجب ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء) دوہرہ ؎

نوے اوپر تھا بتّیسا — پانی پت میں بھارت دیسا
اٹھئیں رجب سکّہ بارا — بابر جیتا براہیم ہارا

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اس دوہے کے متعلق فرماتے ہیں [1] "اس دوہے کی زبان کا تجزیہ کیجئے تو اس کی قدامت پر صاد کرنا پڑتا ہے۔ دیسا، اٹھئیں قدیم زبان دہلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جب رجّب اپ بھرنشی صوتیات سے مطابقت رکھتا ہے جیسے کہ پرتھوی راج راسو میں کمان کو کمّان، عربی کو عرّبی وغیرہ باندھا گیا ہے۔"

اکبر (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء)

عہد اکبر میں راجہ ٹوڈرمل نے ایک بڑا کام کیا جو اردو کی اشاعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ملک کے مالی حسابات اب تک دیسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ جن کو مسلمان افسران صیغہ مال اچھی طرح نہیں سمجھ پاتے تھے اور حساب کی جانچ میں ان کو مجبوراً مترجم سے مدد لینا پڑتی تھی۔ اس لئے راجہ ٹوڈرمل نے مسلمان افسروں کو ہندی زبان اور ہندی محاسبوں کو زبان فارسی سیکھنے کی سخت تاکید کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان فارسی کی تعلیم حصولِ ملازمت اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کے لئے بہت ضروری قرار پائی۔[2]

چونکہ شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں فارسی زبان کا علم حاصل کرنا حصول ملازمت اور قربت دربار شاہی کے کے لئے نہایت ضروری ہو گیا۔ اس لئے ہندوؤں نے خاص کر

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۱۵۳ ۔ [2] تاریخ ادب اردو ۔ رام بابو سکسینہ صفحہ ۱۹

کایستھوں، چھتریوں اور کشمیری پنڈتوں نے اس زمانہ میں بڑے ذوق وشوق سے فارسی پڑھنا شروع کی اور اس زبان میں کافی مہارت بہم پہنچائی۔ چونکہ فارسی تراکیب اور الفاظ سننے میں شیریں اور بھلے معلوم ہوتے ہیں اس لئے ان کو اردو زبان میں داخل کر کے اس زبان کو انھوں نے وسعت اور ترقی دینا شروع کی۔

اکبر کے عہد میں اندرونی امن وامان اور فارغ البالی کے باعث تمام علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی۔ اس کے عہد میں وہ بڑے بڑے علمار فضلار ہوئے جنھوں نے اعلیٰ پایہ کی طبعزاد کتابیں تصنیف کیں۔ آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے دربار میں فارسی کے ۵۹ شاعر موجود تھے۔ جن میں ابوالفضل فارسی کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ ابوالفضل کی تصنیفات اکبر نامہ اور آئینِ اکبری بہت مشہور ہیں۔ اسی زمانہ میں نظام الدین احمد نے 'طبقات ناصری' اور گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ لکھا۔ اکبر نے سنسکرت، عربی اور یونانی زبانوں کی متعدد مشہور کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کرایا۔ چنانچہ تزک بابری ترکی سے اور رامائن، مہابھارت، اتھروید، راج ترنگنی، پنچ تنتر وغیرہ کتابوں کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا۔

اکبر کے عہد میں ہندوستانی (کھڑی بولی) کا تنزل اور برج بھاشا کا عروج

اکبر کے عہد میں اس مخلوط زبان (زبان دہلوی) کو کافی ٹھیس لگی، کیونکہ اکبر نے اپنی حکومت کا مرکز اول فتح پور سیکری بعدۂ آگرہ کو رکھا جہاں پہ برج بھاشا اور راجستھانی بولیاں بولی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ شاہی محلوں میں راجپوت رانیوں کا دخل تھا۔ اور دربار میں برج بھاشا زبان کی سنگیت کا زور تھا۔ اس لئے اس عہد

میں برج بھاشا نے زور پکڑا۔ چنانچہ اکبر سے جو دوہے منسوب کیے جاتے ہیں وہ برج بھاشا میں ہیں۔ اس کے علاوہ اکبر کے سپہ سالار عبد الرحیم خان خاناں نے بھی برج بھاشا ہی میں اس پایہ کی شاعری کی ہے کہ وہ آج اس زبان کے ایک بڑے اور مستند شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان وجوہات سے کھڑی بولی کی نشو و نما میں اس عہد میں کوئی خاص امداد نہیں ملی۔ پھر بھی کھڑی بولی کا اثر کم نہیں تھا۔ اکبر ہی کے عہد میں گنگ کبی نے ۱۵۷۰ء میں "چند چھند برنن کی مہما" کھڑی بولی کی ہندی میں لکھی۔ اس کتاب کا ایک اقتباس یہ ہے[1]

"اکبر شاہ جی عام کہاس (خاص) میں تکھت (تخت) اور پر در اجمان ہو رہے۔ اور عام کہاس بھرنے لگا ہے جس میں تمام امرا آسے آئے کورنش بجائے جار کرکے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں۔ اپنی اپنی مسل سے جن کی بیٹھک نہیں سو ریسم کے رستے میں ریسم کی لوریں پکڑ پکڑ تاجیم (تعظیم) میں رہے۔"

جہانگیر (۱۶۰۵ء-۱۶۲۷ء)

اپنے جدِ امجد بابر کی تقلید میں جہانگیر نے بھی اپنی سوانح عمری "تزک جہانگیری" کے نام سے لکھی۔ جہانگیر بھی شعراء اور ادبا کا سرپرست تھا۔ چنانچہ ناصری نیشاپوری اس کے دربار کا فارسی کا سب سے بڑا شاعر تھا۔

شاہ جہاں (۱۶۲۷ء-۱۶۵۸ء)

شاہجہاں کے عہد تک برج بھاشا ترقی کر کے شمالی ہند کے بڑے حصّے کی واحد

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۴۳۶ بحوالہ تاریخ زبان اردو ص ۱۵۱

ادبی زبان بن گئی تھی۔ پنجاب سے بنارس تک اسی کا دور دورہ تھا۔ یہ کھڑی بولی کے علاقہ میں عام طور سے ادبی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔

جب شاہجہاں نے آگرہ چھوڑ کر ۱۶۴۸ء نئی دہلی بسائی تو زبان دہلوی کا ستارہ پھر چمک اٹھا۔ چنانچہ اردو کو ہمارے تذکرہ نویس عہد شاہجہاں ہی سے منسوب کرتے آئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زبان دہلوی کو حیات تو شاہجہاں ہی کے ہاتھوں ملی[1]

اگرچہ شاہجہاں کے ہمراہ برج بھاشا بولنے والے بھی دہلی گئے مگر رفتہ رفتہ برج بھاشا کا اثر مٹتا گیا اور تنہا کھڑی بولی (اردو) کو عروج حاصل ہوا۔ اس کے بعد یہ زبان اورنگ زیب کے زمانے تک اس قدر ترقی کرتی ہے کہ وہ برج بھاشا اور فارسی کی رقیب بن جاتی ہے اور پھر جلد انھیں پیچھے ڈھکیل کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

شاہجہاں بھی علمار اور شعرا کا قدردان تھا جن میں ابو صالح کلیم، حاجی محمد جان اور چندر بھان برہمن[2] بہت مشہور شاعر تھے۔ اس کے عہد میں بہت سی قابلِ قدر تاریخی کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ درباری مورخ عبدالحامد لاہوری نے بادشاہ نامہ اور عنایت خاں نے شاہجہاں نامہ لکھا۔ شاہجہاں کا سب سے بڑا لڑکا دارا عربی، فارسی اور سنسکرت کا بہت بڑا عالم تھا چنانچہ اس نے بھگوت گیتا، یوگ وشنشٹ اور اپنشد کی چند کتابوں کا سنسکرت سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

جہانگیر اور شاہجہاں ہندی کے سرپرست تھے چنانچہ سیناپتی، سردمن مسرا، بنارسی داس، بھوشن، متی رام، دیو اور کیسو داس وغیرہ ہندی کے باکمال شعرار اسی

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۱۶۳۔ [2] عہد شاہجہانی کے دو ہندو شعرار منشی ولی رام ولی اور چندر بھان برہمن تھے۔ ان پر کسی قدر تفصیل سے دوسرے باب میں تحریر کیا گیا ہے۔

عہد میں ہوئے۔ اسی عہد میں راجستھانی زبان کو بھی کافی عروج ہوا چنانچہ راجستھانی بھاشا میں پرتھوی راج اور رانا پرتاب کی حب الوطنی اور جنگ آزادی کے بارے میں راجستھانی بھاٹوں نے کتابیں لکھیں۔ اس عہد میں کھمان راسو، ہمیر راسو، رانا راسو اور سورج مل کا بنس بھاسکر وغیرہ کتابیں لکھی گئیں۔

شاہجہاں کے عہد حکومت میں جب دہلی میں ہر قوم اور ہر پیشہ کے لوگ آکر جمع ہوئے تو اس مخلوط زبان کی جسے اب تک ہندی، ہندوی، زبان دہلوی یا ریختہ کہتے تھے بہت ترقی ہوئی۔ اس عہد میں یہ زبان بات چیت کے درجہ سے ترقی کر کے خط و کتابت تک پہنچ گئی۔ چونکہ یہ زبان شہر پناہ کے اندر بازار لشکر میں جسے ترکی زبان میں اردو کہتے ہیں خاص طور سے بولی جاتی تھی اس لئے ریختہ کے بجائے اس زبان کا نام اس وقت سے زبان اردو (بازار لشکر کی زبان) ہوا۔ جب شاہجہاں نے دہلی کا لال قلعہ بنوایا تو دہلی کا نام اس نے شاہجہاں آباد رکھا اور قلعہ کا قلعۂ معلیٰ اور شاہی لشکر گاہ کا اردوئے معلیٰ رکھا۔ جب زبان اردو قلعۂ معلیٰ میں داخل ہوئی تو اردوئے معلیٰ کہلائی۔[1]

شاہجہاں کے عہد کی فارسی تصنیفات میں ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا لفظ بھی زبان کے لئے عام طور پر ملتا ہے۔ عبدالحمید لاہوری نے اس لفظ کو بارہا استعمال کیا ہے۔[2]

اردو کے مختلف نام

شمالی ہند میں محمد تغلق کے زمانہ تک اس جدید زبان کا کوئی نام رائج نہ تھا۔

---

[1] داستان تاریخ اردو۔ از حامد حسین ص۳۰۔ [2] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص۱۶۴ (طبع سوم)

خسرو اسے زبان دہلوی کہتا تھا مگر دکن میں وہ دکھنی کے نام سے موسوم ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ شمالی ہند میں بھی ریختہ، اردو اور اردوئے معلیٰ کے نام سے موسوم ہوئی۔ دکن میں اس کا نام عام طور سے دکھنی اور ہندی تھا۔ اگرچہ یہاں ایک اور نام "ریختہ" بھی استعمال ہوا ہے جسے سب سے پہلے ولی نے استعمال کیا ہے ؎

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دے
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

دکن میں زمانہ ولی سے پہلے ریختہ صرف اس کلام کو کہتے تھے جس میں مصرعوں کے بعض ارکان فارسی میں اور بعض دکھنی میں ہوتے تھے۔

مغلوں کے زمانے میں ہندوستان میں اردو کا لفظ لشکر و لشکر گاہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ بابر، اکبر اور جہانگیر کے فرمانوں اور سکّوں میں اردو کا لفظ لشکر کے معنوں میں درج ہے۔ شاہان مغلیہ کے زمانے میں شاہی لشکر اور لشکر گاہ (فرودگاہیں یا کیمپ) کو اردوئے معلیٰ کہتے تھے اور بازار لشکر کو اردو بازار یا بازار اردو کہتے تھے۔

شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ تک اس زبان کے لئے اردو کے لفظ کا رواج ثابت نہیں ہوتا لیکن زبان ہندی کے ساتھ ساتھ زبان ریختہ کا استعمال پایا جاتا ہے خصوصاً نظم اردو کو ریختہ کہتے تھے۔ ریختہ کے معنی گری پڑی چیز کے ہیں۔ فارسی شعرا اس نظم کو ریختہ کہتے تھے جو مختلف زبانوں سے مرکب ہو۔ قدیم شعرائے اردو کے کلام میں فارسی اور ہندی ملی جلی ہوتی تھیں اس لئے اس کو ریختہ کہتے تھے۔

شیخ مخدوم کاکوروی[1] (متوفی ۹۹۲ھ) اکبر شاہ کے زمانے میں تھے ان کی ایک

---

[1] داستان تاریخ اردو از حامد حسین قادری ص ۲، ۵

مخلوط غزل ملتی ہے۔ انھوں نے مقطع میں غزل کی زبان کو ریختہ فرمایا ہے ؎

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ　　شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

اس کے بعد عام نظم اردو کو ریختہ کہنے لگے اور یہ نام انیسویں صدی عیسوی تک مستعمل رہا۔ مثلاً

قایم　قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　ایک بات لچر سی بزبان دکھنی تھی

میر　خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

غالب　ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

انیسویں صدی عیسوی میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اردو زبان کو ہندستانی کے نام سے موسوم کیا۔

اورنگ زیب (۱۶۵۸ء-۱۷۰۷ء)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں تحریر فرماتے ہیں[۱]: "جیسا کہ خان آرزو کی تصحیح غریب اللغات سے معلوم ہوتا ہے زبان اردوے شاہی کو عالمگیر کے عہد میں ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب کی سنگیت دشمنی نے برج بھاشا کے وقار کو زبردست صدمہ پہنچایا اور اس کی فتح دکن نے بلا واسطہ زبان دہلی کو تیز تر کر دیا۔ دہلی والوں کا دکن سے یہ نیا ربط و ضبط لسانی اعتبار سے بہت ہی بار آور ہوا۔ اورنگ آبادی دکھنی اور دہلی کی زبان میں جو حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے اورنگ زیب کی فتح دکن ہی کا نتیجہ ہے۔ یہی زمانہ ہے جب کہ دہلی کی عوامی زبان کا نام "زبان اردو" یا "زبان اردوے

---

[۱] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۶۶، ص ۱۶۸

شاہی" یا "زبان اردوئے معلّیٰ" پڑتا ہے اور زبان دہلوی بزم ادب میں بار پاتی ہے۔ ولیؔ کے پہنچنے سے قبل دلّی میں ادبی تخلیق کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ فارسی والوں کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ حسب خواہ داد نہیں ملتی ہے۔۔۔۔۔ اہل دہلی کو دکنی پر اپنے زبان کے تفوق کا جو احساس تھا اس کا اظہار شاہ گلشن کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انھوں نے ولیؔ سے کہے تھے: "شما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلّیٰ شاہ جہاں آباد موزون بکنید۔"

شمالی ہند میں اردو زبان شاہجہانی عہد میں حالانکہ عام بول چال میں مستعمل تھی لیکن عہد عالمگیر تک شعراء و ادباء نے اسے جولانگاہِ فکر نہیں بنایا تھا۔ دفتری اور درباری زبان فارسی تھی اس لئے ادبی، علمی اور تاریخی تصانیف و نیز نثر و نظم پر فارسی کا قبضہ تھا۔ اردو ریختہ کی ابھی تک کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اورنگ زیب کے آخری زمانہ حکومت میں دہلی میں مرزا معیز الدین فطرتؔ، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، مرزا عبدالغنی قبولؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ، سلیمان قلی خاں داؤدؔ، شیخ سعد اللہ گلشنؔ، مرتضیٰ علی خاں مذاقؔ اور علی نقی خاں ندیمؔ وغیرہ نہایت خوشگو شعراء ہوئے ہیں لیکن یہ سب فارسی زبان کے اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اردو میں کبھی کبھی محض تفنّنِ طبع کے لئے کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا معیز الدین فطرتؔ اس عہد کے ایک زبردست فارسی شاعر تھے لیکن ان کا اردو کا شعر اس قماش کا ہوتا تھا۔

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پری ہے   در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پری ہے

اسی عہد کے ایک دیگر فارسی شاعر قزلباش امیدؔ کی اردو نوازی ملاحظہ ہو۔

بامن کی بیٹی آج موری آنکھ میں بری   غصہ کیا دگالی دیا اور دگر لری

اس زمانہ تک دکن اور شمالی ہند دونوں جگہ کی اردو شاعری میں ہندی زبان کا اثر غالب تھا اور مقامی رنگ بھی جھلکتا تھا۔ اردو شعرار ہندی شعرار کی تقلید میں معشوق کو سجن یا پیا کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور بجائے بلبل کے پپیہا کا ذکر کرتے تھے۔ چنانچہ داؤد دکنی کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

رات دن ہے پکاریں داؤد | جیوں پپیہا پیا پیا تجھ بن

دہلی آنے کے قبل ولی کا کلام بھی اسی رنگ میں ہوتا تھا چنانچہ ولی کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ترے بن مجھ کو اے ساجن تو یو گھر بار کرنا کیا | اگر تو نا اچھے مجھ کن تو یہ سنسار کرنا کیا
جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا | ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا

دکن میں اردو زبان کی نشو ونما

اردو زبان و ادب کی تاریخ چودھویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک دکن سے خاص طور پر تعلق رکھتی ہے۔ اس تین سو برس کے زمانہ میں جس طرح اردو نظم و نثر کی دکن میں نشو و نما ہوئی اس کا مجملاً ذکر یہاں ضروری ہے۔

اردو زبان دکن میں شمالی ہند سے پہنچی۔ اردو کے محققین نے دکن میں اس زبان کی اشاعت کا سلسلہ علاء الدین خلجی کی فتوحات دکن (۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۰ء) سے قایم کیا ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے جب گجرات اور دکن کو سنہ ۱۳۱۰ء تک اپنے قلمرو میں

داخل کر لیا تو مسلمان دکن میں جا کر آباد ہو گئے اور ان کے ساتھ اردو زبان بھی دکن میں پہنچی۔

زبان دہلوی کی دوسری بڑی لہر دکن میں سلطان محمد تغلق کی فتوحات دکن کے ساتھ پہنچتی ہے۔ ۱۳۳۵ء تک جب سلطان محمد تغلق کے زیر حکومت قریب قریب سارا ہندوستان آگیا تو اس نے اپنی اس وسیع سلطنت کا بہ آسانی انتظام کرنے کی غرض سے دیوگری کو پایہ تخت بنایا اور دہلی کے تمام باشندوں کو حکم دیا کہ وہ دہلی چھوڑ کر دیوگری چلے جاویں اور وہاں آباد ہوں۔ اس سے دہلی اور شمالی ہند میں اردو کی جمی جمائی محفل ویران ہو گئی۔ مگر دکن میں اس واقعہ سے اردو زبان کی نشوونما میں بڑی مدد ملی۔ اہل دہلی اپنے جان و مال کے ساتھ اردو زبان بھی دکن کو لے گئے جہاں اسے اتنی سرعت سے فروغ حاصل ہوا کہ شمالی ہند ترقی کے راستے میں اس سے بہت پیچھے رہ گیا۔

دکن والوں نے اس نئی زبان کو دکنی زبان میں شامل کر کے اسے دکنی اردو کا نام دیا۔ عوام و خواص اس میں کافی دلچسپی لینے لگے۔ یہاں بھی بزرگان دین کی مدد سے اس زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے مذہب کی تبلیغ اور اپنے خیالات کی اشاعت اس نئی زبان میں کی جس سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

دکن میں بہمنی خاندان کے بادشاہوں کے زمانہ میں اس زبان نے بہت وسعت اور مقبولیت حاصل کی جس سے دکن میں اردو کے تحریری نمونے بہمنی دور ہی سے ملنے لگتے ہیں جبکہ اس وقت تک شمالی ہند میں کوئی ادبی کارنامہ نہیں ملتا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز فیروز شاہ بہمنی کے عہد (۱۳۹۷ء-۱۴۲۲ء) میں گلبرگہ

میں رہتے تھے۔ تصوف سے متعلق ان کے تین رسالے پائے جاتے ہیں۔ معراج العاشقین، ہدایت نامہ اور رسالہ بارہ ماسہ۔

اسی دور کا ایک مشہور شاعر نظامی بھی ہے جو سلطان احمد شاہ بہمنی کے زمانہ (۱۴۲۲ء-۱۴۳۵ء) میں درباری شاعر تھا۔ مثنوی کدم راؤ پدم اس سے یادگار ہے۔

اس عہد کے دیگر نامور شعراء شاہ میراں جی، شاہ برہان الدین جانم، نصرتی، ہاشمی اور سیوا وغیرہ ہیں جن سے غزلوں کے علاوہ متعدد مثنویاں اور نظمیں یادگار ہیں۔

حالانکہ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں ہو گئیں مگر اس زبان کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جب اس زبان کی رسائی شاہان گولکنڈہ و بیجاپور کے درباریں ہو گئی تو اس نے خوب ترقی کی۔ سولہویں صدی عیسوی تک یہ زبان دکن میں نہ صرف پورے طور پر بولی جاتی تھی بلکہ رفتہ رفتہ وہ ادبی زبان بھی ہو گئی۔

قطب شاہی دور (۱۵۱۲ء-۱۶۸۷ء) اور اردو زبان

گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کا چوتھا بادشاہ ابراہیم قلی قطب شاہ علم پروری اور خوش اخلاقی میں اکبر سے کم نہ تھا۔ اس نے تیس۳۰ سال تک (۱۵۵۰ء-۱۵۸۰ء) تک نہایت شان کے ساتھ سلطنت کی۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کا سلوک اچھا تھا۔ چنانچہ بہت سے ہندو نہایت ممتاز عہدوں پر مامور تھے۔ اس کے درباریں اہل کمال کا مجمع تھا جو ادبی شغل میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے عہد میں اردو زبان کی بڑی ترقی ہوئی۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء-۱۶۱۱ء)

قطب شاہی خاندان کا پانچواں فرمانرواں فارسی اور ریختہ کا زبردست شاعر تھا۔ اس کے مجموعہ کلام کو (جو تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے) سنہ ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر زور کی جدید ترتیب سے ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ اس کے کلام کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جس وقت شمالی ہند میں شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں اردو شاعری نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے زیادہ کوئی شکل اختیار نہ کی تھی ٹھیک اسی وقت دکن میں سلطان محمد قلی قطب شاہ اس نوزائیدہ زبان میں اچھی خاصی شاعری کرتا تھا۔ اس کی شاعری مقامی خصوصیات سے مملو ہے۔ اس کی کلیات میں ہندوستان کے رسوم اور تہواروں پر نظمیں ملتی ہیں اور یہاں کے میووں، ترکاریوں اور پرندوں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

چمن میں پھول کھلتے دیکھ سکیاں کا مکہ یاد آیا — سہانا تھا محمد کھل نمن ان کا نین سارا
دسے نا سک کلی چمپا بھواں دو پات ہیں تس کے — بھنور تل دیکھ اس جاگا ہوا حیران من سارا
چمن میں آواز سن بلبل ایس میں آپ الاپیں ہیں — سو تن آواز سے موراں کریں رقصاں رین سارا

وجہی

وجہی اس زمانہ کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ ان کی دو کتابیں قطب مشتری اور سب رس بہت مشہور ہیں۔ سب رس وجہی کی بہت اہم اور مشہور تصنیف ہے۔ اس میں مسائل تصوف حسن و دل کے پیرایہ میں ایک قصہ کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ یہ تمثیلی انداز

کی اردو میں پہلی تصنیف ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بعد گولکنڈہ میں تین فرمانروا ہوئے اور یہ تینوں شاعر اور ادب نواز تھے۔ سلطان محمد قطب شاہ جہانگیر بادشاہ کا ہمعصر تھا۔ اس نے ۱۰۲۰ھ سے ۱۰۳۵ھ تک حکومت کی۔ اس کے دو دیوان ملتے ہیں۔ ایک فارسی میں اور دوسرا اردو میں۔ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

پیا سانولا من ہمارا کھلایا　　نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

ساقیا آ شراب ناب کہاں　　چندا کی پیالی میں آفتاب کہاں

خاکی، نوری اور غوّاصی اس عہد کے دیگر نامور شعراء ہوئے ہیں۔ ان کے ایک ایک شعر ملاحظہ ہوں:۔

خاکی۔ ٹھانی ہے اپنے من میں اب تو یہی سر جن　　تجھ پریم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

نوری۔ ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد　　بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

غوّاصی کی مثنوی سیف الملوک اور طوطی نامہ جس میں چار ہزار اشعار ہیں مشہور تصنیفات ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۷ء-۱۶۷۱ء)

یہ شاہجہاں بادشاہ کے ہمعصر تھے۔ یہ بھی فارسی اور اردو کے گرانمایہ شاعر اور قدردان علم و فن تھے۔ ان کے فارسی اور اردو دونوں دیوان موجود ہیں۔ نصرتی اور ابن نشاطی اسی عہد کے دیگر نامور شعراء ہیں۔ ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن مصنفہ ۱۰۶۶ھ ایک قابل قدر تصنیف ہے جس میں رسوم اور دکھنی طرز معاشرت کو جابجا بڑی

خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

ابوالحسن تانا شاہ (۱۶۷۲ء-۱۶۸۷ء)

یہ اورنگ زیب بادشاہ کے ہمعصر تھے۔ ان کا دربار بھی علمی دربار تھا۔ یہ خود بھی اردو کے شاعر تھے۔ ان کے ساتھ قطب شاہی خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ ان کا مندرجہ ذیل شعر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے ؎

کس در کہوں کاں جاؤں مجھ دل پہ پھل پھیرا ہے   اک بات کئے ہوں گے سجن یاں جی پہ بارہ باٹ ہے

فائزؔ اور بحریؔ اسی عہد کے شاعر ہیں۔ قاضی محمود بحریؔ ولیؔ کے ہمعصر تھے۔ چنانچہ ان دونوں کی زبان اور طرز بیان میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ زیادہ تر مذہبی اور صوفیانہ مضامین نظم کرتے تھے۔ ان سے دیوان غزلیات اور مثنوی من لگن یادگار ہیں۔

عادل شاہی عہد (۱۴۸۹ء-۱۶۸۶ء)

دکن میں اسی زمانہ میں (پندرھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک) بیجاپور بھی زبان اردو کا گہوارہ تھا۔ وہاں عادل شاہی خاندان کے کئی بادشاہ شاعر اور ادب نواز تھے۔ ابراہیم عادل شاہ نے اس زبان کو یہاں تک ترقی دی کہ اس نے اردو کو (۱۵۲۷ء کے قریب) عدالت کی زبان بنادی۔ سید میران ہاشمی بیجاپوری اور شاہ امین بیجاپوری یہاں کے قابل ذکر شعراء ہوئے ہیں۔

سرزمین دکن میں شاہان گولکنڈہ و بیجاپور کی ادب نوازی نے کثرت سے شعراء پیدا کئے۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی اسی زمانہ میں کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی

گئیں۔ الغرض اردو زبان و ادب کی نشو و نما دکن کے سلاطین کی توجہ اور ادب نوازی کی بڑی حد تک مرہونِ منت ہے۔

اورنگ آباد کا مرکز علم و فن بننا

اورنگ زیب نے عادل شاہی حکومت کو ۱۶۸۶ء میں اور قطب شاہی حکومت کو ۱۶۸۷ء میں ختم کر دیا۔ اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو فتح کر کے دکن میں اورنگ آباد کو اپنا مرکز بنایا۔ دکن کے وہ تمام شعراء جو شاہان گولکنڈہ اور بیجاپور کے دربار سے وابستہ تھے اب اورنگ آباد آ گئے۔ یہاں ان کی بڑی قدر کی گئی۔ اس دور کے شعراء میں میر غلام علی ارشد، مرزا علی نقی خاں ایجاد، میر عبد الوحی صارم، عارف الدین عاجز، میر اولاد ذکا، قاضی محمود بحری، فقیر اللہ آزاد، میر سراج الدین سراج، امین، وجدی اور شمس الدین ولی وغیرہ نے شہرت حاصل کی۔

شمس الدین ولی (۱۶۶۸ء - ۱۷۴۴ء)

اس دور کے تمام شعراء میں ولی سے زیادہ کسی نے شہرت نہیں حاصل کی۔ ولی کو مولانا آزاد نے آب حیات میں اردو نظم کا بابا آدم کہا ہے۔ یہ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور سب کو نہایت خوبی اور کامیابی سے نبھایا ہے۔

ولی کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا چنانچہ یہ دو بار دہلی آئے۔ پہلی بار ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے تھے۔ اس وقت ان کی شاہ سعد اللہ گلشن سے جب ملاقات ہوئی تو

انھوں نے ان کے اشعار سن کر فرمایا "شما زبان دکنی راگذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلّٰی شاہ جہاں آباد موزوں بکنید۔"

اس کے بعد ولی نے دکنی زبان اور محاورات کو کم کر کے دہلی کی زبان اور محاورات کو اپنے کلام میں استعمال کرنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ فارسی الفاظ و تخیلات کو بھی زوروں کے ساتھ اردو میں داخل کرنا شروع کیا۔

محمد شاہ کے عہد میں ۱۷۲۲ء میں ولی اپنا دیوان ریختہ لے کر دوبارہ دہلی آئے۔ اہل دہلی نے اس بار ان کے اردو کلام کی خوب قدر کی۔ اس کی شہرت و مقبولیت نے دہلی کے فارسی گو شعرا، آبرو، مضمون، جان جاناں، حاتم، ناجی، یکرنگ اور فغاں وغیرہ کو اردو شعر گوئی کی طرف متوجہ کیا۔

ولی کا کلام سادہ و بے تکلف ہونے کے علاوہ پیچیدہ استعارات اور دور از کار تشبیہات سے پاک ہے۔ اس میں تصوف کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ فارسی الفاظ اور تخیلات کی کثرت ضرور ہے مگر غلبہ نہیں ہے۔ ہندی لفظ بھی فارسی الفاظ کے ساتھ جا بجا ملتے جلتے ہیں جو بعد کو متروک ہو گئے۔[1]

دکن میں اردو شاعری کے ابتدائی دور کی خصوصیات

دکن کا کوئی شاعر مشکل سے ملے گا جس نے غزل کے علاوہ مثنوی بھی نہ لکھی ہو۔ دکن کی مثنویوں میں ہمیں ہر طرح کی مثنویاں (عاشقانہ، مذہبی، بیانیہ، فلسفیانہ، صوفیانہ، رزمیہ اور بزمیہ وغیرہ) ملتی ہیں۔ ان میں کچھ طبع زاد ہیں اور کچھ ترجمے۔ بعض کی زبان بھی بہت صاف ہے۔

---

[1] تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ صفحہ ۴۲

مرثیہ ـ مرثیہ کی داغ بیل بھی دکن میں پڑی۔ دکن میں مرثیہ اپنے ابتدائی دور میں بالکل مذہبی چیز سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے پڑھنے والوں کو اس میں کوئی ادبی لطف نہیں ملتا تھا۔ مگر عزلت نے مرثیہ کو ادبی رنگ بھی دیا۔ اس وقت سے جذبات نگاری اور سیرت نگاری کی طرف بھی کافی توجہ دی گئی۔

دکن سے اردو شاعری کے مرکز کا تبادلہ

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں ؎[1]:۔ "دیوان ولی کی اشاعت کے ساتھ ہی مرکز شاعری گویا دکن سے منتقل ہو کر دہلی میں آگیا۔ اس وجہ سے یہاں کے لوگوں کو ایک خاص دلچسپی شعر و شاعری کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ سیکڑوں متبع ولی کے پیدا ہو گئے جو ان کے کلام کی بڑی قدر کرتے تھے اور اسی طرز پر کہتے تھے۔ اب اردو شاعری فارسی شاعری کے دوش بدوش ترقی کرنے لگی گویا اس کی مدمقابل اور حریف بن گئی۔ گو ابھی تک اس میں وہ کہنگی اور پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے اس کی حریف زبان فارسی کو کوئی اندیشہ ہوتا۔ نظم اردو اب تک ایک کھلونا سمجھی جاتی تھی جس کو لوگ پسند ضرور کرتے تھے اور فارسی کلام کی محنت و دماغ سوزی کے بعد اس سے دل بہلاتے تھے۔"

---

[1] تاریخ ادب اردو صفحہ ۲

دوسرا باب

اردو کے قدیم ترین ہندو شعراء

۱۔ منشی ولی رام ولی[۱]

شمالی ہند میں مسلمان اور ہندو ریختہ گو شعراء میں سب سے پہلا شخص جس کی ادبی خدمات ہم تک پہنچی ہیں منشی ولی رام ولی کایستھ سکسینہ باشندہ شاہجہاں آباد ہیں۔ یہ شاہزادہ داراشکوہ کے مشیر خاص تھے۔ عربی و فارسی اور ہندی میں ملکۂ کامل رکھتے تھے چنانچہ ہر سہ زبان میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے اردو اشعار میں پہلا مصرع فارسی کا اور دوسرا اردو کا ہے جس سے اردو شاعری کی شمالی ہند میں بالکل ابتدائی حالت عیاں ہوتی ہے اور جو ریختہ کی ایک شکل تھی۔ یہ سنہ ۱۶۴۰ء میں بقید حیات تھے۔

نمونہ کلام

چہ دل بواری دریں دنیا کہ دنیا سے چلانا ہے — چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے
تو مہمان آمدی اینجا شدی خود خانہ خاوند — تو اپنے آپ سے بھولا کسی کو نہ پہچانا ہے
شراب سرخ مینوشی اجل کردی فراموشی — مروں کو دور مت سمجھو عجب یہ تمک بہانا ہے
قبا و چہرہ رنگیں ہمہ از تن تو بکشایند — دہیں گے کفن کی چادر جو تیرا خاص بانا ہے

۱؎ بہار سخن مولفہ برق سیتاپوری صفحہ ۲۹۳

یہ مادر پدر فرزنداں برادر ہا کہ می نازی — وہی تجھ کو جلائیں گے جناں پر سیت ٹھاناہے
طبیب دیدار می دارم کہ روز اول شفاعتہا — بسار دمت ولی راماکہ آخر رام راما ہے

یہ اشعار ہندو طرز معاشرت اور مذہبی اعتقادات کے آئینہ دار ہیں۔ مقطع میں ولی تخلص کے استعمال سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل منشی ولی رام ولی ہی کی کہی ہوئی ہے۔ اگرچہ اس غزل کو کوئی ادبی حیثیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس میں غزل کی خصوصیت نہیں ہے، پھر بھی یہ تاریخی عظمت اور قدامت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس زمانہ تک ریختہ کا یہی رنگ عام تھا۔ اس عہد کے مسلمان شعراء کا کلام بھی اسی طرز پر ہوتا تھا۔ یہی رنگ بتدریج صاف ہوتا گیا۔ اور اس قسم کی زبان ترقی کرتے کرتے آج کی ترقی یافتہ اردو زبان بن گئی۔

۲۔ رائے پنڈت چندر بھان برہمن (۱۵۷۵ء-۱۶۶۶ء)

فارسی اور اردو کے ایک دوسرے نامور ہندو شاعر جو اسی زمانہ میں ہوئے ہیں پنڈت چندر بھان تخلص بہ برہمن ہیں۔ انھوں نے ۱۶۶۶ء میں ۹۱ برس کی عمر میں وفات پائی۔

پنڈت چندر بھان برہمن بمقام لاہور یا آگرہ پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ نسلاً بعد نسلاً سنسکرت کی کبتائی کے مالک تھے اور اسی لحاظ سے پنڈت کہلاتے تھے۔ ان کے والد پنڈت دھرم داس نے شہنشاہ اکبر کے دوران سلطنت میں سنسکرت کی تعلیم ختم کرنے کے بعد فارسی پر دستگاہ کامل حاصل کی اور سلطنت مغلیہ کی ملازمت میں داخل ہو کر ایرانی عالموں اور فاضلوں کے پہلو بہ پہلو اپنی قابلیت کا سکہ بٹھایا اور روز افزوں ترقی

پاکر منصب دار سلطنت ہونے کا فخر حاصل کیا۔[1]

برہمن شروع شروع میں مولوی عبدالکریم میر عمارات (جس کے اہتمام سے تاج محل تیار ہوا تھا) کے پاس لاہور میں رہا کرتے تھے۔ انھیں کے ذریعہ ان کی رسائی افضل خاں شیرازی وزیر اعظم شاہجہاں تک ہوئی۔ اپنی لیاقت اور دانائی کی بناپر ممدوح مذکور کے یہاں یہ دیوان مقرر ہوئے۔

افضل خاں کی وفات کے بعد شاہجہاں نے برہمن کو ملازمانِ اہل قلم میں منسلک کرلیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب شاہزادہ داراشکوہ کو برہمن کی شاعری، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی نے گرویدہ کرلیا تو اس نے باپ سے برہمن کو مانگ لیا اور اپنے یہاں میر منشی کے عہدے پر مقرر کیا۔ ۱۶۴۹ء میں جب سعداللہ خاں وزیر سلطنت شاہجہاں کا انتقال ہوگیا تو شاہجہاں کی مردم شناس نظر نے چندربھان کو انتخاب کیا اور خطاب رائے رایان سے مفتخر فرماکر دفتر شاہی کا میر منشی مقرر کردیا۔ بعد کو قلمدان وزارت بھی ان کو سپرد کیا گیا۔

یہ اورنگ زیب کے زمانہ تک نوازشات شاہی سے فیض پاتے رہے۔ لیکن جب داراشکوہ قتل کیا گیا تو انھیں اپنے قدردان و مربی کی جدائی اس قدر شاق گذری کہ شاہی ملازمت سے مستعفی ہوکر وہ بنارس چلے گئے اور بقیہ تمام عمر وہاں عبادت و ریاضت میں گذار کر ۱۰۷۳ھ میں انتقال کیا۔

برہمن کی تصانیف میں فارسی زبان میں ایک دیوان غزلیات، قصاید و رباعیات کا اور مثنوی ہفت بحر ہیں۔ یہ مثنوی ۱۰۶۳ھ میں برہمن نے کہی تھی۔ جلوخانہ ریاست کپورتھلہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ تھا۔[2]

[1،2] بہارگلشنِ کشمیر جلد اول ص۶۵۸، ص۶۶۴ اور ص۱۱۲، ص۱۲۴

برہمن فارسی کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو میں بھی انھوں نے کچھ شاعری کی تھی مگر اس کا بیشتر حصہ تلف ہوگیا۔ ان کی کلیات فارسی و اردو میں جو دہلی سے شایع ہوئی ہے اردو کی صرف ایک غزل ملتی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

غزل [1]

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے — نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

خوباں کے باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یارو — نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں — نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

پیا کے ناؤں عاشق کوں قتل با عجب دیکھے ہیں — نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیاں سیں — نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

اس غزل کے مقطع میں برہمن تخلص اور اشنان، گنگا و جمنا وغیرہ الفاظ کے استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پنڈت چندربھان برہمن ہی کی کہی ہوئی ہے۔ منشی ولی رام ولی کی غزل ریختہ میں کہی گئی ہے یعنی اس کا پہلا مصرع فارسی میں اور دوسرا مصرع اردو میں کہا گیا ہے۔ برہمن کی یہ غزل ولی کی غزل کے پندرہ بیس سال بعد کی ہے اور وہ ریختہ میں نہیں بلکہ صرف اردو زبان میں کہی گئی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ برہمن کے زمانہ میں شمالی ہند میں اردو غزل ریختہ کے بجائے خالص اردو زبان میں کہی جانے لگی۔ حالانکہ اس میں ابھی تک غزل کی کوئی ادبی کیفیت پیدا نہ ہوسکی تھی۔

---

[1] کلیات کلام فارسی و اردو۔ از پنڈت چندربھان برہمن (مطبوعہ) صفحہ ۱۱۲۔ برہمن کی یہ مطبوعہ کلیات راقم کو دہلی میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی سے مل گئی تھی۔ یہ کتاب اب ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب سابق صدر اردو ڈپارٹمنٹ الہ آباد یونیورسٹی کے پاس محفوظ ہے۔

ہمن، پیا، ناؤں، سمرن، بیں، تیسی وغیرہ قدیم اردو یا ہندی الفاظ کے استعمال سے اس غزل کی قدامت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہ غزل شاہجہاں کے زمانہ کی شمالی ہند کی اردو زبان اور ابتدائی اردو غزل کا ایک مستند نمونہ ہے۔ اس لئے تاریخی عظمت کے لحاظ سے برہمن کی یہ غزل بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

تیسرا باب

اردو شاعری کا دور اوّل

(تقریباً ۱۷۰۰ء سے ۱۷۵۰ء تک)

آبرو و حاتم کا زمانہ

دور اوّل کا سیاسی اور سماجی پس منظر

ملک اور قوم کے سیاسی اور سماجی دھاروں پر زبان و ادب کی ترقی و تنزل کا انحصار ہوتا ہے۔ اس کے اتار چڑھاؤ سے زبان بنتی، بگڑتی اور سنورتی ہے۔ قوم کی سیاسی اور سماجی زندگی ادبی تخلیقات میں منعکس ہوتی رہتی ہے۔ یہ انعکاس کسی دور میں کم نمایاں رہتا ہے اور کسی عہد میں زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ کسی عہد کا ادب سماجی اور سیاسی زندگی سے بالکل منزہ اور مبرا ہو۔ اس لئے ابتدائی اردو شاعری کے ادبی تجزیہ سے قبل اس کے تاریخی اور سیاسی پس منظر کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب نے وفات پائی۔ اس کے مرتے ہی سلطنت مغلیہ کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں اور زوال پذیری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اورنگ زیب

کے بعد خاندان مغلیہ میں کوئی دوسرا اولوالعزم و باوقار حکمراں تخت دہلی پر متمکن نہ ہو سکا۔ ان بادشاہوں کی کمزوریوں اور اراکین سلطنت کی سازشوں سے فائدہ اٹھا کر پنجاب میں سکھوں نے، راجپوتانے میں راجپوتوں نے اور جنوب میں مرہٹوں نے مرکزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا شروع کیا اور روز بروز شاہی اقتدار کم ہونے لگا۔

اورنگ زیب کی وفات پر معظم، اعظم اور کام بخش میں سلطنت کی وراثت کے لئے نبرد آزمائیاں ہوئیں۔ معظم فتحیاب ہو کر بہادر شاہ کے لقب سے ۶۳ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے صرف پانچ سال تک حکومت کی۔ اس نے اپنا سارا وقت سکھوں کے باغی سردار بندہ کی سرکوبی میں صرف کیا مگر پھر بھی بغاوت فرو نہ ہو سکی۔ اس افراط و تفریط کے عالم میں امن و سکون مفقود تھا۔

۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کی وفات پر جہاندار شاہ نے وراثت کے لئے اپنے تین بھائیوں سے جنگ کی اور انھیں قتل کر کے تخت نشین ہوا۔ اس نے صرف گیارہ مہینے حکومت کی۔ اس کا کردار اچھا نہ تھا۔ اسی زمانے میں پٹنہ کے نائب گورنر سید حسین علی خاں تھے اور اس کے بڑے بھائی سید عبداللہ خاں الہ آباد کے نائب گورنر تھے اور جہاندار شاہ کا بھتیجا فرخ سیر بنگال کا نائب گورنر تھا۔ ان دونوں سید بھائیوں کی مدد سے فرخ سیر نے جہاندار شاہ کو آگرہ میں شکست دی اور ۱۱ فروری ۱۷۱۳ء کو اسے دہلی میں قتل کرا دیا۔ یہ دونوں سید بھائی اس کے بعد تاریخ میں "بادشاہ گر" کے نام سے مشہور ہوئے۔ جہاندار شاہ کے مختصر زمانہ میں امن و سکون اور ادبی فضا کا قائم ہونا محال تھا۔

فرخ سیر کے تخت نشین ہونے پر سید عبداللہ خاں وزیر اعظم اور حسین علی خاں سپہ سالار یعنی میر بخشی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ فرخ سیر کا ان دونوں سید بھائیوں کے سامنے کوئی زور نہ چلتا تھا۔ اسے ان دونوں کے اشاروں پر چلنا پڑتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنا سارا وقت اور تمام کوشش ان دونوں سید بھائیوں کے قتل کرانے کی سازشوں میں صرف کی۔ اپنے خلاف پیہم سازشوں کی وجہ سے سید بھائی فرخ سیر سے حد درجہ ناراض ہو گئے۔ آخرکار انھوں نے مرہٹہ پیشوا بالاجی بشوناتھ راؤ کی فوجی امداد سے فرخ سیر کو زیر کر لیا اور اسے اندھا کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور بعد میں ۲۸ اپریل ۱۷۱۹ء کو اسے قتل کرا دیا۔ فرخ سیر مغلیہ خاندان کا سب سے کمزور بادشاہ تھا۔ اسے علم و ادب سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔

فرخ سیر کی وفات کے بعد سید بھائیوں نے یکے بعد دیگرے دو اور بادشاہوں کو تخت نشین کیا مگر وہ دونوں دق کے مریض تھے اور چند ماہ کی تخت نشینی کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کے بعد انھوں نے ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ کو تخت نشین کیا جس نے ۱۷۴۸ء تک حکومت کی۔ محمد شاہ کا دورِ حکومت سلطنت مغلیہ کے زوال اور دہلی کی تباہی کی دردناک کہانی ہے۔ محمد شاہ نے امرا کی سازشوں سے سید بھائیوں کو قتل کرا دیا جس سے سارے قلمرو میں بدامنی پھیل گئی۔ محمد شاہ کے برتاؤ سے تنگ آکر اس کا وزیر آصف جاہ نظام الملک ۸ دسمبر ۱۷۲۰ء کو شکار کے بہانے سے دہلی سے دکن کو روانہ ہو گیا۔ وہاں دکن کے چھ صوبوں کو فتح کر کے ۱۷۲۴ء میں اس نے حیدرآباد میں ایک خودمختار ریاست کی بنیاد ڈالی۔ مرہٹوں کی لوٹ مار سے اپنی ریاست کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے مرہٹوں کو شمالی ہند کی طرف اپنی طاقت کو بڑھانے کی صلاح

دی جس سے انھوں نے مغلیہ سلطنت کے اندر شمالی ہند میں لوٹ مار شروع کی۔ اسی زمانے میں سعادت خاں برہان الملک نے جو ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو اودھ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا، خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مئی ۱۷۴۰ء میں بہار، بنگال اور اڑیسہ کے گورنر علی وردی نے بھی روگردانی کی۔ اس طرح سلطنت مغلیہ کے کئی کھنڈ ہو گئے۔

چونکہ محمد شاہ نے فارس کے بادشاہ نادر شاہ کے خلاف افغانی باغیوں کو پناہ دی تھی اس لئے افغانی باغیوں اور محمد شاہ کو سزا دینے کے لئے نادر شاہ نے ۵۵ ہزار سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ محمد شاہ نے اس کا مقابلہ کیا مگر مغلوب ہو کر صلح کرنے پر مجبور رہا۔ ۲۰ مارچ ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ محمد شاہ کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا۔ ۲۲ مارچ کو شہر میں بلوہ ہوا جس میں کچھ ایرانی سپاہی مارے گئے اور یہ افواہ پھیلی کہ نادر شاہ مارا گیا۔ اس حرکت سے خفا ہو کر نادر شاہ نے ۲۳ مارچ کو اپنی فوج کو قتل عام کا حکم دیا۔ آٹھ گھنٹے تک قتل عام برابر جاری رہا جس میں تیس ہزار آدمی مارے گئے۔ شام کو محمد شاہ کی درخواست پر نادر شاہ نے قتل عام بند کیا۔ اس کے بعد وہ ۱۵ مئی تک دہلی میں رہا اور تقریباً دو ماہ تک لوٹ مار کا بازار گرم رہا ہزارہا مکانات لوٹے اور جلائے گئے۔ آخر کار کوہ نور، تخت طاؤس، تیس کروڑ نقد روپیہ، بے شمار جواہرات، سونے چاندی کے برتن، آرائشی سامان، ایک ہزار ہاتھی، سات ہزار گھوڑے، دس ہزار اونٹ، ۱۳۰ محرر، دو سو معمار، ایک سو کاریگر اور دو سو بڑھئی ساتھ لے کر نادر شاہ فارس واپس چلا گیا۔ اس نے کابل کا صوبہ بھی فارس میں شامل کر لیا۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب مغل ایمپائر (MUGHAL EMPIRE) مصنفہ ڈاکٹر آشیر بادی لال سری واستو ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، اڈیشن صفحہ ۲۳۲

نادر شاہ کے حملے نے محمد شاہ اور اس کے دربار کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔

مرہٹوں کے حملے اب مالوہ اور بندیل کھنڈ سے آگے بڑھ کر شمال کی طرف ہونے لگے۔

محمد شاہ نے ۲۶ر اپریل ۱۷۴۸ء کو وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا لڑکا احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ ایک ناتجربہ کار اور ناقابل بادشاہ تھا۔ اس کا زمانہ بھی وزیر صفدر جنگ کے خلاف سازشوں میں گذرا۔ آخرش ۲ر جون ۱۷۵۴ء کو ایک نئے وزیر عماد الملک نے احمد شاہ کو تخت سے اتار کر عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ ایک ہفتہ کے بعد احمد شاہ اور اس کی ماں کی آنکھیں نکال لی گئیں

یہ ہے مختصر تاریخی اور سیاسی پس منظر جس میں اردو غزل کی نشو و نما ہوئی۔ اس طوائف الملوکی، تباہی اور بربادی کے زمانے میں یہ بگڑی، بنی اور سنوری۔ سکون اور عیش و عشرت کا زمانہ ہوتا تو شاید اتنی ترقی نہ ہوتی[۱]

دورِ اول کی ادبی تاریخ

ہندوستان کی تاریخ میں محمد شاہی عہد سیاسی زوال اور ثقافتی عروج کے لئے بہت مشہور رہے۔ اس عہد کے قبل شعرا عموماً فارسی میں شعر کہتے تھے کیونکہ اس وقت تک اردو کے ریختہ کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اورنگ زیب کے آخری زمانۂ حکومت میں نظرت، بیدل، قبول اور آرزو وغیرہ چند مشہور شعرا ہوئے ہیں لیکن یہ سب فارسی زبان کے اچھے شاعر تھے۔ اردو میں یہ لوگ کبھی کبھی محض تفنن طبع کے لئے کچھ شعر کہہ لیا کرتے تھے۔

---

[۱] اردو غزل کی نشو و نما از ڈاکٹر سید رفیق حسین صفحہ ۱۶۶

اورنگ زیب کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد فرخ سیر کے عہد حکومت (۱۷۱۳ء-۱۷۱۹ء) تک باشندگان دہلی مرہٹوں کے پیہم حملوں اور شاہان دہلی امراء اور سید بھائیوں کی سازشوں سے سخت پریشان تھے۔ ۱۷۲۱ء میں سید بھائیوں کے قتل ہو جانے کے بعد جب محمد شاہ کی ان سے گلو خلاصی ہوئی تو کچھ امن و سکون حاصل ہوا، اسی لئے شمالی ہند میں اردو شعر گوئی کا رواج اس وقت سے ہوا جب محمد شاہ کے عہد (۱۷۲۲ء) میں ولی اپنے دیوان ریختہ کے ساتھ دوبارہ[1] دہلی آیا اور اس نے اپنا اردو کلام محمد شاہ کے دربار میں سنایا۔ اہل دہلی نے ولی کے اردو اشعار کی خوب داد دی۔ اس کی شہرت اور مقبولیت کی بنا پر دہلی کے بعض شعراء کو اردو میں کہنے کا شوق ہوا اور وہ اس میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ چنانچہ آبرو، حاتم، مضمون، ناجی اور مظہر جانجاناں نے فارسی میں شعر کہنے کے علاوہ ریختہ میں بھی شعر کہنا شروع کیا۔ یک رنگ اور فغاں بھی انہی شعرائے متقدمین میں سے تھے۔ انہی بزرگوں کی آغوش عاطفت میں اردو شاعری کی تربیت ہوئی۔

---

[1] ولی کی جائے سکونت کے متعلق مختلف نظریے ہیں۔ آزاد نے آب حیات میں صفحہ ۸۹ پر انھیں احمد آباد گجرات کا باشندہ بحوالہ تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم لکھا ہے اور ان کے اورنگ آبادی ہونے پر جس کا ذکر میر تقی میر نے نکات الشعرا میں کیا ہے، تعجب کا اظہار کیا ہے۔ لیکن رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو (A HISTORY OF URDU LITRATURE) میں صفحہ ۴۱ پر تحریر کیا ہے کہ ولی اورنگ آباد دکن میں ۱۶۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے میر تقی میر کے بیان کی تائید کی ہے اور گارساں دی تاسی بلوم ہارٹ اور میر حسن کے بیانات کی تردید کی ہے کہ ولی احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئے۔ [2] ولی پہلی بار ۱۷۰۰ء میں اورنگ زیب کے عہد میں دہلی آیا تھا۔

ان شعرا کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام کا یہاں پیش کرنا ضروری ہے تاکہ اس سے ان کے ہمعصر ہندو شعرا کے کلام کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکے۔ آبِ حیات اور دیگر ادبی تاریخوں میں ان کے حالات زندگی اور اشعار پر کسی قدر زیادہ شرح و بسط سے کام لیا گیا ہے۔

ان ادبی تاریخوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آبرو ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ یہ عام فہم اور نرم ہندی الفاظ اپنے کلام میں استعمال کرتے تھے اور رعایت لفظی کے شائق تھے۔ ۱۷۵۰ء میں فوت ہوئے۔

نمونۂ کلام

نین سیں نین جب ملائے گیا   دل کے اندر مرے سمائے گیا
نگہِ گرم سیں مرے دل میں   خوش نین آگ سی لگائے گیا

گانٹھ کاٹی ہے مرے دل کی تری انکھاں نے   دو پلک نہیں یہ کترنی ہے مگر چوزرماں کی
لب شیریں پہ سبزے کے نہیں خط سیاہ   ڈار چھوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی

شیخ ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ء - ۱۷۹۱ء) اپنی عالمانہ قابلیت اور شاعرانہ صلاحیت کی بنا پر دہلی اسکول کے بانی کہے جاتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کافی تھی۔ مرزا محمد رفیع سودا جو اردو کے بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں، انہی کے شاگرد تھے۔ برخلاف آبرو کے انھوں نے ہندی کے الفاظ استعمال کرنے سے گریز کیا اور زبان و بیان کی صفائی اور روانی کو اپنے پیش نظر رکھا۔ اصلاح زبان کی طرف بھی سب سے پہلے انھوں نے نظر کی۔ کلام کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ بھی

رعایت لفظی کے شائق تھے۔

نمونۂ کلام

مثال بحر موجیں مارتا ہے — کیا ہے جس نے اس جگ سوں کنارا
سیانے خلق سے یوں بھاگتے ہیں — کہ جوں آتش ستی بھاگے ہے پارا
جب سنا موتی نے تجھ دنداں کے موتی کا بہا — آب میں شرمندگی سوں ڈوب جوں پانی بہا
لب تمھارے سرخ ہم نے تاڑ کر پوچھا تھا مول — جوہری کہنے لگے یہ لعل ہے گا بے بہا

شیخ شرف الدین مضمون متوفی ۱۷۴۷ء خان آرزو کے شاگرد تھے۔ ان کے باکمال ہونے کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ان کے انتقال پر سودا نے اپنی ایک غزل کے ایک مقطع میں انھیں بڑے اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے:

بنائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی — گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

یہ بھی تناسب لفظی کے دلدادہ تھے۔

نمونۂ کلام

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں — ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جور باغباں
خط آگیا ہے اس کے مری ہے سفید ریش — کرتا ہے اب تلک بھی وہ ملنے میں شام و صبح
تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر — آب پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال
چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے — کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے

محمد شاکر ناجی اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا شمار بھی طبقۂ اوّل کے

کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ بہت تند مزاج اور شوخ طبیعت تھے۔ رعایت لفظی بہت مرغوب تھی۔

نمونۂ کلام

دیکھ موہن تری کمر کی طرف　　پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف
جن نے دیکھے ترے لب شیریں　　نظر ان کی نہیں شکر کی طرف

غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ امرائے شاہی میں تھے۔ خوش فکری ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ کہنہ مشق ہونے کے باوجود اپنا کلام مظہر جانجاناں کو بھی دکھاتے تھے۔ تناسب لفظی کے شائق تھے۔

نمونۂ کلام

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے　　دل سے صبر و قرار جاتا ہے
پارسائی اور جوانی کیونکر ہو　　ایک جگہ آگ و پانی کیونکر ہو
جدائی سے تری اے صندلی رنگ　　مجھے یہ زندگانی درد سر ہے

اشرف علی فغاں احمد شاہ کے کوکا تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو فغاں دہلی سے مرشد آباد چلے گئے اور کچھ دنوں کے بعد پٹنہ آ گئے جہاں مہاراجہ شتاب رائے نے ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ۱۷۷۲ء میں پٹنہ ہی میں وفات پائی۔ ان کا کلام پاکیزہ اور مفید ہے۔ انھوں نے ایہام گوئی ترک کر دی تھی۔ نمونۂ کلام

مبتلائے عشق کو اے ہمدماں شادی کہاں　　آ گئے اب تو گرفتاری میں آزادی کہاں

کباب ہو گیا آخر کو کچھ برا نہ ہوا | عجب یہ دل ہے جلا بھی تو بے مزا نہ ہوا
شگفتگی سے ہے غنچہ کے تئیں پریشانی | بھلا ہوا کا فر جو مجھ سے وا نہ ہوا

شمس الدین مظہر کی عرفیت جانجاناں یا جانِ جاں تھی۔ ۱۱۱۱ھ میں مالوہ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۵ھ میں ایک شخص کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ ان کا ایک دیوان فارسی میں ہے۔ اردو کا دیوان نایاب ہے۔ عالم متبحر اور فقیہہ کامل تھے۔ انھوں نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں اور خیالات شامل کئے اور قدیم طرزِ ایہام گوئی کو ترک کیا۔ ان کا شمار شعرائے متقدمین کے طبقہ اول کے علاوہ طبقۂ دوم میں بھی ہوتا ہے۔ ان کا کلام بہت پاکیزہ اور شستہ ہے۔

نمونۂ کلام

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا | نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے | اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار | ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

شاخِ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں | ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

متذکرہ بالا قدیم شعرائے اردو کے کلام کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زبان وبیان اور طرز و اسلوب کی کوئی مستقل صورت ابھی قائم نہ ہو سکی تھی۔ بعضوں نے ایہام گوئی ترک کی تھی اور یہی ایہام گوئی بعضوں کا طرۂ امتیاز تھی۔ رعایتِ لفظی

۱؎ اس دور کے مسلم شعراء کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام آبِ حیات اور اردو غزل کی نشو و نما سے ماخوذ ہیں۔

ایسی خصوصیت تھی جسے وصف مشترک کی حیثیت حاصل تھی۔ تقریباً ہر شاعر کے کلام میں اس کی رعایت ہوتی تھی۔ کچھ آبرو ایسے شاعر تھے جو ہندی الفاظ کے دلدادہ تھے۔ لیکن اس حد تک نہیں جتنا کہ دکنی شعرا کے کلام میں یہ عنصر ملتا ہے۔

حاتم کی مسلسل کوشش یہ تھی کہ فارسیت کا غلبہ ہو اور ہندی اثرات کم ہوں۔ اس ملے جلے ادبی ماحول میں ہندو شعرا نے جن شاعرانہ روائتوں کو اپنایا ان کا تفصیلی ذکر اس باب میں و نیز آئندہ ابواب میں کیا جائے گا۔ لیکن اتنا عرض کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ ان شعرا کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انھوں نے اپنی شاعرانہ انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے نئی راہیں تلاش کی تھیں جو کسی قدر ان شعرا سے مختلف تھیں مگر نامانوس نہ تھیں۔ ایہام گوئی جس کی ابتدا کا سراغ سنسکرت اور ہندی شاعری میں ملتا ہے وہ ان ہندو شعراء کو مرغوب نہ تھی۔ اس پر کسی قدر حیرت ہوتی ہے۔ اس بات پر بھی تعجب ہوتا ہے کہ یہ ہندی کے الفاظ اپنے کلام میں بہت زیادہ نہیں استعمال کرتے تھے۔ اس کے بجائے عربی و فارسی کے الفاظ ان کے کلام میں کثرت سے ملتے ہیں۔ اسے اتفاقیہ امر نہیں کہا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ باہمی مفاہمت اور ہندو مسلم کلچر و ثقافت کے اتحاد و امتزاج کا نتیجہ تھا۔ ایک دوسرے سے میل جول اور محبت و موافقت ہونے کی بنا پر یہ ایک شریفانہ سمجھوتہ تھا کہ ایک دوسرے کی زبان اور کلچر سے وہ یگانگت اور بھائی چارے کا اظہار کریں۔ اس معاملے میں معاندانہ جذبہ کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ ایک دوسرے سے قریب آنے کی کوشش تھی۔ جس کی وجہ سے یہ مختلف راستے اختیار کئے گئے تھے۔ مثالوں میں جو اشعار پیش کئے گئے ہیں ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ ان سے ہندو شعرا کے کلام کا تقابلی مطالعہ

کیا جا سکے۔

اس دور کے سربرآوردہ مسلم شعرا آبرو، حاتم، مضمون، ناجی، یکرنگ اور مظہر جانجاں تھے۔ ان کے ہم عصر ہندوؤں میں لالہ ٹیک چند بہار، آفتاب رائے رسوا، آنند رام مخلص، رام نرائن موزوں اور سیتا رام عمدہ تھے۔

یہ شعرا نیز دیگر ہندو شعرا جن کو اس مقالہ میں شامل کیا گیا ہے اپنے ہمعصروں میں اتنے مقبول اور مشہور ہو چکے تھے کہ ان کا ذکر قدیم تذکروں میں پایا جاتا ہے جن کے مصنف و مرتب زیادہ تر مسلمان شعرا و ادب تھے اور میری اطلاعات انہی تذکروں سے ماخوذ ہیں۔ ان کے صفحات کا حوالہ میں نے ہر شاعر کے ذکر میں حاشیہ پر درج کر دیا ہے۔

دورِ اوّل کے ممتاز ہندو شعرا

۱۔ لالہ ٹیک چند بہار[1] شاہجہان آبادی (۱۶۸۴ء-۱۷۵۴ء)

لالہ ٹیک چند بہار سراج الدین علی خاں آرزو کے خاص شاگردوں میں تھے۔ یہ سودا و میر کے ہمعصر اور فارسی کے عالم متبحر و زبردست محقق تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے اور مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو اور فتح علی گردیزی کے خاص احباب میں شمار کئے جاتے تھے۔

---

[1] تذکرہ شعرائے ہنود۔ بشاس ص ۲۳

آپ[1] کی تصنیفات لغاتِ بہارِ عجم، رسالہ جواہر الحروف، نوادر المصادر، ابطال ضرورت اور بہار بوستاں آج بھی بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ لغاتِ بہارِ عجم ان کی بڑی قابل قدر اور مستند تصنیف ہے۔ اس کتاب میں الفاظ کے معانی کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے اور ہر موقع و محل پر استادوں کے نادر اور لطیف اشعار بطور مثال پیش کئے ہیں۔ انھوں نے فارسی اصطلاحات کو فارس کے سفر کے بعد جمع کیا تھا۔ چنانچہ گلزار ابراہیم[2] میں علی ابراہیم خاں، بہار کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"در عربی مناسبت و در فارسی مہارت داشت۔ بطور سیاحت ایران رفتہ و در لغاتِ فارسی کتابے موسوم بہ بہارِ عجم نوشتہ۔ از یاران سراج الدین علی خاں آرزو بود۔ گاہے ریختہ ہم گفت۔"

بہار کو تحقیق لغات و محاورات کا جنون تھا۔ چنانچہ نادر شاہ نے جب دہلی کے گلی کوچہ میں قتل و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا علم و ادب کا یہ جویا ہتھیلی پر سر رکھے ہوئے قزلباش سپاہیوں سے فارسی لغات و محاورات کی تصدیق کرتا پھرتا تھا۔[3]

احمد شاہ کے زمانہ میں انھوں نے ۱۷۵۴ء میں بعمر ستر سال وفات پائی۔ یہ بڑے خوش مزاج، رنگین طبع اور بادنا شخص تھے۔ شہر کے رؤسا اور عمائدین انکی بڑی قدر کرتے تھے۔

۱۔ تذکرہ شعرائے ہنود۔ بشاش صفحہ ۲۳ ۔ ۲۔ تذکرہ گلزار ابراہیم صفحہ ۶۴ ۔ ۳۔ ہندوؤں میں اردو از سید رفیق مارہروی صفحہ ۱۲

میر تقی میر نے نکات الشعرا میں بہار کے کلام کے متعلق یہ لکھا ہے:"بہار سخن از لفظش ہزار ہزار رنگ معنی گل می کند۔"

بہار کا دیوان انقلابات روزگار سے ناپید ہو گیا۔ پھر بھی قدیم تذکروں میں ان کے متعدد اشعار ملتے ہیں۔"تذکرہ چمنستان شعرا" مصنفہ رائے لچھمی نرائن شفیق اور "تذکرہ ریختہ گویان" مولفہ فتح علی حسینی گردیزی میں ان کے کلام کا کافی نمونہ دیا گیا ہے۔

نمونۂ کلام

ہندو و مسلم مذاہب کی یگانگت کی تلقین کے لئے بہار کے مندرجہ ذیل دو شعر بہت مشہور ہو گئے ہیں:

وہی اک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں

اگر جلوہ نہیں ہے کفر کا اسلام میں ظاہر
سلیمانی کے خط کو دیکھ کیوں زنار کہتے ہیں

دیگر اشعار

ہمیں واعظ ڈراتا کیوں ہے دوزخ کے عذابوں سے
معاصی گو ہمارے بیش ہوں کیا مغفرت کم ہے

نہیں معلوم کیا حکمت ہے شیخ اس آفرینش میں
ہمیں ایسا خرابا تی کیا تم کو مناجاتی

اسی درگاہ سے حاجت روا ہوتی ہے عالم کی
جہاں دیتے ہیں بن مانگے فضولی ہے طلب لالا

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس
یہ عجب مظہر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

۱؎ نکات الشعرا ص ۱۴۱ ۔ ۲؎ اسی مضمون کو میر تقی میر اور مرزا سودا نے بھی اس طرح باندھا ہے:

میر — کفر کو چاہئے اسلام کی زینت کے لئے / حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

سودا — ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی / نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

تڑپتا ہے پڑا جیوں نیم بسمل خاک خوں میں دل
عقوبت ہے جو کچھ اس صید پر صیاد کیا جانے

کہتے ہیں عندلیب گرفتار مجھ کو دیکھ
امید جیونے کی نہیں اس بہار بیچ

گیا ہے عشق کی رہ پا برہنہ بہار
تمام دشت ہے پرخار دیکھیے کیا ہو

جب سیتی اس سرو رعنا کا ہوا ہے جلوہ گاہ
سبز جوں شمشاد اٹھتی ہے مرے سینے سے آہ

دل ہمارا لے کے کیوں انکار کرتے ہو سجن
کس سے یہ سیکھے ہو تم مکر جانے کی طرح

کٹے ہیں بے ستم گر قتل بے تقصیر کیا کیجے
جوان کے ہاتھ یوں مرنا ہوا تقدیر کیا کیجے

سانورے سب ایک سے ہیں ظلم کرنے میں بہار
کم نہیں کچھ دل کے جانے میں کاکل چشم سے

بہار اس گلبدن کا جو دوانا ہے تو کیا اچرج
فرشتے کا بھی من ایسے پری اوپر لبھانا ہے

دیکھ کر کیوں نہ ہووے دل رقیبوں کا کباب
کس ادا سیتی صنم دیتا ہے ساغر دا چھڑے

کوئی کس ساتھ ایسی فصل گل میں دل کو بہلاوے
نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ مطرب ہے نہ ہمدم ہے

جو کچھ جا کر گلستاں میں کیا ہے کیوں چھپاتے ہو
عیاں ہے آستیں کی چیں سے موج خون گل لالہ

کیا بلا لاوے گا سر پر اس کے حیراں ہوں بہار
لے گیا ہے شوخ میرے ہاتھ سے دل بے طرح

منظور سیر لالہ ہو جو اس بہار بیچ
پھولا ہے خوب دیکھ دل داغدار بیچ

نہیں اس شوخ سا رنگیں ادا گل
اگر رنگیں ہوا تو کیا ہوا گل

ناز بے جا و لطف بے موقع
دلبروں کی ادا ہے کیا کیا کچھ

عبث تشویش کیوں دیتے ہو گل کی طبع نازک ہے
یہ گستاخی نہیں ہے خوب مت کر شور اے بلبل

اتا مردم کشی کا زور بیماروں نے کب پایا
غلط کرتے ہیں ان آنکھوں کو جو بیمار کہتے ہیں

کرے وہ سلطنت وہ عشق میں شیریں کے سر دیوے
تکلف بر طرف خسرو کو کیا فرہاد سے نسبت

اگر مارا پڑا دل ہاتھ سے غمزے کے کیا غم ہے
سپاہی کی یہی معراج ہے رن بیچ سر دیوے

نازو استغنا، عتاب، اعراض سب جانتا ہیں　　　قرب میں خوباں کے کیا معنی کہ ہو دل کو نشاط

محبت کی قلمرو میں اگر جاوے تو سن لے گا　　　کوئی آرے تلے چیرا کسی کو کوہ پر پٹکا

بہار کے مندرجہ بالا اشعار سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کو بغیر تصنع و تکلف کے نہایت سادگی اور بے ساختگی سے نظم کر جاتے ہیں۔ زبان و بیان کی سادگی اور بے تکلفی قدما کی سی ہے۔ ان کے اشعار میں تشبیہات و استعارات کا استعمال بہت ہی کم ملتا ہے مگر پھر بھی کلام دلچسپ اور موثر ہے۔ اس میں وہی سوز و گداز اور زور و تاثیر ہے جو اس دور کے دوسرے شعرا کا طرۂ امتیاز ہے۔ جذبات کی پاکیزگی، تغزل کی شیرینی اور معنی آفرینی اس دور کے خصائص ہیں۔ بیشتر اشعار واردات عشقیہ اور جذبات قلبیہ کی تصویریں ہیں۔ بعض اشعار کا لہجہ دکنی ہے۔ ان کے کلام میں جیو نے بیتی اور جیوں وغیرہ ایسے الفاظ ملتے ہیں جو بعد میں متروک ہو گئے۔

بہار کی کوششیں شاعری سے زیادہ علمی اور لسانی مسائل کی چھان بین اور تحقیق و تدقیق میں صرف ہوتی تھیں۔ چونکہ ان کی طبیعت کو شاعری سے فطری مناسبت تھی اس لئے جو کچھ کہا شوق و ذوق سے کہا۔ انھیں اپنی نثری تصنیفات خصوصاً لغاتِ بہارِ عجم کی بنا پر جتنی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اتنی شاعری کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ جس طرح مولانا شبلی کی نثری خدمات کی آب و تاب نے ان کی شاعری کی چمک کو ماند کر دیا اسی طرح ٹیک چند کی لسانی خدمتوں کے آگے ان کی شاعری تابناک نہ ہو سکی۔ پھر بھی آپ کا پایہ اپنے ہمعصر شعرا میں بہت بلند ہے۔

۲- آفتاب رائے رسوا دہلوی

(وفات ۱۷۴۷ء)

منشی آفتاب رائے رسوا کایستھ تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے رسوا کو جوہری بچہ لکھا ہے۔ انھیں ذرا سی غلط فہمی ہوئی ہے۔ جوہری سکسینہ کایستھوں کی ایک شاخ ہے۔ یہ شخص کوچہ گرد اور بیاباں نورد تھا۔ دائم الخمر تھا۔ ایک دم بغیر شغل شراب کے نہیں رہتا تھا۔ کسی مذہب یا پنتھ کے بندھن میں نہ تھا۔ ہمیشہ لنگ باندھے اور شراب کی صراحی ہاتھ میں لئے ہوئے بازار میں غزلیں پڑھتا ہوا پھرا کرتا تھا۔ عنفوانِ شباب میں محمد شاہ کے عہد میں (۱۷۴۷ء) میں ایک جوہری بچہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ "کہتے ہیں کہ اس نے وصیت کی تھی کہ میری لاش کو شراب سے غسل دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کے کفن پر بھی شراب چھڑکی گئی مگر جنازہ اٹھاتے وقت کسی کو شراب کی بو کا احساس بھی نہ ہوا!" یہ واقعہ تذکرہ شعرائے ہنود مؤلفہ بشاش میں صفحہ ۴۷ پر درج ہے۔

میر تقی میر نے نکات الشعرا[۱] میں رسوا کے متعلق یہ لکھا ہے:

"شخصے بود ہندو۔ حالا قید مذہب نداشت۔ پیش ازیں در توپ خانہ نوکری کرد۔ ازچندے ترک روزگار گرفتہ آوارہ دشت گمراہی شدہ۔ اکثر کہ در اثنائے راہ دیدہ شدہ است۔۔۔۔ عریانی را لباس خود مقرر کردہ می گشت۔ آخر در پے برہنگی جامہ گذاشت۔"

۱- نکات الشعراء ص ۱۶۹

میر حسن تذکرہ شعرائے اردو[۱] میں رسوا کی نسبت یہ لکھتے ہیں:

"از چندے ترک از نمودہ بریک پسر کمبوہ منو نام تعشق پیدا کردہ بود۔ زبانش بہ لفظ میاں بسیار آشنا بود۔ باہر کہ سخن میگفت "میاں" میگفت و میگریست۔ کلامش از خالی درد نیست۔ عریاں میگشت۔ آخر بہماں حالت مرد۔۔۔۔ نقل است کہ روزے معشوق او در سن درگزدنش انداختہ میگشت۔ ناگاہ شخصے دیگر بنظرش رسید۔ او را ہم از ناز محبوبانہ درآں گرفتاری شامل گرداند۔ درآں وقت رسوا چہ مناسب حال ایں شعر برخواند۔۔۔

دیگرے را در گرفتاری شریک ما مکن

مدعا گر شہرت حسن است یک رسوا بس است"

تذکرۂ ہندی[۲] میں مصحفی نے زبان فارسی میں ایک تحریر نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک لڑکے کو محلہ احمد نگر واقع بیرون شہر دہلی شراب لانے کے لئے بھیجا گیا۔ جب اس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو رسوا سے کہا گیا آؤ تب تک باغ کی سیر کریں۔ رسوا نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

لڑکا گیا شراب کو کاہے کی سیر ہو

ہم گذرے اس شراب سے لڑکے کی خیر ہو

محمد سلیم صدیقی (لکھنؤ یونیورسٹی) رسوا کے متعلق فرماتے ہیں:[۳]

"منشی آفتاب رائے رسوا دہلوی اسم باسمٰی صوفی منش تھے۔

۱۔ تذکرہ شعرائے اردو صہ ۱۰۲ ۲۔ تذکرۂ ہندی صہ ۱۰۰ ۳۔ الہ آباد یونیورسٹی ایسوسی ایشن میگزین ۲۹-۱۹۲۸ء صفحہ ۹

ان کو اگر ہندوستان کا خیام کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔۔۔ان کا کلام شراب کی مدح وستائش سے بھرا پڑا ہے۔ ایک ایک شعر عمر خیام کے کلام کی یاد تازہ کردیتا ہے۔"

لطافتِ کیف ومستی اور ندرتِ تشبیہہ واستعارہ کے لئے رسوا کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

مست ہو کر گر پڑے ہیں ہر طرف دیوار و در
ابرِ رحمت ہے برستا یا برستی ہے شراب

کیف ومستی کے چند اور حسین مرقعے ملاحظہ ہوں:

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے — ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے
ایام جوانی ہو نشہ ہو سر جو ہو — یہ سب ہو یہ جاناں مری آغوش میں تو ہو
ہے زندگی کا لطف تب اے خضر خوش اوقات — جب ہاتھ میں ساغر ہو صراحی ہو سبو ہو

اپنے دل کی بے قراری واضطرار کا حال رسوا یوں بیان کرتے ہیں:

وصل میں بے خود رہے اور ہجر میں بیتاب ہو — اس دوانے دل کو رسوا کس طرح سمجھائیے
ایسے ظالم سے محبت کی ہے کیا پاؤں گا — یوں نظر آتا ہے مجھ کو رہی بدمر جاؤں گا

اپنی رسوائی اور طرز زندگی سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

رسوا ہوا خراب ہوا دربدر ہوا — اس عاشقی کے نیتجے میں جس کا گذر ہوا
میرے مدفن پہ یار دیہ لکھانا — کسو سے کوئی دل کو مت لگانا[1]

فرقتِ محبوب میں اپنی اشک افشانی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

---

[1] مجموعۂ نغز از حکیم قدرت اللہ خاں قاسم صفحہ ۲۸۶ (اس تذکرہ میں رسوا کے تین شعر درج ہیں)

کوئی جا نہیں زمیں پہ کہ اشکوں سے نم نہیں　　رسوا ابھی اس زمانے میں مجنوں سے کم نہیں

فرقتِ محبوب میں رسوا کے چند اور درد بھرے شعر ملاحظہ ہوں:

نہ جا تو عیش میں کچھ عمر اپنی صرف کرتا ہوں　　جو کچھ باقی ہیں دن میرے انھیں رو رو کے بھرتا ہوں

رو رو کے چشمِ ہجر میں بے نور ہو گئیں　　جاری ہیں اشک ہائے کیا ناسور ہو گئیں

آرام تو کہاں کہ ٹک ایک سو کے چپ رہیں　　آنسو بھی نہیں رہے کہ بھلا رو کے چپ رہیں

نشتر مجھے نہ مار دو قاتل کا منھ دکھاؤ　　فصاد کیا کرے گا جلاد کو بلاؤ

اشک رہتے ہیں بھرے دیدۂ گریاں کے بیچ　　آنکھ لاگی ہے مگر چاہِ زنخداں کے بیچ

اپنی معذوری اور بیکسی کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

قفس سے چھٹ گئے ہم اور چمن میں جا نہیں　　اڑیں تو پر نہیں رکھتے چلیں تو پائے نہیں

اپنا ٹھکانہ رسوا یوں بتاتے ہیں:

جو کوئی چاہے کہ اس کو جستجو کر لائیے　　یار کے کوچہ میں یا صحرا میں رسوا پائیے

معشوق کی بے مروتی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

رسوا کو کہا دیکھ کے کل شوخ نے گستاخ　　چل دور ہو فی النار ہو کافور ہو چھو ہو

سوز و گداز سے مملو رسوا کا ایک واسوخت جو مولوی جامی کی غزل پر ہے

ملاحظہ ہو:

مجنوں نہیں کہ جا کے میں صحرا کو سر کروں　　فرہاد نہیں کہ کوہ کو زیر و زبر کروں

تیری گلی میں آکے کدھی کو گذر کروں　　اک عاشقِ نحیف ہوں تجھ کو خبر کروں

اے ترک شوخ ایں ہمہ ناز و عتاب چیست

با دل شکستہ گاں ستم بے حساب چیست

مرجاؤں گا تغافلی سے مت دے گالیاں   آگے تو جانتا نہ تھا اب کن سکھالیاں
پلکھیاں ہیں تیری نشتریں جب سامنے کیاں   لایا چھری ذبح کو مرے کیوں تو لے میاں

خنجر کشیدہ در پے قتلم شتاب چیست
خود گشتہ ام ہلاک تیرا اضطراب چیست

کہتے ہیں شیخ یوں کہ تو اسلام کر قبول   اور برہمن یوں کہتے بتوں کے تئیں نہ بھول
رہتا ہوں روز و شب میں اسی فکر میں ملول   کس کا کہا میں مانوں اور کس کا کروں عدول

از کوئے تو بہ کعبہ روم یا بہ بت کدہ
اے پیر رہ بگو کہ طریق ثواب چیست

رو رو کے روز کاٹوں ہوں میں تجھ بنا لے یار   اور شب تمام جاگ کے گھڑیاں کروں شمار
ہر چند اپنا حال کیا تجھ کو آشکار   تو بے رحم نہ آیا مجھے دے کے انتظار

گفتی شبے بہ خواب تو آییم وے چہ سود
ما خود در عمر خویش ندانم کہ خواب چیست

یہ واسوخت رسوا کی زندگی کا سچا مرقع ہے۔ مندرجہ بالا چند شعر مختلف تذکروں میں بکھرے ہوئے پائے گئے۔ راقم الحروف نے انھیں یکجا کر دیا ہے۔ ان چند اشعار سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص نے جذبات اور واردات کے بیان میں کیسی کیسی جگر کاویاں کی ہیں۔ رسوا ایک فطری شاعر تھا۔ اس کے ہر شعر میں تاثیر و خلوص کی کارفرمائی ہے۔ رسوا کا دیوان نایاب ہے۔

رسوا کا کلام کیف و سرمستی کا چھلکتا ہوا جام اور درد و سوز کا مرقع ہے۔ زبان کی سادگی اور بیان کی بے تکلفی کے ساتھ تشبیہہ و استعارہ کی ندرت پائی جاتی ہے۔

رسوا اپنے قلبی واردات اور عشقیہ جذبات کو ادا کرنے میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کا کلام ان کی زندگی کے سچے واقعات اور قلبی احساسات کا مرقع ہے۔

۳۔ رائے آنند رام مخلصؔ دہلوی

(وفات ۱۷۵۰ء)

رائے آنند رام مخلصؔ نواب اعتماد الدولہ وزیر محمد شاہ بادشاہ کے وکیل تھے۔ ذات کے کھتری تھے۔ دہلی کے نامی گرامی رؤسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ بڑے جید عالم تھے۔ فارسی میں ملکہ کامل حاصل تھا۔ بیشتر فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ صاحب دیوان تھے اور اساتذہ میں شمار تھا۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ اور مرزا بیدلؔ کے شاگرد تھے۔ ۱۷۵۰ء میں وفات پائی۔

میر حسن تذکرۂ شعرائے اردو میں مخلصؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مخلصؔ از شاعران فارسی است۔ شاگرد مرزا بیدلؔ وکیل نواب اعتماد الدولہ در آخر سن شعر خود را پیش خان آرزو می نمود۔ احوال او در تذکرہ خان مذکور مسطور است۔ گاہے گاہے بندرت شعر ریختہ می گفت۔ از آزار ضیق النفس در گذشت از دست"[۱]

دھوم آنے کی کس کے گلزار میں پڑی ہے
ہاتھ ارگجی کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے

یوں پکارے ہے کھڑا گلشن میں سرواز بیکسی
پہنچیو قمری کہ کیا آزاد جاتی ہے بہار

---

[۱] تذکرہ شعرائے اردو مولفہ میر حسن صفحہ ۱۶۹

پھول پر گلشن کے گویا دانۂ شبنم نہیں ۔۔۔ عاشقوں کے حال پر انسواں بہاتی ہے بہار

مخلص کا مندرجہ ذیل شعر جو تذکرۂ شعرائے ہنود[1] مولفہ دیبی پرشاد بشاش

سے ملا ہے، مضمون آفرینی، جدت ادا اور محاورہ بندی کے لحاظ سے داد طلب ہے۔

آتا ہے ہر سحر اٹھ تیری برابری کو ۔۔۔ کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

مخلص کا کلام نایاب ہے۔ بقول جگر بریلوی "شاعری میں جو کچھ کاوشیں کیں سب رائیگاں گئیں۔ بس دو چار شعر تذکروں میں اس طرح باقی ہیں جس طرح پرانے گورستانوں میں کسی تربت پر کتبے مل جاتے ہیں۔"

مخلص کے اشعار تصنع و بناوٹ سے پاک ہیں۔ ان میں سادگی اور سلاست کے ساتھ معنی آفرینی پائی جاتی ہے۔ جذبات عاشقانہ ہیں۔

۴۔ مہاراجہ رام نرائن موزوں عظیم آبادی

(وفات ۱۷۶۳ء)

مہاراجہ رام نرائن موزوں دیوان رنگ لال کے بیٹے تھے۔ نواب سراج الدولہ اور نواب قاسم خاں کے عہد میں حاکم صوبۂ بہار اور صوبہ دار پٹنہ تھے۔ عظیم آباد کے رئیس اعظم تھے۔ شیخ علی حزیں سے تلمذ تھا۔

---

[1] مولانا آزاد نے آب حیات صفحہ ۱۲۳ میں اس شعر کو مخلص کے استاد سراج الدین علی خاں آرزو کے کلام میں شامل کیا ہے۔ اس غزل کا دوسرا شعر آزاد نے یہ درج کیا ہے:

اس تند خو صنم سے جب سے لگا ہوں ملنے ۔۔۔ ہر کوئی مانتا ہے مری دلاوری کو

میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو[1] میں موزوں کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے:

"صاحب دیوان فارسی۔ بسیار خوش گو، آشنا پرست وسپاہ دوست بود۔ شعر ریختہ کم گفتہ بلکہ نگفتہ مگر در وقتیکہ خبر شہید شدن سراج الدولہ در شہر افتاد ہمانوقت فی البدیہہ ایں شعر می خواند داز خبر داران خبر می پرسید ومیگریست۔ ہمیں شعر ازو بیاد گار ماند:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی　　دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری"

کتاب "بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا"[2] میں موزوں کے تاریخی حالات زندگی بہت تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اس سے ان کے کچھ ضروری حالات زندگی اخذ کرکے یہاں بھی لکھے جا رہے ہیں۔

موزوں ذات کے کایستھ سریواستو تھے۔ ان کا آبائی وطن موضع کشن پور ضلع سہسرام تھا۔ مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد صوبۂ بہار کے ناظم ہو گئے تھے اور عظیم آباد و بہار پر فرمانروائی کرتے تھے۔ ان کی صوبہ داری ۱۷۵۲ء سے ۱۷۶۳ء تک رہی۔ لالہ جانکی رام نائب صوبہ دار عظیم آباد کے مرنے کے بعد مہابت جنگ نے ان کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا۔ نواب مذکور کے مرنے کے بعد ان کا نواسہ سراج الدولہ حکمراں صوبۂ بنگال، بہار و اڑیسہ ہوا۔ نواب سراج الدولہ کے مختصر عہد (۱۷۵۶ء - ۱۷۵۷ء) میں دربار اور قلمرو کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو ص۱۵۱ - [2] بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا ص۲۲ لغایت ص۲۳۵ از اختر اورینوی۔

طرف تعیش، افترا پردازی اور سازشوں کا بازار گرم تھا۔ کلایو صوبۂ بنگال، بہار اور سلطنت دہلی پر قبضہ کرنے کی تاک میں لگا ہوا تھا۔

میر جعفر فوج کی بخشی گیری سے نکال دیئے جانے کے باعث نواب سراج الدولہ سے ناراض تھا اور دوسرے اہل اقتدار بھی سراج الدولہ سے بیزار تھے۔ کلایو موقع پاکر مختصر سی فوج لے کر پلاسی آیا۔ نواب کے لشکر کے مقابلہ میں اس کے مخالفوں کا گروہ بہت ہی حقیر تھا لیکن نواب کی فوج اور عہدہ دار میر جعفر کی سازش میں تھے۔ اس لئے ۲۳ رجون ۱۷۵۷ء کو کلایو نہایت آسانی سے کامیاب ہوا۔

سراج الدولہ پلاسی سے نکل کر عظیم آباد کی طرف روانہ ہوا۔ راہ میں ایک مکار پیر دانا شاہ نے اسے مہمان رکھا اور پھر دغا دے کر اسے میر جعفر کے داماد میر قاسم کے حوالہ کر دیا۔ میر قاسم نے نواب کو میرن پسر میر جعفر کے پاس مرشد آباد بھجوا دیا جہاں سراج الدولہ بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد جلد ہی انگریزی فوج عظیم آباد میں متعین کر دی گئی جس سے راجہ رام نرائن سراج الدولہ کی بالکل مدد نہ کر سکے۔

بنگال میں میر جعفر کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد رام نرائن اور دوسرے امرا و رؤسا سراج الدولہ کے خون کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر حالات اتنے غیر یقینی تھے کہ راجہ موصوف نے کوئی کارروائی کرنا مناسب نہ سمجھا۔

میر قاسم جب بنگال کا نواب ہوا تو اس نے راجہ رام نرائن سے صوبہ کے محاصل کی حساب طلبی شروع کی۔ بعض خیانتوں کا پتہ چلا۔ راجہ صاحب قید کر دیئے گئے۔ سات لاکھ روپئے اور جنس گھر سے برآمد ہوئی۔ راجہ شتاب رائے بھی لپیٹ

میں آ گئے۔

انگریزوں سے سخت لڑائی ہو جانے اور پیچیدگی و سازش بڑھ جانے سے میر قاسم مونگیر سے عظیم آباد کی طرف فرار ہوا جا رہا تھا۔ اس لئے باڑھ کے قریب پہنچ کر محبوسین کو غرق دریا یا قتل کر دیا گیا۔ راجہ رام نرائن کے گلے میں ریت سے بھرا گھڑا باندھ کر انھیں گنگا میں ڈبو دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۳ء میں گذرا۔

موزوںؔ فارسی میں خوب کہتے تھے۔ ان کا مطبوعہ دیوان فارسی میں موجود ہے۔ شیخ علی حزیںؔ کے شاگرد تھے۔ راجہ صاحب ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ موزوںؔ ریختہ بھی صفائی سے کہتے تھے۔ لیکن اردو زبان میں انھوں نے بہت کم شعر کہے ہیں۔

مختلف تذکروں سے تلاش کرنے پر موزوںؔ کے محض چار شعر مل سکے ہیں جو نیچے درج کئے جاتے ہیں:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی	دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری
	(تذکرۂ میر حسن ص۱۶۲)
کچھ گرانی نہیں مجھ کو وہ ستم گار کے ساتھ	دل گھل چوہی پڑا اشک سبکسار کے ساتھ
	(چمنستان شعرا ص۲۹۱)
بھولی نہیں ہے مجھ کو بتوں کی ادا ہنوز	دل کے نگیں پہ نقش ہے نام خدا ہنوز
	(تاریخ شعرائے بہار ص۶۰)
ابر ہوگا تو خجالت سیتی پانی پانی [۱]	مت مقابل ہو میرے دیدۂ خونبار کے ساتھ
	(تذکرۂ گلزار ابراہیمی)

۱۔ تاریخ شعرائے بہار (دلی) میں یہ شعر یوں درج ہے:

ابر تو خود ہی خجالت سے ہے پانی پانی	کب مقابل ہو میرے دیدۂ خونبار کے ساتھ

۵۔ سیتا رام عمدہ (سکونت الہ آباد)

سیتا رام عمدہ کشمیری برہمن تھے۔ ان کے والد کا نام زندہ رام تھا جو فارسی کے ایک اعلیٰ شاعر تھے اور مولاؔ تخلص فرماتے تھے۔ ان کا زمانہ ۱۷۵۳ء متصور ہے۔ سیتا رام کے ایک بھائی کا نام دیا رام تھا، یہ بھی شاعر تھے اور قرّاؔ تخلص فرماتے تھے۔ دوسرے بھائی کا نام ٹیکا رام تھا اور تخلص ظفرؔ تھا۔ سیتا رام عمدہ مولاؔ کے تیسرے صاحبزادے تھے۔ جب مولاؔ دہلی سے مع فرزندوں کے الہ آباد کسی بڑے منصب پہ مامور ہو کر آئے، عمدہ پچیس سال کی عمر میں اس دنیا سے اٹھ گئے۔ اس حادثۂ غم و الم سے مولاؔ بھی زیادہ دن نہ جی سکے اور چھ مہینے کے بعد انتقال کر گئے۔ عمدہ کے دیوان فارسی کو جو دس ہزار بیت سے کم نہ تھا خود مولاؔ نے ان کی وفات کے بعد مرتب کیا اور بہت سا کلام اپنے لکھے ہوئے تذکرہ "گلزار مضامین" میں نقل کیا۔ عمدہ کا بیشتر کلام فارسی میں ہے۔ اردو میں بھی ان کا کافی کلام دستیاب ہوا ہے۔ عمدہ کو انعام اللہ خاں یقین سے عقیدت تھی اور انھوں نے انھیں کو اپنا کلام دکھایا۔ عمدہ کا تمام خاندان مسلمان امرا کی فیض رسانیوں سے مالا مال رہا۔ عمدہ کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ وہ اپنے شاعرانہ کمالات سے بہت بلند مرتبہ کے حامل ہوتے۔

نمونۂ کلام[۲]

تو نے ہمارے دل کو ستایا تمام عمر — کرتا ہے کوئی کسو سیتی اتی برائیاں

۱؎ عمدہ کے خاندان کے مفصل حالات کے لیے تذکرۂ بہارِ گلشنِ کشمیر جلد دوم ص ۶۵۱ لغایت ص ۶۵۶ ملاحظہ ہو اور ان کے فارسی کلام کا نمونہ ص ۵۴۰ پر ملاحظہ ہو۔ ۲؎ حاشیہ صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ ہو۔

گلی کی یار تک چلتے اسے آزار پہونچے گا
کہاں دارالشفا تک یہ دل بیمار پہونچے گا

میرے تابوت پر حاجت نہیں پھولوں کی چادر کی
کہ میری نعش پر وہ سر گل رخسار پہونچے گا

کہے گا یار سے اے دل غم اپنا تو تو گیا ہوگا
دکھ اپنا شمع سے کہہ کہہ کے پروانے نے کیا پایا

کسی کے سینے میں ہرگز مرا سا داغ نہ تھا
مرے چراغ سا روشن کوئی چراغ نہ تھا

چمن میں کھینچ کے لائے ہیں گل رخاں مجھ کو
وگرنہ سیرِ چمن کا مجھے دماغ نہ تھا

ممکن نہیں کہ جائیں ہم ان گل رخاں کو چھوڑ
جاتی ہیں بلبلیں بھی کبھی گلستاں کو چھوڑ

مرنے کے وقت یار نے مجھ سے کہی یہ بات
اے عمدہ تو چلا ہے کدھر اس جہاں کو چھوڑ

حکم کیا ہے اسے راتوں کو ترے کوچہ میں
دل مرا نالہ و فریاد کرے یا نہ کرے

عمدہ اب تو ہم اسے یاد بہت کرتے ہیں
یاد ہم کو وہ پری زاد کرے یا نہ کرے

یہ تو ٹوٹے سخن سخت سے وہ پتھر ہے
میرے دل کی کہاں نازکی ہے مینا میں

اس نے نہیں کبھو کیا ہم سے برائیاں
مر جائیے جو یار کرے بے وفائیاں

صیاد کے تو ہاتھ کہاں تک نہ آئے گی
بلبل قفس سے کب تلک اب دل چھپائے گی

رباعیات

ناحق تو بتوں سے آشنا ہوتا ہے
کیوں درد و بلا میں مبتلا ہوتا ہے
مطلق نہ مروت ہے انھوں میں نہ وفا
مجھ سے بھی عبث دل تو جدا ہوتا ہے

ناصح کا یہی کام ہے تدبیر کرے
جو ہووے دوانا اسے زنجیر کرے
اس میں وہ جئے یا مرے لازم ہے اسے
تدبیر کے کرنے میں نہ تقصیر کرے

۲؎ (حاشیہ صفحہ ۷۹ کا) چمنستان شعرا ص۳۵ لغایت ص۳۸ اور تذکرہ ریختہ گویاں مولفہ سید فتح علی حسینی گردیزی ص۱۰۶ لغایت ص۱۰۹

رہتا ہوں خوشی اپنی جانِ محزوں سیتی　　رکھتا ہوں اختلاط ہاموں سیتی

جس طرح بھرا میرے جنوں سے صحرا　　کب دشت تھا آباد مجنوں سیتی

عمدہ کا کلام محض عاشقانہ جذبات پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی فلسفیانہ تخیل یا صوفیانہ مضمون نہیں ہے۔ عمدہ اپنے اشعار کو لطیف تشبیہات و استعارات کے استعمال سے پرتاثیر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ عاشقانہ جذبات، سوز و گداز اور مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں زبان کی سادگی، بیان کی سلاست اور بندش کی چستی و برجستگی پائی جاتی ہے۔

اس دور کے دیگر شعرا کی طرح عمدہ کے کلام میں بھی کسو، سیتی، اتی وغیرہ ایسے الفاظ کا استعمال پایا جاتا ہے جو بعد میں متروک ہو گئے۔

دورِ اوّل کے اوصاف و خصائص

ولیؔ کے کلام میں دکنی الفاظ، محاورات اور ہندی الفاظ کی کثرت تھی۔ اس دور کے دہلی شعرا کو دکنی اور ہندی الفاظ ناخوشگوار اور غیر فصیح معلوم ہوئے اس لیے انھوں نے ان کی جگہ فارسی اور عربی کے خوشگوار الفاظ، دلکش ترکیبیں اور خوشنما محاورے اپنے کلام میں داخل کر کے اردو زبان کو صاف اور شستہ بنانے کی کوشش کی۔ حاتمؔ اور مظہرؔ اس دور کے سب سے بڑے مصلح زبان تھے۔ حاتم نے ثقیل ہندی الفاظ اور عیوب قافیہ کو رفع کرنے کی بڑی کوشش کی مکروہ اور بھدے الفاظ اور

محاورات کا اخراج اور اصلاح زبان کا جو کام اس دور میں شروع ہوا وہ میرؔ اور سوداؔ کے زمانہ میں بڑے جوش سے جاری رہا اور اس کی آخری تکمیل شیخ ناسخؔ کے ذریعہ ہوئی۔

اصلاح زبان کے اسی رجحان سے متاثر ہو کر ہندو شعرا میں ٹیک چند بہارؔ دہلوی نے ہندی کے ثقیل الفاظ کی جگہ فارسی اور عربی کے خوشگوار الفاظ اور تراشیدہ ترکیبوں کے استعمال سے اردو زبان کو صاف اور شستہ بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں ہندی کے ثقیل الفاظ کے استعمال سے بہت گریز کیا۔ ان کا کلام اپنے عہد کے مسلم شعرا کے کلام سے صفائی اور شستگی میں کسی حالت میں کم نہیں ہے۔

ولیؔ کے کلام میں جو ہندی یا دکنی الفاظ تھے انھیں ان لوگوں نے استعمال کرنے سے گریز کیا مگر پھر بھی کچھ نرم اور مروج الفاظ مثلاً موہن، سانورے، سجن بمعنی معشوق، پنتھ بمعنی راستہ، رن بمعنی جنگ، اچرج بمعنی تعجب، جگ بمعنی دنیا، نین بمعنی چشم اور چند دکنی الفاظ جیسے کوں، سیتی، سوں، اتی اور کسو وغیرہ کا استعمال جاری رکھا۔

اس دور کی ایک اہم خصوصیت تصوف اور روحانیت کی چاشنی ہے جو تقریباً ہر شاعر کے کلام میں تھوڑی بہت پائی جاتی ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ بہت سے اردو شعرا صوفیائے کرام یا ان کے نظریوں سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور ان کے متوسلین میں سے تھے۔ ان میں سے بعض مثلاً مظہرؔ جانجاناں اچھے خاصے صوفی تھے۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ فارسی شاعری کا اثر اردو کی رگ و پے میں تیزی سے سرایت کر رہا تھا اور عنصر تصوف کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ہندو شعرا نے بھی اس وصف کو اپنایا اور تصوف کے مسائل اس خوبی سے نظم کیے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ

یہ اشعار ہندوؤں کے کہے ہوئے ہیں۔ مثلاً ٹیک چند بہار کے مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہوں:

اسی درگاہ سے حاجت روا ہوتی ہے عالم کی — جہاں دیتے ہیں بن مانگے فضولی ہے طلب لالا

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس — یہ عجب منظر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

ہمیں واعظ ڈراتا کیوں ہے دوزخ کے عذابوں سے — معاصی گو ہمارے بیش ہوں کیا مغفرت کم ہے

ان اشعار سے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس دور کے اکثر مسلم شعرا ایہام گوئی یعنی ذو معنی شعر کہنے کے بہت دلدادہ تھے۔ چنانچہ آبرو، یکرنگ، ناجی اور حاتم وغیرہ نے اس رنگ کو خوب برتا۔ مثلاً

اس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال — یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں یکرنگ

جب سنا موتی نے تجھ دنداں کے موتی کا بہا — آب میں شرمندگی سوں ڈوب جوں پانی بہا حاتم

صبا کہیو اگر جاوے ہے تو اس شوخ دلبر سوں — کہ کر کر قول پرسوں کا گیا برسوں ہمیں برسوں احسن

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوشخط کی زلف — ہم تو کافر ہوں اگر بندہ نہ ہوں اس لام کے ایضاً

گندمی چہرہ کو اپنے زلف میں پنہاں نہ کر — ہندواں سن کر مبادا شور ڈالیں کال کا ناجی

جہاں اس خو کی گرمی تھی نہ تھی واں آگ کی عزت — مقابل اس کے ہو جاتی تو آتش لکڑیاں کھاتی آبرو

چونکہ اس دور کے یہ شعرا سیدھی سادی بات کو ذو معنی بنانے کی فکر میں لطف و اثر کو ہاتھ سے کھو دیتے تھے، اس لئے دوسرے دور کے شعرا سودا اور میر وغیرہ کو یہ رنگ پسند نہ آیا[1]۔ چنانچہ سودا لکھتے ہیں:

یکرنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی — منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

---

[1] سودا اور میر کے زمانے میں ایہام گوئی پر اردو شعرا نے کوئی خاص توجہ نہیں فرمائی اور انشا و مصحفی کے عہد میں یہ رنگ قریب قریب بالکل خارج ہو گیا۔ بحوالہ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ ص۶۳

میر فرماتے ہیں:

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

جبکہ اس عہد کے اکثر مسلم شعرا ایہام گوئی کے بہت دلدادہ تھے، ہندو شعرا اس سے الگ تھلگ رہے، حالانکہ سنسکرت اور ہندی کی شاعری میں اس کا بہت رواج تھا اور اگر وہ اس رنگ میں اتر آتے تو نہ جانے کیا کیا گل کھلاتے، مگر زمانے کی رفتار اور مستقبل کے رجحان کے وہ سب نباض تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ وصف عیب میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس لئے انھوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

اس دور کے شعرا بھی رعایت لفظی کے بہت شائق تھے۔ اسی سے وہ اپنے اشعار کو سجاتے تھے اور داد پاتے تھے لیکن اس کی لے کچھ اتنی بڑھی اور اس صنعت کی اتنی بہتات ہوئی کہ لطف واثر مفقود ہو گیا۔ مثلاً

آبرو گانٹھ کاٹی ہے مرے دل کی تری آنکھاں نے دو پلک نہیں کترنی ہے مگر چور دوں کی

لب شیریں پہ سر بجن کے نہیں خط سیاہ ڈار چھوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی

ناجی رنگ تیرا گندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں اپنے خورد و خواب

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں عارضی میری زندگانی ہے

ہندو شعرا کے کلام میں بھی رعایت لفظی کا وجود ملتا ہے لیکن انھوں نے اس صنعت کے برتنے میں فن کاری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بلکہ اسے سلیقہ سے برت کر اپنے اشعار میں حسن پیدا کیا ہے مثلاً

بہار وہی اک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں

مخلص یوں پکارے ہے کھڑا گلشن میں سرو ازکیسی پھر کو قمری کہ کیا آزاد جاتی ہے بہار

گلی تک یار کی چلتے اسے آزار پہونچے گا　　کہاں دارالشفا تک یہ دلِ بیمار پہونچے گا ؏ دَرد

۶　　اس دور کے شعرا کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت کلام کی ناہمواری ہے یعنی ان کے بعض شعر بہت اچھے ہیں اور بعض نہایت پست اور مبتذل ہیں جسے کسی بھی حیثیت سے مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ ابتدائی دور میں ذہن اور شعور کی پختگی نہیں ہوتی۔ اسی سبب سے یہ عیب کلام میں پایا جاتا ہے۔ میرؔ اور سوداؔ جو بعد کے شاعر ہیں اس عیب سے نہ بچ سکے۔ ہندو شعرا کے کلام میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔

۷　　ایہام گوئی اور رعایت لفظی سے بچ کر جہاں اس دور کے شعرا نے سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ شعر کہے وہاں بیحد لطف اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں　　ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جورِ باغباں

یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط　　رکھتا ہوں دو نین جو کہو تو نذر کروں

سانورے سب ایک سے ہیں ظلم کرنے میں بہار　　کم نہیں کچھ دل کے لے جانے میں کاکل چشم سے

کوئی جا نہیں زمیں پہ کہ اشکوں سے نم نہیں　　رسوا ابھی اس زمانے میں مجنوں سے کم نہیں

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے　　ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

ابر ہو گا تو خجالت سیتی پانی پانی　　مت مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ

کہے گا یار سے اے دل غم اپنا تو تو کیا ہوگا　　دکھ اپنا شمع سے کہہ کہہ کے پروانے نے کیا پایا

اس دور کی خصوصیت کے متعلق مولانا آزاد فرماتے ہیں[1] "ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں۔ جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے خیالات دل میں گذرتے ہیں، وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ ایچ پیچ کے خیال، دور دور کی تشبیہیں، نازک استعارے

---

[1] آب حیات ص۸۴

نہیں بولتے۔ اسی واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں ۔۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے محاورات قدیم اور مضمون بھی اکثر سبک اور مبتذل ہوں گے مگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی ایسی دل کو بھلی لگتی ہے جیسے ایک حسن خداداد ہو کہ اس کی خوبی ہزاروں بناؤ سنگار کا کام کر رہی ہے۔"

آزاد کا یہ قول اس دور کے ہندو شعرا کے کلام پر لفظ بلفظ صادق آتا ہے۔ یہ سب خوبیاں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

دور اوّل میں ہندو شعرا کی ادبی خدمات

اس عہد میں حاتم، آرزو، مضمون، یکرنگ اور فغاں وغیرہ قدیم مسلم شعرا کی ہم نوائی میں ہندو شعرا نے بھی دہلی میں اردو شاعری کی داغ بیل ڈالی اور اردو زبان وادب کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔ شمالی ہند میں انھیں بزرگوں کے ہاتھوں اردو شاعری کی بنیاد استوار ہوئی اور شعر و سخن کی جس شمع کو انھوں نے روشن کیا وہ نہ صرف برابر جلتی رہی بلکہ اس کی روشنی روز بروز بڑھتی چلی گئی۔

اس دور میں ٹیک چند بہار کی ادبی خدمت کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ انکی فارسی لغت "بہار عجم" بڑی قابل قدر اور مستند تصنیف ہے۔ اس کتاب میں فارسی الفاظ کے معانی کے ساتھ انھوں نے اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتایا ہے اور ہر موقع پر استادوں کے نادر اور لطیف اشعار بطور مثال لکھا ہے۔ انھوں نے فارسی اصطلاحات کو فارس کا سفر کرنے کے بعد جمع کیا ہے۔ ابطال ضرورت، جواہر الحروف، نوادر المصادر اور بہار بوستان وغیرہ ان کی دیگر اہم تصانیف علاوہ دیوان فارسی اور دیوان اردو

کے ہیں۔ آفتاب رائے رسوا کا کلام خمریات سے بھرا پڑا ہے۔ انھیں ہندوستان کا عمر خیام کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ انھوں نے اردو شاعری کے اس ابتدائی دور میں خمریات کے عنصر کا قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اس ابتدائی دور میں ان کے اشعار میں زبان کی جو صفائی اور فصاحت اور کلام کی پختگی و مشاقی ملتی ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ آنندرام مخلص بڑے جید عالم تھے اور ان کا اساتذہ میں شمار تھا۔ رام نرائن موزوں حاکم صوبہ بہار و صوبہ دار پٹنہ فارسی کے نامور شاعر اور اہل سخن کے بڑے سرپرست تھے۔ علاوہ دیگر شعرا کے خصوصاً شیخ علی حزیں ان کی نوازشات سے اکثر مستفید ہوتے رہے۔ شتاب رائے کی قدر و منزلت اور شفقت و محبت کی وجہ سے اشرف علی فغاں پٹنہ کے ہی ہو رہے اور وہیں ۱۷۷۲ء میں انتقال بھی کیا۔

لہ مہاراجہ شتاب رائے ناظم صوبۂ بہار اور ان کے بیٹے کلیان سنگھ عاشق بھی مہاراجہ رام نرائن موزوں کی طرح اردو شعرا کے بڑے قدردان اور مربی تھے۔ جس کی وجہ سے اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ میں عظیم آباد بھی اردو شاعری کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

چوتھا باب

دورِ دوم

(تقریباً ۱۷۵۰ء لغایت ۱۸۰۰ء)

میر اور سودا کا عہد

دورِ دوم کا سیاسی و سماجی ماحول

اس دور کے سیاسی ماحول میں انتشار اور اضطراب کے بہت زیادہ آثار ملتے ہیں۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ احمد شاہ ابدالی فارس کا بادشاہ ہوا۔ اس نے ۱۷۴۸ء سے ۱۷۶۱ء تک ہندوستان پر پانچ حملے کئے۔ اس کا تیسرا حملہ ۱۷۵۲ء میں ہوا جس میں اس نے کشمیر اور سرہند کے پورے صوبہ پر قبضہ کر لیا۔ جنوری ۱۷۵۷ء میں ابدالی نے چوتھی بار دہلی پر حملہ کیا۔ شہر لوٹا گیا، امرا اور باشندگانِ شہر سے چندے وصول کئے گئے۔ اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کے لئے بعضوں نے خودکشی کر لی اور متعدد لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ احمد شاہ دہلی شہر میں ایک ماہ تک رہا۔ اس نے اپنے لڑکے تیمور کی عالمگیر ثانی کی لڑکی سے شادی کر دی۔ وہ دہلی اور اودھ سے کئی کروڑ روپے کا مالِ غنیمت لے کر متھرا، برندابن، آگرہ اور بھرت پور کو لوٹتا ہوا کابل واپس گیا۔

احمد شاہ کے حملوں سے دہلی کے بادشاہ کی طاقت کمزور ہو گئی۔ اس بدامنی اور

انتشار کی حالت میں وزرا بھی سرکشی پر آمادہ ہو گئے حتیٰ کہ ۲۹ر نومبر ۱۷۵۹ء کو وزیر عماد الملک عالمگیر ثانی کو کوٹلہ فیروز شاہ ایک فقیر کی زیارت کو لے گیا اور وہاں اس نے اسے قتل کرا دیا[1]

عالمگیر ثانی ایک جانب احمد شاہ ابدالی کے پیہم حملوں اور اپنے وزرا کی سازشوں سے پریشان تھا اور دوسری جانب مرہٹوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ مرہٹوں نے ۱۷۵۷ء میں دہلی پر حملہ کیا اور پنجاب پر قبضہ کر کے وہاں سے ابدالی کے حکمرانوں کو مار بھگایا۔ اس طرح عالمگیر ثانی کے عہد میں مرہٹہ سلطنت کی وسعت دہلی اور لاہور تک ہو گئی۔

عالمگیر ثانی کی موت کے وقت شاہ عالم ثانی صوبہ بہار میں تھا۔ وہ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے خوف کے باعث ۱۷۵۹ء سے ۱۷۷۱ء تک مشرقی صوبوں میں رہا۔ شاہ عالم ثانی کا زمانہ (۱۷۵۹ء - ۱۸۰۶ء) مغلیہ سلطنت کی تباہی اور شاہی خاندان کی بربادی و بے عزتی کی نہایت دردناک کہانی ہے۔

۱۷۶۰ء میں مرہٹوں کو سزا دینے کے لئے احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر پانچویں بار حملہ کیا۔ مرہٹے ایک بہت بڑی فوج لے کر پانی پت کے میدان میں آ گئے۔ دونوں فوجیں دو ماہ تک آمنے سامنے خیمہ زن رہیں اور روزانہ چھوٹی موٹی لڑائی ہوتی رہی۔ آخر گھمسان کی جنگ ۱۴ر جنوری ۱۷۶۱ء کو صبح سے ۳ بجے شام تک ہوئی جس میں مرہٹوں کو شکست ہوئی اور ان کے سپہ سالاروں کے ساتھ بیشمار مرہٹہ سپاہی بھی قتل

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب مغل ایمپائر (MUGHAL EMPIRE) مصنفہ ڈاکٹر آشیر بادی لال سریواستو صفحہ ۳۳۴۔

ہوئے۔ اس کے بعد احمد شاہ اپنی تھکی ہوئی فوج کے ساتھ کابل واپس چلا گیا اور شمالی ہند میں انگریزوں کی فتوحات کے لئے میدان خالی چھوڑ گیا۔ اس شکست سے مرہٹہ سلطنت اور طاقت کو بہت بڑا دھکا لگا۔ جس سے راجپوتانہ، مالوہ اور دوآبہ میں مرہٹوں کی طاقت زائل ہو گئی اور اس کے ساتھ دکن میں حیدر علی کی طاقت کو عروج ہوا۔[1]

بادشاہ شاہ عالم ۱۷۷۱ء تک صوبۂ بہار اور الہ آباد ہی میں رہا۔ اس دوران میں نجیب الدولہ روہیلہ (۱۷۶۱ء۔۱۷۷۰ء تک) دہلی اور دہلی کی مختصر اور کمزور سلطنت کا نگراں اور حکمراں رہا۔ وہ جاٹوں اور سکھوں کے خلاف برابر جنگ کرتا رہا مگر ان میں سے کسی کی طاقت کو کچل نہ سکا۔ شاہ عالم دہلی نہ واپس جا سکا۔ کیونکہ اسے نجیب الدولہ سے عنان حکومت لینے کی ہمت و طاقت نہ تھی۔ ۱۷۷۱ء تک وہ انگریزوں کی پناہ میں الہ آباد کے قلعہ میں رہا۔

وزیر اعظم نجیب الدولہ کی وفات کے بعد اس کا قائمقام ضابطہ خاں لال قلعہ کے شاہی حرم میں داخل ہونے لگا اور شاہ عالم کی ہمشیرہ خیر النسا اور دیگر بیگمات کی بے حرمتی کرنے لگا۔ شاہی حرم کی عزت و حرمت کو خطرے میں پا کر شاہ عالم مرہٹوں کی امداد سے ۶ر جنوری ۱۷۷۲ء کو دہلی آیا۔ اس نے دہلی کے خزانے کو خالی اور شاہی خاندان کو مفلسی اور فاقہ کشی کی حالت میں پایا۔[2] مرہٹوں کو اس مدد کے صلہ میں شاہ عالم نے کڑا اور الہ آباد کے ضلع دے دیے۔

ستمبر ۱۷۸۷ء میں ضابطہ خاں کا لڑکا غلام قادر روہیلہ میر بخشی کے عہدہ پر ممتاز ہوا۔ وہ شاہ عالم کے خلاف ہو گیا۔ اس نے ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کو تخت سے

۱، ۲ ملاحظہ ہو کتاب مغل ایمپائر۔ مصنف ڈاکٹر آشیرباری لال سریواستو صفحہ ۴۴۳ اور صفحہ ۴۴۵۔

اتار دیا اور خنجر سے اس کی آنکھیں نکال لیں۔ شاہ عالم و نیز شاہی حرم کی بیگمات کی نہایت بے عزتی اور بے حرمتی کی اور محل پر قبضہ کر لیا۔ نابینا بادشاہ نے مہدجی سندھیا سے غلام قادر کو سزا دینے کی درخواست کی۔ چنانچہ مہدجی سندھیا کے حکم سے غلام قادر اور اس کا ساتھی نمک حرام خواجہ سرا منظور علی خاں دونوں ۲ مارچ ۱۷۸۹ء کو قتل کر دیئے گئے۔

ستمبر ۱۸۰۲ء میں لارڈ لیک نے مہدراؤ سندھیا کے وارث دولت راؤ سندھیا سے دہلی کا شہر چھین لیا۔ شاہ عالم اب برطانوی حکومت کا پنشن خوار بن گیا۔ اس نے ۱۸۰۶ء میں انتقال کیا۔

دورِ دوم کا ادبی ماحول

دورِ دوم اردو شاعری کا زریں عہد ہے جس میں اس کو بڑا عروج اور بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس دور کی تمہید میں مولانا آزاد یوں رقم طراز ہیں: "اس مشاعرہ میں ان صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے جن کی پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے۔ زبان اردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا ہے اور ایسا بنا دیا ہے جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان، حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوئے۔ اگرچہ بہت سے مرصع کار۔ مینا نگار پیچھے آئے مگر اس فخر کا نو لکھا ہار انھیں بزرگوں کے گلے میں رہا۔"[1]

---

[1] آبِ حیات ص ۱۲۹

یہ دور میر و سودا کا زمانہ کہلاتا ہے۔ میر و سودا اردو شاعری کے رکن رکین اور اساتذہ محترم مانے جاتے ہیں۔ میر و سودا کے ساتھ خواجہ میر درد اور میر حسن نے بھی اس دور کی نمایندگی کی۔ یہ لوگ اس دور کے اربع عناصر کہے جاتے ہیں۔ اس دور کے صفِ دوم کے مسلم شعرا میں جانجاناں مظہر، میر عبدالحی تاباں، سید محمد میر سوز اور قیام الدین قائم کا شمار ہوتا ہے۔

مرزا سودا اور میر تقی کے علاوہ انشا، زار اور فراق وغیرہ شاہ عالم کے دربار سے وابستہ تھے۔ شاہ عالم شعرا کے قدرداں اور مربی تھے۔ خود بھی شاعر تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ علاوہ فارسی کے ان کا ایک دیوان اردو میں بھی ہے۔

حالانکہ شاہ عالم شعرا کے بڑے قدردان تھے مگر ان کا خزانہ خالی تھا۔ وہ اردو شعرا کی خاطر خواہ سرپرستی کرنے سے معذور تھے۔ اس کے علاوہ افغانوں کے پیہم حملوں اور مرہٹوں کی آئے دن کی لوٹ مار سے دہلی تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ امن و سکون مفقود تھا۔ اس انتشار، تباہی و بربادی کا اثر محفل شعر و ادب پر بھی پڑا۔ چنانچہ دہلی کے اکثر نامور شعرا مثلاً سودا، میر، میر حسن اور سوز وغیرہ دلی کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے۔ صرف میر درد ایک ایسے قانع اور وطن پرست بزرگ تھے جنھوں نے دلی کو چھوڑنا گوارا نہیں گیا۔ لکھنؤ میں اس وقت آصف الدولہ کا زمانہ (۱۷۸۱ء۔۱۷۹۷ء) تھا۔ آصف الدولہ شاعروں کے بڑے قدردان تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ وہ سودا کو چھ ہزار سالانہ وظیفہ دیتے تھے۔ میر تقی میر کے لئے بھی بقول مولانا آزاد دو سو ۲۰۰ ماہوار مقرر کیا تھا جو ان کی زندگی تک ملتا رہا۔ آخر عمر میں میر تقی میر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

میر، سودا اور درد دنیائے شاعری میں اتنی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور ان کے کلام کے مطالعہ کا موقع ہر شخص کو اتنی بار مل چکا ہے کہ ان کے کلام کا نمونہ یہاں پیش کرنا تحصیل حاصل ہوگا۔

دور دوم کے ممتاز ہندو شعرا

اس دور کے ہندو شعرا میں لالہ بندرا بن راقم دہلوی، لالہ بال مکند حضور دہلوی، راجہ نول رائے وفا (قنوج)، مکند لال فدوی لاہوری، رائے سرب سنگھ دیوانہ لکھنوی اور لالہ لکھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے خاص شہرت حاصل کی جن کے حالات اور کلام پر کسی قدر تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس دور کے باقی ماندہ ہندو شعرا کی ایک فہرست اس باب کے آخر میں درج کر دی گئی ہے۔

۱۔ لالہ بندرا بن راقم دہلوی

میر حسن راقم کے متعلق لکھتے ہیں "بندرا بن راقم تخلص قوم کھتری بسیار بسیت قد بلند فکر است۔ از شاگردان مرزا محمد رفیع سودا سلمہ اللہ۔ در تضمین نمودن مخمس دست بہم رسانیدہ۔ بسیار بخوبی میگوید معلوم نیست کہ کجاست۔"[1]

میر تقی میر لکھتے ہیں "بندرا بن راقم تخلص از شاہجہاں است مشق شعراز مرزا رفیع میکند قبل ازیں با حقیر مشورت شعر میکرد۔ با بندہ مربوط و مضبوط

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۱۰۴

آشنا بود "۱۷

راقم دہلی کے رہنے والے اور کایستھ سکسینہ تھے۔ (میر حسن نے انھیں قوم کھتری لکھا ہے) یہ سودا اور مظہر کے شاگرد تھے۔ میر نے بھی ان کو اپنا شاگرد لکھا ہے۔ مگر آخر میں یہ سودا ہی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ نامی شاعر تھے۔ صاحبِ دیوان تھے۔ فنِ شعر کے ماہر تھے اور خوب کہتے تھے۔ ان کا دیوان شگفتہ اور پاکیزہ اشعار کا مجموعہ ہے۔

نمونۂ کلام

راقم کا مندرجہ ذیل قطعہ فصاحتِ زبان، سلاستِ کلام اور پیرایۂ بیان کے لحاظ سے بہت مشہور رہا:

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض
مجھ سے قسم ہے توڑوں اگر برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب
آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

ایک دوسرا مشہور قطعہ ملاحظہ ہو:

مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہے ابرو
یہ کہہ کے میں نے اس سے جب دل کی داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہووے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

معصیت میری بہت ہے یا کہ بخشش تیری بیش
اپنی رحمت پر نظر کر میرے عصیاں کو نہ دیکھ
کیا ہنسے ہے تو میرے سینۂ صد چاک کو گل
سرخرو لا کے تنک اپنے گریباں کو نہ دیکھ

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں
کہنے کو ہے یہ بات کہ مقدور ہی نہیں
کہتا تھا کون یہ کہ خوشی ہے جہاں کے بیچ
اس بات کا تو یاں کوئی مذکور ہی نہیں

---

۱۷ نکات الشعرا ص ۱۵۳۔ اس تذکرہ میں راقم کے چوبیس ۲۴ شعر ملتے ہیں۔

مری بدشرابیوں سے کریں توبہ میگساراں ۔ رہے وہ عمل کہ ہووے سبب نجاتِ یاراں
سنا کتنے حال میرا کہ جوں ابر وہ نہ رو دیا ۔ رکھے ہے مگر یہ قصہ اثرِ دعائے باراں

ہے زلف میں تیری جائے عاشق ۔ زنجیر ہے اور پائے عاشق
اے عشق مجھے کسی طرح مار ۔ تا یار کہے کہ ہائے عاشق

نہ تیرے عشق میں بلبل ہی کو نالاں دیکھا ۔ چاک ہر گل کا گلستاں میں گریباں دیکھا

کس کے گلے کے قطرۂ خوں ہیں تہِ زمیں ۔ جو تخمہ اگتے ہیں گلِ اور رنگ اب تلک

دیکھا نہ ہو جسے وہ کوئی سرزمیں نہیں ۔ پر تخمِ دل ہو سبز جہاں سو کہیں نہیں

اک وے بھی دن تھے یارب جو تھا ہمیں میسر ۔ گلشن میں ساتھ اس کے پیتے شراب پھرنا

نہ بیچوں ہوں میں اس پاس یہ دلِ نیم نگہ کو ۔ اس پر بھی ستم ہے جو خریدار نہ ہوتے

پریشاں ہی نظر آتا ہے دل ذراتِ عالم کا ۔ صبا کیا کھل گیا ہے پیچ اس کی زلف کے خم کا

حاضر ہے ترے سامنے راقم کر اس کو قتل ۔ مجرم یہ سب طرح سے ہے پر یک نگاہ کا

ترے پیچھے مرا دل اشک کی طرح ۔ گیا ایسا کہ پھر ڈھونڈھا نہ پایا

جو کہ مائل ہے تیغ ابرو کا ۔ تشنہ لب ہے وہ اپنے لوہو کا

راقم ہوتا نہیں وہ ہم آغوش ۔ کیونکہ ہو درد دور پہلو کا

رونے میں اس قدر تو جگر اے جگر نہ کر ۔ دیکھا نہ تو نے کچھ کہ دل و دیدہ کیا ہوئے

مخمس بر غزل سودا

نشو و نمائے باغِ جہاں میں رسیدہ ہوں ۔ شاد ادبیٔ ریاض سے دور آفریدہ ہوں
فکرِ غمِ جہاں سے بہت آرمیدہ ہوں ۔ نے بلبلِ چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں

میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

یارب مری کٹے ہے عجب طرح صبح و شام
حیرت ہی میں گذرتی ہے میرے تئیں مدام
مطلب نہ غم سے مجھ کو نہ کچھ خرمی سے کام
گریاں بہ شکل شیشہ و خنداں بہ طرزِ جام
اس میکدہ کے بیچ عجب آفریدہ ہوں

سنتا نہیں ہے دردِ رعیت کا بادشاہ
قاضی سو حسنِ دوست، بتاں کو ہے اس سے راہ
اور کوتوال شہر کی رشوت پہ ہے نگاہ
کوئی جو پوچھتا ہو یہ کس پر ہے دادخواہ
جوں گل ہزار جاسے گریباں دریدہ ہوں

آیا نہ تجھ کو رحم مرے حال پر کبھو
پوچھا نہ تو نے آکے مری چشم سے لہو
دیوے گا کیا جواب خدا کے تو روبرو
کرتا ہے جا کے گل کی تسلی چمن میں تو
خونِ جگر میں میں بھی تو دامن کشیدہ ہوں

بسمل صفت نہیں مجھے آرام ایک پل
ہے مرگ میرے دم سے نہایت ہی متصل
ملنا اگر ہے مجھ سے تو ظالم شتاب مل
غافل ہے کیوں ترا مری فرقت سے گوشِ دل
اے بے خبر میں نالۂ حلقِ بریدہ ہوں

پوچھے ہے تو کبھو کہ ترا رنگ کیوں ہے زرد
کہتا ہے گاہ یوں تو مجھے بھر کے آہِ سرد
تو کون ہے جو ملتا ہے چہرے سے اپنے گرد
میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقول درد
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

مندرجہ بالا مخمس میں راقم نے اپنے زمانہ کی حکومت کی بد انتظامی اور حاکموں کی عیش پرستی پر بے لاگ تنقید کی ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اردو شعر اس مطلق العنانی کے زمانہ میں بھی آزادیٔ رائے کی شمع

روشن کئے ہوئے تھے۔

میر تقی میرؔ اور سوداؔ کی شاگردی کا فخر اور نکات الشعرا میں ان کے ذکر کا شامل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ راقمؔ اپنے معاصرین میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اگر یہ ایک نامور اور خوش گو شاعر نہ ہوتے تو میر تقی میرؔ اور میر حسنؔ اپنے تذکرہ میں انھیں جگہ نہ دیتے۔

افسوس کہ راقمؔ کا دیوان انقلابات زمانہ سے اب نایاب ہے۔ ان کے چند اشعار سے جو قدیم تذکروں سے تلاش کر کے یہاں پیش کئے گئے ہیں، یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ راقمؔ کا دیوان شگفتہ اور دلچسپ مضامین کا ایک مجموعہ رہا ہوگا۔ چنانچہ میر حسنؔ راقمؔ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"بسیار بخوبی میگوید"

راقمؔ کے مندرجہ بالا دونوں مشہور قطعات سے ان کی ندرت بیان اور قادر الکلامی کا اظہار صاف ہوتا ہے۔

راقمؔ کی شاعری پر سوداؔ کے بجائے میرؔ کی شاعری کا اثر غالب معلوم پڑتا ہے۔ کیونکہ سادگی اور سلاست زبان کے ساتھ سوز و گداز ان کی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ ان کے اشعار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ راقمؔ نے اپنے ہمعصر دردؔ کے اثر سے بھی بے اثر نہ رہ سکے کیونکہ ان کے معرفت اور تصوف کے مضامین خواجہ دردؔ کے رنگ میں رہیں۔

۲۔ لالہ بالمکند حضورؔ دہلوی

مصحفی حضور کی نسبت لکھتے ہیں ــــــ

"لالہ بالمکند حضور تخلص شخص کہنہ مشق است، ہمیشہ در مشاعرہ ہائے شاہجہان آباد حاضر می شد۔ حلقۂ شاگردی خواجہ میر درد بگردن دارد۔ فقیر اُو را بیک دربار در لکھنؤ ہم دیدہ" [۱]

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم لکھتے ہیں ــــــ

"ایں بال مکند از علم فارسی بہرہ وافی داشت و از عربی ہم گونہ چاشنی یاب بود۔ کتب ہم در پیش نظر داشت۔ گرد مضامین آنہا میگشت و بطور خود در ریختہ می نشاند۔ شعر خود را از نظر فیض اثر میدانِ سخن سازی رایکہ تاز خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ میگذرانید" [۲]

لالہ بالمکند حضور قوم کھتری خواجہ میر درد کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ فارسی اور عربی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ غالباً میر تقی میر کو بھی اپنا کلام دکھاتے تھے۔ چنانچہ اس امر کی تائید ان کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے:

رکھتا ہوں میر صاحب و قبلہ سے میں سند ــ یہ جانتا نہیں کہ زباں ہے کہاں کی اور

نمونۂ کلام

حضور کا مندرجہ ذیل قطعہ بہت مشہور اور ضرب المثل ہے:

---

[۱] تذکرۂ ہندی ص۸۳ ، [۲] مجموعہ نغز ص۲۱۳

نہ پاؤں کو جنبش نہ ہاتھوں کو طاقت
جو اٹھ کھینچوں دامن میں اس دل ربا کا

سرِ راہ بیٹھے صدا ہے یہ اپنی
کہ اللہ یاور ہے بے دست و پا کا

نزاکت تشبیہ و استعارہ

بے پردہ دار مہر قیامت سحابِ زلف
مت کھینچ اپنے منھ سے ابھی تو نقابِ زلف

آفت، بلا و فتنہ و مار سیاہ دار
دیتے ہیں عاشق اس کے بھی کیا کیا خطابِ زلف

نازک خیالی و مضمون آفرینی

ٹھہرے نہ نبض دل کی سرِ انگشت کے تلے
سیماب کب رہے ٹھہر انگشت کے تلے

انگلی رکھے لبوں پہ وہ بیٹھا ہے کچھ خموش
ہے آبِ خضر جس کے سرِ انگشت کے تلے

مژگانِ تر سے دل خطِ یار اے حضور
مٹ جائیں گے حروف ترا نگشت کے تلے

عاشقانہ رنگ

واں رشتۂ محبت معشوق توڑتے ہیں
یاں ٹکڑے ٹکڑے دل کے ہم بیٹھے جوڑتے ہیں

دغا کو تم جفا سمجھے ستم کو ہم کرم سمجھے
ادھر کچھ دل میں تم سمجھے ادھر کچھ دل میں ہم سمجھے

چلے ہو تم جو اس بت سے ساز کرنے کو
حضور پاس بھی ہے کچھ نیاز کرنے کو

یاں مجھ میں نہیں ہے جان باقی
واں اب بھی ہے امتحان باقی[1]

---

[1] مختلف تذکروں سے محض بارہ شعر دستیاب ہو سکے۔ ان کا دیوان غدر کے ہنگامہ میں تلف ہو گیا۔

خصوصیاتِ کلامِ حضورؔ

حالانکہ حضورؔ میر دردؔ کے شاگرد تھے مگر ان کا کلام عاشقانہ رنگ میں ہوتا تھا۔ انھوں نے میرؔ کے رنگ کو اپنایا تھا۔ ان کے کلام میں تصوف یا پند و اخلاق کے مضامین جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے نہیں ملتے۔ ان کی زبان اپنے زمانہ کے لحاظ سے بہت صاف ہے۔ اس میں قدیم دکنی الفاظ اور ایسے ہندی الفاظ جو میرؔ اور سوداؔ کے زمانے میں رائج تھے، نہیں پائے جاتے۔ ان کی زبان پر فارسی زبان کا اثر غالب ہے۔ زبان کی صفائی، کلام کی روانی، روزمرہ اور محاورے کا صرف، فارسی تراکیب کی دلآویزی، تشبیہ و استعارے کی نزاکت ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کے کلام میں مضمون آفرینی اور نازک خیالی بھی پائی جاتی ہے۔ سوز و گداز بھی ملتا ہے مگر کم۔

حضورؔ خوش فکر اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کی طبیعت میں آمد غضب کی تھی:

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں　　　ایک خانہ خراب ہیں دونوں

حضورؔ کے اس شعر نے تقریباً ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اکثر حضرات کو اس کے مصنف کا علم بھی نہیں ہوتا لیکن شعر زبان پر آجاتا ہے اور سامعین اس سے لطف اندوز ہو جاتے ہیں۔

۴۔ راجہ نول رائے وفاؔ (قنوج)

وفاؔ کے متعلق میر حسن رقم طراز ہیں ——

"مقبول خاطرِ ارباب صفا لالہ نول رائے المتخلص وفاؔ از تذکرہ محمد قائم چناں ظاہر گشت کہ جوانے است نوخاستہ۔ بزیور علم و عمل آراستہ، ہوش و گوش، فہم و ذکا، صاحب حلم و حیا، لطافت مزاج از گل زیادہ، مانند بلبل دل از دست دادہ، برادر خوردش راجا گلاب رائے دیوان و مدار المہام نواب نجیب الدولہ خاں مرحوم بود۔ لیکن ایں عزیز مصروف اکتساب و غریق مطالعہ کتب۔ طلب ہر کمال دامنگیر حال طبع درد مند داشت۔ عاشق مزاج بود۔ اکثر فارسی و ریختہ میںنماید۔ خدا عمرش بیفزاید"۔ [۱]

"نول رائے وفاؔ قوم کالیستھ سکسینہ تھے۔ ان کے باپ دادا اٹاوہ کے موروثی قانون گو تھے۔ نول رائے کا ابتدائی زمانہ راجا رتن چند کے پاس گذرا جو ذات کے بنئے تھے اور سید عبداللہ خاں صوبہ دار الہ آباد کے یہاں دیوان تھے۔ ذاتی قابلیت اور کارکردگی کی بدولت نول رائے بھی راجا ہوئے۔ احمد شاہ کے عہدِ حکومت (۴۸ء۱۷۔ ۵۴ء۱۷) میں جب نواب عبدالمنصور خاں صفدر یار جنگ کو اودھ

---

[۱] تذکرہ شعرائے اردو: میر حسن صہ ۲۰۰

اور الہ آباد کی صوبہ داری ملی۔ راجا نول رائے دونوں صوبوں میں ان کے نائب مقرر ہوئے۔ یہ ایک زبردست مدبر، منتظم اور سیاست داں تھے۔ بہادر سپاہی بھی تھے اور ایک باکمال شاعر بھی۔

سلطنتِ مغلیہ کے تنزل کے زمانے میں صوبۂ الہ آباد اور اودھ کے قرب و جوار میں پٹھانوں کا بڑا زور تھا۔ ان کی دو زبردست ریاستیں روہیلکھنڈ اور فرخ آباد میں تھیں اور ان کا اقتدار نواب منصور خاں کے لئے خدشہ کا باعث تھا۔ وہ ان کی تباہی و بربادی کے تدابیر سوچا کرتے تھے۔ مگر نواب علی محمد خاں کے زمانے تک انکی دال نہ گلی۔ ان کے مرنے پر انھوں نے آپس میں آتشِ بغض و عناد کو بھڑکا کر مرحوم نواب کے پسر سعد اللہ خاں کو فرخ آباد کے نواب قاسم خاں سے لڑا دیا۔ اس جنگ میں نواب قاسم خاں مارے گئے۔ نواب منصور خاں نے ادھر فوراً سعد اللہ خاں کے علاقہ پر نول رائے کو ساتھ لے کر چڑھائی کر دی اور سعد اللہ خاں کی بیوی اور بچوں کو گرفتار کر کے ریاست پر قابض ہو گئے۔

نواب علی محمد خاں کی زوجہ (بی بی صاحبہ) راجا نول رائے کو سپرد کی گئیں۔ انھوں نے بی بی صاحبہ کو قنوج میں لے جاکر موتی محل میں نظر بند کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد نواب محمد خاں بنگش کے ایک

۱؎ منشی صاحب رائے متوطن لکھنؤ نواب آصف الدولہ کے عہد میں کسی عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ مزید حالات اور نمونۂ کلام کے لئے تذکرۂ بہار سخن ص ۲۲۸ ملاحظہ ہو۔

وفادار نمک حلال صاحب رائے صاحب نے جوڑ توڑ لگا کر بی بی صاحبہ کو راجہ نول رائے کی قید سے رہا کرا دیا۔ پٹھانوں میں جذبۂ انتقام پہلے ہی سے موجزن تھا۔ بی بی صاحبہ کے آزاد ہوتے ہی سب متحد ہو گئے۔ احمد خاں کی سرکردگی میں فرخ آباد سے پٹھان ۱۷۶۳ء میں راجا نول رائے کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے۔ ادھر قنوج سے راجا نول رائے بھی روانہ ہوئے اور خداگنج کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ پٹھانوں نے شب کو یکایک راجا کی فوج پر حملہ کر دیا۔ راجا عین لڑائی میں ایک پٹھان کی گولی کا نشانہ بنے"۔[۱]

کسی تذکرہ سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ راجا نول رائے وفا کب پیدا ہوئے تھے اور فنِ شاعری میں یہ کس استاد کے شاگرد تھے۔ یہ فارسی اور اردو میں صاحب دیوان گذرے ہیں۔

نمونۂ کلام

عاشقانہ رنگ

پہلے تو دل سہج میں گرفتار ہو گیا	اب چھوٹنا پر زلف سے دشوار ہو گیا
دنیا تو دل نہ آپ کو مقصود تھا ولیک	جب مل گئی یہ آنکھ ہیں ناچار ہو گیا
سمجھے صفائے شست تری چشم کا وہی	جس کے جگر سے تیر نظر پار ہو گیا
ایسے مزاج بھی کہیں دیکھے ہیں اے وفا	کیا بات تھی جو رات وہ بیزار ہو گیا

۱۔ ماخوذ از یادرفتگاں: حجر بریوی ص۹۴، ص۹۵ اور تذکرۂ شعرائے اردو: از میرحسن

دل تو کہے ہے جی میں گرفتار کیجئے
یعنی کسی صنم کے تئیں پیار کیجئے

گر مانگتا ہے جی کے تئیں دیجئے وفا
کیا چیز ہے کہ دوست سے انکار کیجئے

بیچے ہے اک نگاہ پہ دل کے تئیں وفا
لینا ہو اگر تمھیں تو کچھ اتنا گراں نہیں

بکھرائے کوئی زلف کو اپنی جو اے وفا
پھر آہ کس طرح ملے میرا سراغِ دل

کس گل تازہ نے اس باغ میں کی جلوہ گری
ہم ذرا داغ ہے جس کے نہ خریدار ہوئے

راضی وہ ہو کے رات سیج میں مچل گیا
عنقا پھنسا تھا دام میں لیکن نکل گیا

اپنی غرض کو ہم تو سبھی دکھ سہیں گے لیک
ہوتی ہے گالیوں سے تمھاری زباں خراب

سوز و گداز

ہووے گا دل سے محوِ غمِ یار کب تلک
کیوں ہم نشیں یہ جائے گا آزار کب تلک

کہنے لگا وہ سن کے مرا نالہ و فغاں
یارب جیا کرے گا یہ بیمار کب تلک

پوچھو ہو کیا کہ حال ترا کس طرح سے ہے
کیا جانتے نہیں ہو میاں جس طرح سے ہے

درد نے دل کے سر موئے تفاوت نہ کیا
اپنی سی کتنی ہی دار و دوا کی ہم نے

جوں اشک نہ پھر اٹھا زمیں سے
یارب میں گرا ہوں کس نظر سے

اس غم میں گر رہا سلامت
پتھر سے بھی سخت ہے یہ سینا

شعلہ زن ہے ہمیشہ داغ اپنا
بجھ نہیں جانتا چراغ اپنا

تصوف

شیخ کچھ فرق ہے تیرے ہی نظر آنے میں
ورنہ ہے ایک وہی کعبہ و بت خانے میں

اپنے ہی چشم کے تئیں تابِ نظر نہیں
ورنہ وہ آفتاب کہاں جلوہ گر نہیں

ہے جلوہ گر وہ ہم میں پر آلودگی سے دور
جس طرح عکس آب میں ہو ماہتاب کا

یاں تک از خویش رفتہ ہوں کہ مدام   آپ کرتا ہوں میں سراغ اپنا

لطافتِ تشبیہ و استعارہ

پھول بہتے لبِ دریا جو نہ دیکھے ہوں تو آ   ساتھ آنسو کے ہیں یاں قطرۂ خوناب رواں

عارض پہ تمھارے یہ پسینا   ہیرے کا ہے لعل پر نگینا

پند و نصائح

کوچۂ عشق کی ہے راہ خطرناک وفا   جو قدم یاں تو رکھے یار تو ہوشیاری سے

حسن عمل پہ اپنے نہ بھول اس قدر کہ شیخ   واں کے معاملہ سے کسی کو خبر نہیں

حباب آسا نہ پھول ہستی پہ اپنی   کہ غافل کیا بھروسہ زندگی کا

مضمون آفرینی

بسکہ اپنے انقلابِ بخت سے ڈرتے ہیں ہم   بسترِ گل پر بھی لرزاں ہی قدم دھرتے ہیں ہم

کل کا وعدہ گر کیا بھی اس نے لے محرم تو کیا   یاں تو بیتابی سے دل کی آج ہی مرتے ہیں ہم[1]

خصوصیاتِ کلامِ وفا

وفا کے مندرجہ بالا اشعار سے صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے موضوعات کو نظم کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ عاشقانہ جذبات کی عکاسی اور سوز و گداز کا اظہار ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ موضوعاتِ تصوف اور پند و نصائح کو بھی انھوں نے لطیف طریقے سے ادا کیا ہے۔ کہیں کہیں تشبیہ و استعارہ کی لطافت اور تخیل کی نزاکت بھی خوب ملتی ہے۔ زبان کی سادگی و سلاست کے ساتھ

---

[1] ماخوذ از تذکرہ شعرائے اردو: میر حسن ص۳۷، ص۲۰۲ اور یادِ رفتگاں ص۸۹، ص۹۵

بندش کی چستی اور کلام کی روانی پائی جاتی ہے۔ قیام الدین قائم تذکرہ مخزنِ نکات میں راجا نول رائے کے متعلق فرماتے ہیں:

"مقبول خاطرِ اربابِ صفا لالہ نول رائے المتخلص بہ وفا جوانیست نوخاستہ بہ جمیع صفات آراستہ و پیراستہ۔ جدتِ ذہن وجودتِ فہم، اصابت رائے و لطافتِ مزاج بہ مرتبۂ اتم دارد۔"

۴۔ مکندلال فدوی لاہوری

فدوی کے بارے میں مصحفی لکھتے ہیں:

"شاگرد صابر علی شاہ صابر تخلص، گویند بقال پسرے بودہ نومسلمان شدہ و بہ غلامی مرزائی نام برآوردہ و تربیت یافتہ...

...چوں ازاں طرف آوردہ شدہ بہ ملک ہندوستان رسیدہ دعوائے شاعری در دماغش جاداشت و زیادہ از مرتبۂ شاعری در راہ امردپرستی می گذاشت۔ چند جا خانہ جنگی ہم کردہ و بہ کوہ دکان حسن تعشق ورزیدہ۔ اکثر اعضائش دیدم کہ مجروح بودند...

اوباش چند گرد او نشستہ دیدم۔ صحبت بمیاں آمد۔ بعد چندے روز شنیدم کہ بہ سرکار نواب محمد یار خاں نوکر شد۔ ہرگاہ بعد دو سہ ماہ میاں محمد قائم وغیرہ وفقیر ہم باریاب مجلس ایشاں شدند بہ

سبب برہم زدگی مزاج نواب برخاستہ رفت ۔۔۔۔ باجل طبعی در قصبہ مرادآباد درگذشت ۔ عمرش از پنجاہ متجاوز خواہد بود ۔ در گفتن قطعہ طویل در ہر غزل ید طولیٰ داشت و نازش شاعری او اکثر برہمیں بود ۔ حسب الفرمائش نواب ضابطہ خاں ۔۔۔۔ مثنوی زلیخا بزبان ہندی نظم می کرد ۔ چنانچہ او ناتمام ماندہ ۔ کلامش بزبانِ بازاریان بسیار دائر و سائر است ؟ [۱]

مولانا آزاد فدوی کے متعلق رقم فرماتے ہیں :

" فدوی اصل میں ہندو تھے ۔ مکند رام نام تھا مسلمان ہو گئے تھے ۔ پنجاب وطن تھا ۔ علم کم مگر طبیعت مناسب تھی ۔ شعر اردو کہتے تھے ۔ صابر علی شاہ کے شاگرد تھے اور فقیرانہ وضع سے زندگی بسر کرتے تھے ۔ مشاعرہ میں جاتے تو کبھی بیٹھتے ، کبھی کھڑے ہی کھڑے غزل پڑھتے اور چلے جاتے تھے ۔ جب انھوں نے احمد شاہ کی تعریف میں قصیدہ کہا تو بادشاہ نے ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی ۔ ان کا بھی دماغ بلند ہوا اور دعویٰ ملک الشعرائی کا کرنے لگے ۔ کچھ مرزا پر اعتراض کیے ۔ اس پر مرزا (سودا) نے الو کی اور بنیے کی ہجو کہی ۔ انجام کو ہجویں حد سے گذر گئیں ۔ فدوی نواب ضابطہ خاں کے یہاں نوکر ہو گئے تھے اور آخر میں انھیں بھی لکھنؤ جانا پڑا ۔ ان کا دیوان نہایت دلچسپ ہے اور ہر غزل کا خاتمہ پیغمبر صاحب کی نعت یا کسی اور امام

---

[۱] تذکرۂ ہندی مولفہ مصحفی ص۱۶۶

کی مدح پر کرتے ہیں۔ زلیخا کا ترجمہ بھی نواب صاحب موصوف کی فرمائش سے نظم کیا ہے۔ گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ یہ ایک برخود غلط آدمی تھا۔ مرزا کے مقابلہ کے لئے فرخ آباد میں آیا اور ذلت اٹھا کر گیا۔"[1]

نمونۂ کلام

ندرتِ تشبیہ

آنسو نہیں ہیں دیدۂ تر میں بھرے ہوئے
موتی ہیں آبدار صدف میں بھرے ہوئے

کھلے بالوں میں یوں چمکے ہے تیرا عارضِ رخشاں
کہ جوں ابر سیہ میں برق سو سو بار ہو پیدا

حسن التعلیل

ابرو کی تیرے تیغ سے سورج ڈرے ہوئے
پھرتا ہے اپنے منہ پہ سپر کو دھرے ہوئے

لطافتِ تغزل

خالی کر ان کو دل کے نشانے پہ ایک بار
ترکش ترے مژہ کے ہیں چاروں بھرے ہوئے

مبالغہ

فدوی ہمارے دیدۂ گریاں کے فیض سے
اشجار کوہ و دشت کے یکسر ہرے ہوئے

جدتِ تخیل

چشم پُر آب ہے اور تس پہ جگر جلتا ہے
کیا قیامت ہے کہ برسات میں گھر جلتا ہے

بلند پروازی

گر تیغ نگہ سے تو کرے وار فلک پر
چل جائے فرشتوں میں بھی تلوار فلک پر

---

[1] آب حیات صفحہ ۱۵۵

مضمون آفرینی

قامت کو ترے دیکھ مصور نے بافسوس — کھینچی قلم آہ سے تصویر ہوا پر

ندرتِ تخیل

یہ سرو نہیں باغ میں ہے آہ کسو کی — نرگس نہیں تکتا ہے چمن راہ کسو کی

ایک لطیف غزل

ٹلتے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زباں چلے — ہم دادخواہ ساتھ ہیں اس کے جہاں چلے
کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیر آہ سے — یہ ہی ہے تیر ایک کہ سدا بے کماں چلے
سر پر تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار — ہر ایک قدم پر رستے ہوئے خوں فشاں چلے
لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں — بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی لے دوستاں چلے
یاروں نے اپنی راہ لی فدوی ہمیں سے ہے — وہ چیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے

ایک دوسری پر کیف غزل

دیکھ کر ناقۂ لیلیٰ کو پکارا مجنوں — مر گئے مشقِ جنوں دشت میں کرتے کرتے
ایک دن اس نے دکھائی تھی ہمیں گردشِ چشم — وہ ادا یاد رہی یار کی مرتے مرتے
نہیں تابِ خموشی ہے نہ یارائے سخن — بات بھی تجھ سے جو کہتے ہیں سو ڈرتے ڈرتے
کس کو جینے کی توقع ہے بقول فدوی — عمر آخر ہوئی پیمانہ ہی بھرتے بھرتے

خصوصیاتِ کلامِ فدوی

فدوی کا کلام جیسا کہ ان کے نمونۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے نہایت لطیف و پرکیف ہے۔ زبان کی شیرینی و فصاحت، کلام کی روانی و بلاغت، لطافتِ تشبیہہ و

استعارہ۔ خوبیٔ روزمرّہ و محاورہ اور جدتِ تخیل و مضمون آفرینی وغیرہ کے لئے ان کا کلام خاص شہرت رکھتا ہے۔ اردو شاعری کے دورِ دوم کے لحاظ سے ان کی زبان میں بہت صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔ بقول مصحفی یہ طویل قطعہ اور غزل کہنے میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ ان کا کلام ناچنے اور گانے والیوں کی زبان پر بہت دنوں تک پھیلا ہوا تھا۔ بقولِ آزاد ان کا دیوان بہت دلچسپ ہے۔ بشاش بھی ان کے اشعار کو اچھا لکھتے ہیں۔ اگر قدرتی بری صحبت میں نہ پڑتے تو گمان غالب ہے کہ وہ بھی اپنے زمانے کے ایک باکمال اور جید شاعر ہوتے۔ مرزا سودا ایسے رستم سخن کے مدِمقابل ہونے کی جرأت کرنا ہی ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ ان میں موزونیٔ طبع بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ وہ ایک فطری شاعر تھے۔

۵۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ لکھنوی

آپ مہاراجہ رام نرائن موزوں عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے۔ شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے مگر عنفوانِ شباب میں اپنے ماموں کے پاس چلے گئے اور وہاں بہت دنوں تک رہے۔ اس کے بعد ان کا قیام اکثر لکھنؤ اور بنارس میں رہا۔ فارسی زبان کے مشہور شاعر اور استاد مرزا فاخر مکیں سے ہنگام قیام لکھنؤ شرفِ تلمذ رہا جس سے فارسی شعر کہنے میں اچھی خاصی استعداد ہو گئی۔ فارسی شاعری کے دلدادہ تھے۔ امیرانہ شان و شوکت سے ساری زندگی بسر کی۔ بڑے جامہ زیب، نفیس مزاج اور

وجیہہ و شکیل جوان تھے۔ مشاعرے بڑے کروفر سے کیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق منشی
دیبی پرشاد بشاش فرماتے ہیں:

"مشاہیر شعرائے اردو فارسی سے تھے۔ فنِ شعر سے خوب ماہر
تھے۔ اکثر میل ان کی طبیعت کا فارسی کی طرف تھا۔ چنانچہ چار دیوان
فارسی ان سے یادگار ہیں۔ ریختہ کے شعر بھی کبھی کبھی موزوں کرتے
تھے۔ پورب کے اکثر شاعروں نے شعر کہنا ان سے سیکھا ہے۔ جعفر علی
حسرتؔ اور میر حیدر علی حیرانؔ ان کے عمدہ شاگردوں میں سے تھے۔"[1]

مولوی ابراہیم خاں خلیل دیوانہ کے متعلق فرماتے ہیں:

"دیوانہ تخلص، رائے سرب سنگھ نام، رشتہ دار مہاراجہ رام
نرائن کا تھا۔ نہایت پرگو اور وضع مغلیت پر مرتا تھا۔ دو دیوان
فارسی میں اس نے لکھے ہیں اور اکثر ریختہ گو لکھنؤ کے مرزا جعفر علی
حسرتؔ اور میر حیدر علی حیرانؔ اس کے شاگردوں میں سے ہیں۔
۱۲۰۴ھ میں رحلت فرمائی۔ فارسی منظوم اس کا دس ہزار بیت سے
زیادہ ہے۔"[2]

میر حسن فرماتے ہیں:

"دیوانہ زبردست شاعر فارسی است۔ شعر بسیار گفتہ
است۔ استادِ ریختہ گویانِ لکھنؤ است ---"[3]

---

[1] تذکرہ شعرائے ہنود ص۵۵ [2] تذکرہ گلزار ابراہیم ص۱۳۳، [3] تذکرہ شعرائے اردو: میر
حسن ص۱۰۱

دستِ بردِ زمانہ سے دیوانہ کا دیوان نایاب ہوگیا۔ کسی تذکرہ میں نہ توان کے مفصل حالاتِ زندگی ملتے ہیں اور نہ کافی نمونۂ کلام ملتا ہے۔ مختلف تذکروں سے دیوانہ کے جو چند اشعار دستیاب ہوسکے ہیں۔ انھیں یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

نمونۂ کلام

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اسے پر نہیں انکار بغیر

جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پرفن تھے ولے
گرمیٔ بزم کہاں اس بتِ عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے
کیونکہ دیوانہ کھلا رہئے اب اس یار بغیر

دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل جائے
رستم کا کب جگر ہے کہ زہرہ نہ پگھل جائے

دل سدا تڑپے ہے میرا مرغِ بسمل کی طرح
یاں کہ سیکھی مرغِ بسمل نے مرے دل کی طرح

رباعی

وہ یار کہاں کہ یار باشی کیجئے
وہ وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجئے

اک گوشہ میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا
اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجئے

ان چند اشعار سے دیوانہ کی خوش گوئی، معنی آفرینی اور رفعتِ تخیل کا اظہار صاف ہوتا ہے۔ بغیر کسی تشبیہ یا استعارہ کے استعمال کے محض انتخابِ الفاظ اور صرف محاورہ و روزمرہ سے دیوانہ نے ان اشعار کو دلآویز اور پُر اثر بنا دیا ہے۔

تذکرہ نویسوں سے کبیدہ خاطر ہوکر جگر بریلوی فرماتے ہیں:

"دیوآدے صاحب کمال کم پیدا ہوئے ہیں۔ لکھنؤ جیسے
اردو کے مرکز میں استاد بلکہ جگت استاد مانے گئے۔ بڑے بڑے سخنور
ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔ آج ان کا کلام اگر ہمارے سامنے
ہوتا تو اندازہ ہوتا کہ اس یگانۂ روزگار شاعر نے آسمانِ شعر سے
کیسے کیسے تارے توڑے اور کون سے وہ جواہر بکھیرے جن کے
باعث یہ جگت استاد ہوا۔ حسرت اور حیران ایسے شاگردوں کے
تو دیوان کے دیوان موجود ہیں لیکن استاد کا کلام کہیں نظر نہیں
آتا۔ قدیم تذکروں میں نام اور ایک آدھ شعر دیکھنے میں آجاتا ہے۔"[۱]

۶۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی

رائے لچھمی نرائن متخلص بہ صاحب و شفیق کے والد منسارام نواب نظام الملک
آصف جاہ کے عہد میں پیشکار شش صوبہ دکن تھے۔ یہ کھتری تھے۔ ان کے اجداد لاہور
کے باشندے تھے۔ ان کے دادا بھوانی داس افواج مغل کے ساتھ اورنگ آباد آئے
اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ ان کا خاندان ہمیشہ شاہانِ اسلام سے وابستہ رہا۔
شفیق کی ابتدائی تعلیم و تربیت میر غلام علی آزاد کے ذریعہ ہوئی اور انھیں
کی وجہ سے یہ صاحب استعداد ہوئے جس کا ذکر انھوں نے اپنے کلام میں اکثر کیا ہے۔

---

[۱] یادِ رفتگاں: جگر بریلوی ص۱۰۱

سترہ سال کی عمر میں عربی، فارسی صرف و نحو اور انشا میں خاص قابلیت پیدا کر لی اور اسی عمر میں صاحبِ تصنیف بھی ہو گئے۔ چنانچہ تذکرہ چمنستانِ سخن انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں تصنیف کیا تھا۔ یہ میر غلام علی آزاد کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور انھوں نے شاعری میں ان کا اتباع کیا۔ ان کا تخلص اوّل اوّل صاحب تھا، بعدہٗ ۱۷۵۹ء میں شفیق اختیار کیا۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ یہ دکن کے بہت مشہور مصنف اور شاعر ہوئے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا انھیں بڑا شوق تھا۔[۱]

تصنیفات

۱۔ گلِ رعنا: یہ شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے جس میں ہندو اور مسلمان فارسی گو شعرا کا ذکر دو علیحدہ فصلوں میں کیا گیا ہے۔

۲۔ تذکرہ چمنستانِ شعرا: یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے جس میں شمالی ہند اور دکن کے ۲۱۳ شعرا کا ذکر بزبان فارسی ہے۔ تذکرہ چمنستان شعرا مرتبہ مولوی عبد الحق (۱۹۲۸ء) میں مطبع انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا ہے۔ یہ تذکرہ شفیق نے ۱۷۵۷ء میں لکھا تھا۔

۳۔ حقیقت ہائے ہندوستاں

۴۔ مآثرِ آصفی

۵۔ شامِ غریباں

۶۔ تذکرۂ گل

۱۔ شفیق کے مزید مفصل حالات کے لئے تذکرہ محبوب الزمن: مولفہ مولوی عبد الجبار صفحہ ۵۹۰ دیکھئے۔

۷۔ مراۃ الہند
۸۔ نخلستانِ تذکرہ وغیرہ

شفیق نے غزل، رباعی، مثنوی اور قصیدہ وغیرہ جملہ اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا مرتبہ اوسط درجہ کے شعرا میں بہت بلند ہے۔ ۱۷۹۸ء میں انھوں نے انتقال کیا۔

نمونۂ کلام

لطافت رعایت لفظی

تشنہ لب ہوں شراب کی سوگند ۔۔۔ جل گیا جی کباب کی سوگند
بے سخن ہوں ترا دہن دیکھے ۔۔۔ یار حاضر جواب کی سوگند
دور کر دے حجاب کو اپنے ۔۔۔ چادر ماہتاب کی سوگند
دل صاحب ہے کیا پریشاں آج ۔۔۔ زلف کے پیچ و تاب کی سوگند

عاشقانہ رنگ

عاشقی نے کر دیا دونوں جہاں میں نامور ۔۔۔ مر گئے ہیں ورنہ مجنوں سے یہاں لاکھوں کروڑ
اگر وہ شعلہ رو ٹک پردہ منھ سے دور کر دیجے ۔۔۔ پتنگے جل مریں اور شمع کو بے نور کر دیجے
دل الجھتا ہے مرا جیوں جیوں کہ سلجھے ہے وہ بال ۔۔۔ کیا مچے گی دیکھئے کاکل کے کھل جانے میں دھوم
ہم بغل ہونے سجن کے ہو گئی آنسو کی بھیڑ ۔۔۔ جیوں مچاتے طفل ہیں گے عید کے آنے میں دھوم
گالیاں بھی کھا چکے جھڑکی بھی تیری سہ چکے ۔۔۔ یہ تمھاری دوستی کے جس میں ہے ری دوستی
بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ ۔۔۔ نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

ہمارے قتل کرنے کو نگہ قاتل کی کیا کم تھی — جو اس نے نیمچہ بھی ساتھ لایا ہے خدا حافظ

میں اپنے درد دل کہنے کے صدقے — ترے سن سن کے چپ رہنے کے صدقے

خدا کسی کو کسی ساتھ آشنا نہ کرے — اگر کرے تو قیامت تلک جدا نہ کرے

شمع پہ پروانہ جل کر راکھ ہو — عاشقی کا نام روشن کر گیا

کیا ہوا ہے کس طرح کا ابر ہے — جس کو دل چاہے نہ ہو کیا جبر ہے

مرے سے وعدہ کرکے پھر مکرنا — تری باتیں بنانے کے تصدق

مرا دل لینے ہی تک آشنا تھا — تری آنکھیں پھرانے کے تصدق

سوز و گداز

ان وفاؤں کا یہ بدلہ ہے جفا یا قسمت — ہم چلے تم کو تو اب کرکے دعا یا قسمت

ہم ترستے ہی رہیں لوٹے مزا یوں پرویز — کوہ کن چیر کے سر کو یہ کہا یا قسمت

مہر اور لطف و تسلی ہے رقیبوں کے نصیب — ہم پہ یہ جور و ستم اور بلا یا قسمت

بیکسی میں کون ہے گا کوہ کن سا دل جلا — بات کہتے ہی دیا ہے جان ہے رے اتحاد

جس گھڑی لیلیٰ کی کھولی فصد آ فصاد نے — خون نکلا قیس سے اس آن ہے رے اتحاد

آخری دم ہے ٹک اک دیکھ بھلا لے قاتل — بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس

جان جنگل میں یوں نہ جاؤ تم — دل جلا کوئی سانس بھرتا ہے

خاک سے اس کی نرگس اگتی ہے — جو ترا منتظر ہو مرتا ہے

اپنے بندوں پہ جان دیکھو بھلا — کوئی اس طور ظلم کرتا ہے

لطافتِ تشبیہہ

خط پہ آویزاں نہیں یہ زلف تیری پیچدار — مارنے کو مور کا لشکر مگر آیا ہے مور

آبِ حیات سخن میں سخن گو کے ہے سخن   باقی ہے میرے بعد بھی یادگار بچھڑا[1]

خصوصیاتِ شفیق

شفیق کے کلام کا رنگ عاشقانہ ہے۔ اس میں سوز وگداز اور جوش واثر کی نمایاں کمی ہے۔ زبان اکثر عامیانہ اور لہجہ کرخت ہے۔ کلام میں کوئی انوکھا پن یا البیلا پن نہیں ہے جو ہمیں چونکا دے۔ اس میں نہ کوئی انفرادی خصوصیت ہے اور نہ کوئی فلسفہ یا تصوف۔ پھر بھی ان کی گراں قدر تصنیفات اور ادبی خدمات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے کلام کی قدر ہوتی ہے۔ ان کا مندرجہ بالا نمونۂ کلام ان کی ابتدائی شاعری کا انتخاب ہے۔ ممکن ہے کثرتِ مشق سے بعد کا کلام کافی صاف اور عمدہ ہوگیا ہو۔

دورِ دوم کے اوصاف وخصائص

اردو شاعری کا سنہرا دور

دورِ دوم اردو شاعری کا سنہرا دور ہے جس میں تمام اصنافِ شاعری کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ غزل گوئی میں میر کی غزلوں، قصیدہ گوئی میں سودا کے

---

[1] ماخوذ از چمنستانِ شعرا صفحہ ۲۹۳، صفحہ ۵۰۰

قصائد، صوفیانہ شاعری میں خواجہ میر درد کی غزلیات اور مثنوی نگاری میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا اردو شاعری میں جواب نہیں۔ میر و سودا سپہر سخن پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ غالب، ذوق، آتش اور ناسخ ایسے اساتذہ میر کی استادی اور قادر الکلامی کے دل سے قائل تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر کا تغزل، درد کا تصوف اور غالب کا تفلسف اردو شاعری کی جان ہے۔

زبان کی اصلاح

اس دور کے شعرا خصوصاً میر، سودا اور خواجہ درد نے زبان کی صفائی اور اصلاح کی طرف خاص توجہ دی۔ زبان کی صفائی اور اصلاح کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے خواجہ میر درد اپنے دولت کدہ پر ایک ماہانہ مشاعرہ کرتے تھے جو بعد میں میر صاحب کے مکان پر منعقد ہونے لگا۔ اس سے ادبی ذوق و شوق میں اضافہ ہوا اور زبان کی ترقی اور اصلاح کی نئی راہیں سامنے آئیں۔ ہندی کے بہت سے وہ ثقیل الفاظ جو دور اول میں رائج تھے اس زمانے میں ترک کر دیے گئے جس سے زبان بہت صاف ہو گئی۔ مگر پھر بھی ایدھر، ادھر، آئیاں جائیاں، تر سیاں، نت، تجھ کوں، انے، جنے، کسو، سیتی، لاگا، اپنے تئیں، اودر (بمعنی طرف)، تنک (بہ معنی ذرا)، ان کنے (ان کے پاس) وغیرہ قدیم الفاظ کا استعمال جاری رہا۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ نرم و شیریں ہندی الفاظ بھی مروج رہے[1] مولانا آزاد فرماتے ہیں:

---

[1] آب حیات صفحہ ۱۳۱ - ۱۳۵

"اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سنا کہ مرزا جان جاناں، سودا، میر، خواجہ میر درد چار شخص تھے کہ جنھوں نے زبان اردو کو خراط اتارا ہے۔" ۱؎

اردو زبان پر فارسی کا اثر

اس دور کے شعرا علاوہ اردو کے فارسی زبان کے بھی استاد تھے جس سے سودا، میر اور خواجہ میر درد وغیرہ فارسی شعرا صائب، بیدل، نظیری اور عرفی وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر اردو میں شعر کہتے تھے بعد اکثر ان کے اچھے اشعار کا اردو ترجمہ بھی کر لیتے تھے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاورات کی بہتات ہے۔ سودا اور میر نے بے شمار دلآویز اور عام فہم فارسی الفاظ و محاورات کو بجنسہ یا بصورت ترجمہ اردو زبان میں داخل کیا اور فارسی زبان کے خزانے سے ہزارہا جواہر پارے چن کر اردو کے خزانے کو مالامال کیا۔ اردو پر فارسی کا رنگ چڑھا کر ان باکمالوں نے زبان میں قوت، تراکیب میں حسن اور بیان میں لطافت و شیرینی کے ساتھ تشبیہ و استعارہ کی رنگینی پیدا کی۔ ان بزرگوں کی مساعی جمیلہ سے دہلی کی زبان مستند اور قابل تقلید قرار پائی۔

اسلوب بیان کی بے تکلفی

دور اول کے شعرا کی طرح اس دور کے شعرا بھی اپنے جذبات اور احساسات

۱؎ آب حیات صفحہ ۱۳۰

کا اظہار بغیر کسی تصنع اور تکلف کے سادہ اور سلیس زبان میں کرتے تھے۔ ابھی تک یہ شعرا شعرائے مابعد کی طرح پیچ در پیچ تشبیہ اور استعاروں کے جال میں نہیں پھنسے تھے اس لئے اس دور کے شعرا کے کلام میں جو زور اور تاثیر پائی جاتی ہے وہ کسی اور دور کے شعرا کو نصیب نہیں ہوئی۔

تذکرہ نویسی کا آغاز

اسی عہد سے اردو شعرا کا تذکرہ لکھنے کا آغاز ہوتا ہے جن سے اس زمانہ کے اردو شعرا کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے میر نے ۱۷۵۲ء میں "نکات الشعرا" لکھا۔ اس تذکرہ میں میر نے اپنے عہد کے تقریباً سب نامور شعرا کا ذکر کیا ہے اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد میر حسن نے "تذکرہ شعرائے اردو" لکھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں شعرا کے کلام پر چھوٹے چھوٹے جملوں میں جو رائے دی ہے وہ آج بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ درد کے متعلق لکھا ہے ——— "دیوانش اگرچہ مختصر لیکن چوں کلامِ حافظ سراپا انتخاب"۔ ہندوؤں میں لالہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے ۱۷۵۸ء میں تذکرہ "چمنستانِ شعرا" لکھا جس میں شمالی ہند اور دکن کے ۲۱۳ شعرا کا ذکر بزبان فارسی ہے۔ انھوں نے شعرا کے کلام کا کافی انتخاب پیش کیا ہے۔ مگر جذبات سے متاثر ہو کر شعرا کے عیوب یا محاسن کے بیان میں اکثر غلو سے کام لیا ہے۔

ان تذکروں سے اردو شعرا کی حوصلہ افزائی ہوئی اور لوگوں کے دلوں

میں اردو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔

اس دور کے ہندو شعرا کی ادبی خدمات

اس عہد کے ہندو شعرا نے بھی اپنے ہمعصر مسلم شعرا کی طرح اردو ادب کی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ثقیل ہندی الفاظ کو متروک قرار دیا اور زبان کی صفائی پر توجہ دی۔ سوداؔ و میرؔ کے تتبع میں انھوں نے بھی فارسی الفاظ، تراکیب اور محاورات کا اپنے کلام میں خوب استعمال کیا اور اردو شاعری میں وہ مشاقی حاصل کی کہ ان میں بعض مثلاً سرب سنگھ دیوانہؔ مسلم الثبوت استاد بن گئے۔ چنانچہ دیوانہؔ کے تلامذہ میں جسونت سنگھ پروانہؔ کے ساتھ جعفر علی حسرتؔ اور میر حیدر علی حیرانؔ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان شعرا نے اپنے کلام سے ہندو اور مسلمان دونوں میں اردو کا عام مذاق پیدا کیا اور اس سے اردو کی دلفریبی اور مقبولیت میں اضافہ ہوا اور باہمی یگانگت و اخوت کو تقویت ہوئی۔ ہندو مسلم ثقافتی سنگم نے اب ایسا حسین و جمیل رنگ پایا کہ اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ کفر و اسلام، تسبیح و زنار، دیر و حرم اور وحدت و کثرت کے ہزاروں جلوے اردو میں نقش پیرا ہوئے جن سے عوام میں وسیع النظری، میل ملاپ اور قومی یگانگت کے جذبات غیر شعوری طور پر جاگزیں ہوئے۔ اچھے مسلمان شعرا کا ہندو استادوں کی شاگردی اختیار کرنا اس بات کی شاہد ہے کہ ہندو بھی میدان شاعری میں بہت پیش پیش تھے اور ہندوستانی عوام اس کے درثہ دار ہو چکے تھے۔ اردو کے لئے مختلف افراد و قوم کے دلوں میں جگہ ہو گئی تھی۔ غیریت کے پردے اٹھ چکے تھے۔ ایک ہی فرش

پر محمود و ایاز نشست و برخاست کرنے لگے تھے۔ من و تو کا امتیاز بہت کچھ کم ہو چکا تھا۔

دور دوم کے باقی ماندہ ہندو شعرا کی فہرست

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۱	آرام	پریم ناتھ دہلوی	ملاحظہ ہو تذکرہ بہار سخن صفحہ ۲۶۔ معمولی شاعر تھے۔
۲	بیتاب	سنتوک رائے دہلوی	محمد قائم کے شاگرد تھے۔ خوش گو شاعر تھے۔ تذکرہ شعرائے اردو: میر حسن ص۶۴۔ ریاض الفصحا: صفحہ ۴۱
۳	جھمن	لالہ جھمن لال دہلوی	شاگرد خواجہ میر درد۔ فارسی و اردو شعر کہتے تھے۔ طبقات الشعرا ترجمہ الیف فیلن صفحہ ۸۵
۴	عزیز	بھکاری لال دہلوی	شاگرد خواجہ میر درد۔ الہ آباد میں سکونت اختیار کی تھی۔ بہار سخن صفحہ ۲۷۷
۵	صاحب	صاحب رائے لکھنوی	نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ بہار سخن صفحہ ۲۴۲
۶	صفا	رائے منولال لکھنوی	شاگرد میر تقی میر۔ اردو فارسی میں صاحبِ دیوان تھے۔ بہار سخن صفحہ ۲۴۸
۷	ربط	بالا پرشاد حیدر آبادی	لکھنؤ سے حیدر آباد گئے۔ راجہ خوشحال چند کے داماد تھے۔ خوش گو شاعر تھے۔ تذکرہ شعرائے

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
			ہنود، بشاش صفحہ ۶۶
۸	رنگین	لال چند اورنگ آبادی	چمنستان شعرا صفحہ ۵۱۹
۹	مہتاب	لالہ موہن لال اورنگ آبادی	چمنستان شعرا مرتبہ تحقیق اورنگ آبادی صفحہ ۳۰۶
۱۰	راجہ	راجہ بہادر پٹنہ	خلف مہاراجہ شتاب رائے صوبہ دار پٹنہ۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۵۰ پر آپ کا یہ شعر ملتا ہے: یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے ہم ان تلک نہ پہنچے وہ ہم تلک نہ پہنچے
۱۱	عاشق	مہاراجہ کلیان سنگھ عظیم آبادی	خلف مہاراجہ شتاب رائے۔ آپ بہار کے صوبہ دار تھے۔ اردو فارسی میں صاحب دیوان تھے۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۹۵
۱۲	پنڈت	دیا رام کشمیری	ان کا قیام زیادہ تر فرخ آباد میں تھا۔ ایک خوش گو شاعر تھے۔ تذکرہ بہار گلشن کشمیر جلد اول؛ صفحہ ۱۶۹

پانچواں باب

اردو شاعری کا دور سوم

انشاؔ اور مصحفیؔ کا زمانہ

(تقریباً ۱۸۰۰ء لغایت ۱۸۲۴ء)

اس دور کا تاریخی پس منظر

سلطنت مغلیہ کے آخری فرماں روا بہت کمزور اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ جیسا کہ گزشتہ باب میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ شاہ عالم ثانی ۱۷۵۹ء سے ۱۷۷۱ء تک احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے خوف سے کچھ دنوں بہار میں اور پھر انگریزوں کی پناہ میں الہ آباد کے قلعہ میں رہے۔ ۱۷۷۲ء میں مرہٹوں کی مدد سے جب وہ دلی کے تخت پر قابض ہوئے تو انھوں نے شاہی خزانہ بالکل خالی پایا۔ ۱۷۷۸ء میں میر بخشی غلام قادر روہیلہ نے انھیں تخت سے اتار دیا اور اندھا بھی کر دیا۔ ۱۸۰۳ء میں شہر دہلی کو انگریزوں نے چھین لیا اور شاہ عالم برطانوی حکومت کے پنشن خوار بن گئے۔

اس طرح نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے پیہم حملوں، مرہٹوں کی لوٹ مار

اور وزرا کی سازشوں سے جب سلطنت مغلیہ برباد اور دہلی تباہ ہوگئی اور لوگوں
کے جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کی صورت باقی نہ رہی تو وہ دہلی چھوڑ
چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اس وقت جب کہ دہلی میں افلاس ونکبت کا دور دورہ تھا۔
لکھنؤ میں عیش وعشرت کی فراوانی تھی اور سخاوت کا دریا بہہ رہا تھا۔ تلاش معاش
کی فکر میں دہلی کے شعرا بھی ترک وطن کرنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ سودا دل پر جبر کرکے
نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے۔ میر کو نواب آصف الدولہ نے زادِ راہ
بھیج کر بلوایا اور وظیفہ مقرر کیا۔ میر سوز اور میر حسن بھی اسی زمانہ میں لکھنؤ چلے
آئے۔ اس طرح آصف الدولہ کے زمانہ میں (۱۷۷۵ء-۱۷۹۳ء) اردو شاعری کا
مرکز دلی سے ہٹ کر لکھنؤ آگیا اور دہلی کی شمع سخن سے لکھنؤ کی شاعری کا چراغ جلا۔

نواب آصف الدولہ اپنی سخاوت ونیز علم وفن کی قدردانی کے لئے بہت
مشہور تھے۔ ان کے لئے آج بھی یہ کہاوت مشہور ہے: "جس کو نہ دے مولا اس کو
دے آصف الدولہ"۔ ان کے زمانہ میں شہر لکھنؤ اپنی انتہائی شہرت اور شان و
شوکت کو پہنچ گیا تھا۔ تعمیرات کے بڑے شوقین تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کا بڑا امام باڑہ،
دولت خانہ اور رومی دروازہ ان کی فیاضی اور شوقِ تعمیرات کی تاریخی یادگاریں
ہیں۔ ان کی سخاوت اور فیاضی کی وجہ سے ۱۷۹۳ء میں جب انھوں نے انتقال
کیا تو خزانہ خالی تھا۔[1] آصف الدولہ شاعروں کے بڑے قدردان تھے اور خود بھی
شعر کہتے تھے اور اپنا کلام میر سوز کو برائے اصلاح دکھاتے تھے۔ انھیں کے مبارک

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "LUCKNOW, THE GARDEN OF INDIA" صفحہ ۱۱

PUBLISHED BY G.W. LAWRIC & CO.

عہد میں سودا، میر اور میر سوز وغیرہ دلی سے لکھنؤ آئے اور انھیں کی سرکار کے مداح اور وظیفہ خوار بنے[1]

اسی زمانہ میں آصف الدولہ کے دربار کے علاوہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار بھی شعرائے دلی کی جائے پناہ تھی۔ مرزا سلیمان شکوہ شاہ عالم ثانی کے تیسرے فرزند تھے۔ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ (میر بخشی) کی بغاوت کے بعد وہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے تھے اور اپنے بڑے بھائی مرزا جواں بخت کی طرح یہیں رہنے لگے تھے۔ ان کے اخراجات کے لئے آصف الدولہ نے چھ ہزار روپئے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے لکھنؤ میں ۳۸ سال تک قیام کیا تھا۔ یہ شعرا کے بہت بڑے سرپرست تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور سلیمان تخلص کرتے تھے۔ افلاس اور فکر معاش سے مجبور ہو کر مصحفی نے دلی کو خیرباد کہا اور لکھنؤ کی رنگین شام دیکھنے وہ بھی چلے آئے۔ یہاں آتے ہی مرزا سلیمان شکوہ کے مصاحب اور استاد ہو گئے۔ ان کے بعد انشا بھی دلی سے لکھنؤ چلے آئے اور مرزا سلیمان شکوہ کے استاد بنے۔ مصحفی، انشا، قتیل اور میر حسن مرزا سلیمان شکوہ کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے[2]

نواب آصف الدولہ کی وفات کے بعد ان کے سوتیلے بھائی سعادت علی خاں نواب وزیر ہوئے۔ یہ ۱۷۹۲ء سے ۱۸۱۴ء تک برسرِ اقتدار رہے۔ یہ اودھ کے بہترین حکمراں خیال کئے جاتے ہیں۔ انھیں اپنے پاس دس ہزار انگریزی سپاہیوں کی ایک فوج رکھنا اور اس کا صرفہ اٹھانا پڑتا تھا۔ اور ۷۶ لاکھ روپئے سالانہ انگریزی سلطنت کو دینا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ انھیں صوبۂ اودھ کا نصف حصہ اور الہ آباد کا قلعہ بھی

---

۱ ، ۲ تاریخ ادب اردو : رام بابو سکسینہ صفحہ ۲۵۳

انگریزی سلطنت کو دے دینا پڑا۔ اس کے بدلے میں انگریزوں نے نواب موصوف کو تمام بیرونی حملوں اور باغی رعایا سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیا۔ شروع شروع میں انھیں شراب نوشی اور فضول خرچی کی عادت تھی مگر صوبہ کا نصف حصہ انگریزوں کے حوالہ کر دینے کے بعد انھوں نے تمام بری عادتیں ترک کر دیں اور اپنا سارا وقت سلطنت کے انتظام اور فرائض کی انجام دہی میں صرف کیا۔ انھوں نے دل کشا اور فرحت بخش تعمیر کرا کے لکھنؤ کی شان میں اضافہ کیا۔ چونکہ یہ بڑے کفایت شعار اور منتظم تھے اس لئے ان کے انتقال کے وقت ان کے خزانے میں چودہ کروڑ روپیہ جمع تھا[۱]۔ یہ شعرا کے بڑے قدردان تھے اور خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ سید انشا ان کے درباری شاعر تھے۔ مصحفی اور انشا کے معرکے انھیں کے زمانے میں ہوئے تھے۔

نواب سعادت علی خاں کی وفات کے بعد ان کے فرزند غازی الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ انگریزوں کو نیپال کے خلاف جنگ کے اخراجات کے لئے کئی کروڑ روپئے دینے کے صلہ میں انھیں ۱۸۱۸ء میں بادشاہ کا لقب اختیار کرنے کی اجازت ملی۔ یہ بھی علم و فن کے بڑے مربی تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ انھوں نے چھتر منزل اور شاہ نجف کا امام باڑہ تعمیر کرا کے لکھنؤ کی شان دوبالا کی۔ ۱۸۲۷ء میں انتقال کیا اور شاہ نجف میں مدفون ہوئے۔

دور سوم کا ادبی ماحول

یہ تھا دور سوم کا ادبی ماحول اور یہ تھی اودھ کی تاریخ جس کا بہت بڑا

---

[۱] ملاحظہ ہو کتاب LUCKNOW, THE GARDEN OF INDIA صفحہ ۵

اثر اس دور میں اردو شاعری کی ترقی اور اس کے رجحان پر پڑا۔ لکھنؤ میں مصحفی، انشا، حسرت جرأت اور رنگین وغیرہ نامور شعرا کے اجتماع سے وہاں لوگ شاعری کے پیچھے اتنے دیوانے ہوئے کہ مشاعرے گھر گھر اور ماہوار اور ہفتہ وارے گذر کر تقریباً روزانہ ہونے لگے۔ مرزا سلیمان شکوہ اور نوابان اودھ کی طرف سے شعرا کے وظائف مقرر ہوئے۔ اراکین دربار و امرا نے انھیں اپنا مصاحب بنایا اور اہل لکھنؤ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان تمام وجوہ سے اس دور میں بجائے دہلی کے لکھنؤ اردو ادب کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔

مصحفی اور انشا اس دور کے سب سے بڑے شاعر اور مسلم الثبوت استاد تھے میدان سخن میں وہ ایک دوسرے کے حریف تھے۔ مشاعروں میں ان کے باہم مقابلوں اور نوک جھونک کے واقعات کا ذکر آب حیات میں بہت مفصل اور دلچسپ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں ہم بخوف طوالت محض ان کے کلام کی ان خصوصیات کا ذکر کریں گے جن کا نمایاں اثر لکھنؤ کی شاعری پر پڑا۔

مصحفی ایک کہنہ مشق اور پر گو شاعر تھے۔ آٹھ دیوان یادگار چھوڑے اور یہ بھی اس حالت میں جبکہ افلاس سے مجبور ہو کر سیکڑوں غزلیں مشاعروں میں پڑھنے کے لئے شاگردوں کے ہاتھ آٹھ آنہ سے ایک روپیہ تک فی غزل کے حساب سے فروخت کر دی تھیں۔ مشاعرہ جب قریب ہوتا تو طرح مشاعرہ پر سیکڑوں اشعار نظم کرتے چلے جاتے تھے۔ جو اچھے شعر ہوتے ان میں سے آٹھ دس اشعار کی غزل بنا کر اور استاد سے اپنے تخلص کا مقطع کا شعر کہلا کر شاگرد خرید لیتے۔ جو اشعار بچ رہتے انھیں مشاعروں میں وہ خود پڑھتے تھے۔ ایک مشاعرہ میں جب شعروں پر بالکل تعریف نہ ہوئی تو

انھوں نے تنگ ہو کر غزل زمین پر دے ماری اور کہا روے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہنچی ہے کہ اب کوئی سنتا بھی نہیں۔"[1] مصحفی نے ۱۸۲۴ء میں انتقال کیا۔

اپنی استادانہ قابلیت کے اظہار کے لئے مصحفی نے بیشتر غزلیں سنگ لاخ زمینوں میں لکھی ہیں اور شاید ہی کوئی قافیہ ایسا ہو جسے موزوں نہ کیا ہو۔ ایک ہی طرح میں دو غزلہ اور سہ غزلہ کہتے تھے اور قافیہ کو مختلف اندازسے کئی کئی بار باندھتے تھے۔ ان کے کلام کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے۔ بیشتر کلام دلچسپی اور تاثیر سے خالی ہے۔ لیکن پھر بھی مجموعی حیثیت سے ان کا کلام اس اعلیٰ پایہ کا ہے کہ اس سے ان کی قادر الکلامی اور استادانہ قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر تھی۔ آتش ان کے شاگرد رشید تھے مگر انھوں نے مصحفی کے خشک رنگ کو اختیار نہیں کیا۔ مصحفی کی شاعرانہ تعلی ملاحظہ ہو:

خامش ہے ارسطو و فلاطوں مرے آگے
دعویٰ نہیں کرتا کوئی موزوں مرے آگے

دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے بہ شدت
واللہ کہ وہ شخص ہے مجنوں مرے آگے

سب خوشہ ربا ہیں مرے خرمن کے جہاں ہیں
کیا شعر پڑھے گا کوئی موزوں مرے آگے

قدرت ہے خدا کی کہ ہوے آج وہ شاعر
طفلی میں کیا کرتے تھے غوں غوں مرے آگے

استاد ہوں میں مصحفیؔ حکمت کے بھی فن میں
ہے کودک نو درس فلاطوں مرے آگے

انشا اپنی شوخ و ظریفانہ طبیعت اور بذلہ سنجی کے لئے بہت مشہور تھے۔ اپنے شاعرانہ کمالات کی بدولت یہ مصحفی کو پس پشت ڈال کر مرزا سلیمان شکوہ کے

---

[1] آب حیات صفحہ ۳۱۲

استاد اور شوخی، طراری اور بذلہ سنجی کے ذریعہ نواب سعادت علی خاں کے مصاحب بن بیٹھے تھے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر رفیق حسین صاحب لکچرر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی لکھتے ہیں:

"انشا علاوہ عالم و شاعر ہونے کے بہت بڑے زبان دان اور شاعری کے فن کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کے ہاں الفاظ کی تراش خراش اور بندشوں کی انوکھی ترکیبیں ایک نہیں سیکڑوں ملیں گی۔ ان کی غزلوں میں ہندی الفاظ کی اتنی زیادہ آمیزش ہے کہ سوائے جرأت کے کسی اور ہم عصر کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ پوری پوری غزلیں بلا فارسی اضافت کے مل جائیں گی۔ ان کے کلام میں مقامی رنگ اور مقامی رسم و رواج کی موقع بہ موقع جھلک پائی جاتی ہے لیکن اتنی نہیں جتنی نظیر اکبر آبادی کے یہاں ہے.... انشا بھی اپنے معاصرین کی طرح ایک ہی ردیف قافیہ میں متعدد غزلیں نظم کرتے چلے جاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں تو ردیف ایک ہی رہتی ہے لیکن قافیہ اور بحر بدل دیتے ہیں۔ اس سے ان کی مشق سخن کا پتہ چلتا ہے۔ .... اس سے قادر الکلامی کا ضرور پتہ چلتا ہے لیکن کلام میں تکلف اور آورد کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ تاثیر میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ یہ عیب صرف انھیں کے یہاں نہیں بلکہ اس دور کے ہر شاعر کے یہاں پایا جاتا ہے۔"[۱]

انشا نے ۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔

---

[۱] اردو غزل کی نشو و نما ص۲۶۹، ص۲۷۰

جرأت اور رنگین اس دور کے درجہ دوم کے نامور شعرا تھے۔ ان کی غزلیں عموماً عاشقانہ مضامین سے بھری پڑی ہیں۔ انھوں نے مسائل زندگی اور تصوف و اخلاق کے مضامین نظم کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ جرأت کے متعلق ڈاکٹر رفیق حسین صاحب لکھتے ہیں:

"جرأت کے زمانے میں شعر گوئی اور پر گوئی کا ساتھ چولی دامن کا تھا۔ چنانچہ اس دور کے ہر شاعر نے کئی کئی غزلیں ایک ہی طرح میں ردیف و قافیہ بدل کر کہی ہیں۔ جرأت بھی اس وبا سے بچ نہ سکے۔ جہاں کہیں اس دھن میں لگے وہاں ان کی غزلوں میں قافیہ پیمائی اور بے اثری کے سوا کچھ نہیں"۔[1]

دور سوم کے ممتاز ہندو شعرا

۱۔ منشی سداسکھ نثار شاگرد مرزا سودا۔

۲۔ لالہ کانجی مل صبا شاگرد مصحفی

۳۔ راجہ جسونت سنگھ پروانہ شاگرد دیوانہ، میر اور مصحفی۔

۴۔ منشی موجی رام موجی شاگرد مصحفی

یوں تو یہ چاروں ہندو شعرا بہت اچھے اور نامور شاعر ہوئے ہیں مگر ان میں منشی موجی رام موجی بڑے خوش گو اور پرگو شاعر تھے۔ انھوں نے استادی کا مرتبہ بھی حاصل کیا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کے نامور شاعر منشی دیا کرشن ریحاں انھیں کے شاگرد

---

[1] اردو غزل کی نشوونما ص ۲۷۶

رشید تھے۔ ان کی تصانیف میں سات دیوان اردو اور فارسی کے ہیں۔ سدا سکھ نثار دہلوی (ساکن الہ آباد) کا مایہ ناز کارنامہ شری مد بھاگوت کو نظم کرنا ہے۔ یہ ایک مربوط طولانی مذہبی نظم ہے جس میں تقریباً پچاس ہزار اشعار ہوں گے۔ جسونت سنگھ کا کلام عاشقانہ جذبات کی عکاسی، نازک خیالی اور رنگینی کے لئے مشہور ہے اور صبا کا کلام سوز و گداز کے مرقعے کے لئے۔ ان شعرا کے مفصل حالات زندگی اور نمونہ کلام وغیرہ اگلے صفحات پر ملاحظہ ہوں۔ اس دور کے باقی ماندہ ہندو شعرا کی ایک فہرست اس باب کے آخر میں دے دی گئی ہے۔

۱۔ سدا سکھ نثار دہلوی

ان کے متعلق بشاش لکھتے ہیں:

"نثار تخلص منشی سدا سکھ خلف سیتل پرشاد باشندہ دہلی قوم کایستھ مقیم الہ آباد شاگرد سودا صاحب دو دادین اردو و فارسی و بھاکا۔ مثنوی گذری اور ایک واسوخت بھی کہا ہے۔ منشی کشوری لال سابق منصف قنوج ان کے پوتے ہیں۔"[۱]

نثار کے مفصل حالات زندگی اور کافی نمونۂ کلام کسی تذکرہ میں نہیں ملتے۔ ان کے مفصل حالات زندگی معلوم کرنے اور مزید نمونۂ کلام حاصل کرنے کی جستجو کے دوران میں حسن اتفاق سے ان کے ہی خاندان کے ایک شخص بابو کنھیا لال گوڑ نائب تحصیلدار ساکن محلہ بادشاہی منڈی الہ آباد سے میری ملاقات ہو گئی۔ بابو کنھیا لال گوڑ اردو فارسی کے

---

[۱] تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۳۱

ماہر اور بڑے سخن فہم ہیں۔ ان سے ہی نثار کے مندرجہ ذیل حالات زندگی اور کافی نمونۂ کلام حاصل ہوئے۔

سداسکھ گوڑ منشی شیتل پرشاد دہلوی کے بیٹے تھے۔ قدیم وطن سید پور ضلع غازی پور (اتر پردیش) تھا۔ مگر ان کے بزرگوں نے دہلی جاکر وہیں سکونت اختیار کی اور شاہی دربار سے وابستہ ہوکر دکلائے دکن کے نام سے مشہور ہوئے۔ نثار کے والد دہلی میں بعہد محمد شاہ منصب دار پان صدی کے عہدہ پر مامور تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں (۱۸۰۶ء۔ ۱۸۳۷ء) نثار دہلی سے الہ آباد چلے آئے اور محلہ بادشاہی منڈی میں سکونت اختیار کی۔ نثار کو مرزا محمد رفیع سودا سے تلمذ حاصل تھا۔ یہ ایک باکمال شاعر اور نامی سخن سنج کے علاوہ ایک قابل نثار بھی تھے۔ فارسی، اردو اور بھاشا کے عالم تھے۔ ان تینوں زبانوں میں انھوں نے متعدد کتاب تصنیف کی ہیں۔ ان کا شمار جدید ہندی نثر کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اردو فارسی اور بھاشا تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور صاحب دیوان تھے۔ منتخب التواریخ، عجائب المخلوقات اور شری مدبھاگوت (نظم) ان کی تصنیفات سے ہیں۔

حضرت نثار کا ایک بہت بڑا کارنامہ شری مدبھاگوت کو نظم کی شکل میں پیش کرنا ہے۔ اس میں تقریباً پچاس ہزار اشعار لکھے ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۸۲۱ء میں تصنیف کی تھی۔ اس کا قلمی نسخہ بابو کنھیا لال گوڑ کے پاس ہنوز محفوظ ہے۔ مگر بوسیدہ اور کرم خوردہ حالت میں ہے۔ نثار کا دیوان تلف ہوگیا اس لئے ان کی غزلوں کے اشعار ان سے نہ مل سکے۔ ان کے کلام کا مندرجہ ذیل اقتباس شری مدبھاگوت سے پیش کیا جارہا ہے۔ یہ اشعار حضرت نثار کی قادر الکلامی اور زورِ طبع پر دلالت کرتے

ہیں۔

(شری کرشن کی ولادت کے موقع پر)

پری چہرہ گل رخ مہ جبیں ہوا نندجی کے گھر پسر
شمع فروزاں طفل تھا پروانہ تھے مادر پدر

جس دن سے یہ لڑکا ہوا گوکل میں گھر گھر شادیاں
ہر جا مبارکبادیاں نوروز عید مکاں مکاں

بلبل تمامی گوپیاں لڑکا ہوا مانند گل
یا اینکہ وہ بدرالدجیٰ یہ تھیں چکوریں جزوکل

لڑکا سلونا سانولا سارے جہاں کا جانِ جاں
صدقے تھیں حوریں حسن پہ قرباں تھیں دھانیاں

اس مثنوی کے سب سے زیادہ دل آویز اشعار وہ ہیں جو حضرت نثار نے بطور گیت کے عنوان سے بشکل مخمس لکھے ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

شری کرشن جی نے اودھو سے اک روز یوں کہا
نند اور جسودھا جی نے ہمیں پرورش کیا

دل میں کبھی نہ سمجھے کہ بچہ ہے غیر کا
اور گوپیوں نے ہم سے کیا پیار بے ریا

ہم نے کیا جو ان سے ہے عالم میں یہ ملا

وے ہجر میں ہماری ہوئیں زار و نزار
ہجرت ہماری ان کو ہوئی سخت ناگوار

دیکھے بنا ہمارے ہیں بے تاب و بے قرار
آنکھیں سفید ہو گئیں ان کی در انتظار

ہم منفعل ہیں ان سے اور ان کا گلہ بجا

گستاخی ہے یہ آپ اب احسان کیجیے
گوکل کی سمت جلد قدم رنجہ کیجیے

کچھ کھائیے یہاں تو وہاں پانی پیجیے
یہ اشتیاق نامہ انھیں جا کے دیجیے

دو چار باتیں موقع زبانی بھی کہیے جا

کہیے گا جا کے ان سے ہمارا یہی پیام
ہم پر تمھاری شیفتگی کا ہے خیال خام

یہ خون کی جھلک ہے رہے گی نہیں مدام
گل کی بہار صبح سے لے کے ہے تا بہ شام

عاشق اسی کا ہو جسے جو سب میں رم رہا

اس کے وصال سے ہے نہیں ہجر عمر بھر اس گل کے رنگ و بو پہ خزاں کا نہیں اثر
ہے وہ تو سب کے پاس پر آتا نہیں نظر ہو کر کے سر بہ جیب اگر دیکھو دھیان کر

اس وقت آدے اس کا نظر حسن اور ادا

(چند بند چھوڑ کر)

مدھو بن سے کوئی آیا یہ سن کر کے گوپیاں نکلے جس مکاں میں اودھو جی یکجا ہوئیں وہاں
کہنے لگیں کہ کون ہو آئے ہو کیوں یہاں کاغذ سا کیا ہے ہاتھ میں یہ کیجیے بیاں

شاید اسی کا خط ہے کہ جس نے دیا دغا

اٹھ بولی ایک ان میں کہ اس میں ہے کیا لکھا جادو ہے یا کہ سحر کہ نسخہ جنون کا
ٹک اس کو کھول کر کے سنا دیجے مدعا کہنے لگی تب ایک کہ سب مکر اور دغا

چاہو سنو کہ یا سنو تم سے کہہ دیا

اودھو کے ہوش و عقل گئے یہ نکات سن مل مل کے ہاتھ روئے بہت دل میں سر کو دھن
کہنے لگے یہ دل میں کہ کس سے کہوں سخن لاچار ہو کے بولے سنو ٹک لگا کے من

کچھ معرفت کے شغل کا کیجیے محاورا

ارشاد یہ ہوا ہے کہ از راہ معرفت ہووے گی ہم سے جلد تمھاری مواصلت
اس حسنِ عارضی پہ تمھاری جو محویت ہفتہ سے زیادہ اس کی لطافت سمجھو مت

جو حسن میرا اصل ہے رہتا ہے وہ سدا

اس حسن کا ہے نام بلا شبہ بے نشاں بے چون و بے چگون بلا رنگ و بے گماں
جس کے قیاس و فہم میں حیراں ہیں قدسیاں ساری ہے روئے خاک سے تا اوج آسماں

ذرہ سے تا بہ مہر جو معمور ہو رہا

"گوپیوں کا مہاجرت نامہ بنام شری کرشن" سے چند بند ملاحظہ ہوں:

ہم کو یہ ارشاد و تلقین آپ محو پشت کوز — وصل اس قحبہ کی قسمت ہم کو یہ ہجراں کا سوز

دیکھئے کب تک کٹیں یہ زندگی کے چند روز — ہو رہی ہیں جاں بہ لب پہ دور ہے دلی ہنوز

جو نصیب اپنا برا تو کیجئے کس کا گلہ

اودھو صاحب کی فصاحت اور بلاغت کہنا کیا — کس لطافت سے مشرح خط کے مضموں کو کیا

لیک اس کمبخت دل کو کچھ نہیں سمجھا گیا — یہ تو اپنے اور ہی سودے میں غلطاں ہو رہا

حسن کے طالب کے آگے ہے تصوف کیا بلا

حسن کے رنگوں میں کالے رنگ کا تھا کیا شمار — پر ہمارے عشق نے اس کو دیا تھا اعتبار

اپنی نادانی سے آخر کے تئیں کھینچا خمار — یہ نہ تھا معلوم کالی کو بری ہوتیں ہیں یار

کیا ہوا موقع کہ جیسے کے تئیں تیسا ملا

(چند بند چھوڑ کر)

ہجر تھا منظور تو کس واسطے آئے یہاں — جو گئے تو مار جاتے کر گئے کیوں نیم جاں

دل گیا قدموں لگا اور جسم بے تاب و تواں — یاں تڑپتا ہے پڑا جوں برگ خشک اندر خزاں

جرم دعصیاں کیا تھا اپنا جس کا یہ بدلہ ملا

بیل و بوٹے مار و کژدم باغ و گلشن خارزار — آتش سوزندہ آنکھوں میں نظر آتی بہار

آہ وہ کیدھر گئے ایام وے لیل و نہار — کوہ سے بھی ہے گراں تر زندگی کا اپنی بار

یا ملو یا زہر دو یا پاس اپنے لو بلا

غزل کے اشعار

اس کے قدموں سے لگی رہتی ہے دن رات حنا ۔۔۔ خوب دنیا میں بسر کرتی ہے اوقات حنا
دسترس ہم کو نہیں جن کے قدم تک پہنچیں ۔۔۔ تو بڑی ہاتھ میں کھیلے تری کیا بات حنا
عرض کیجو تو ہماری کبھی قدم بوسی تک ۔۔۔ اس کے قدموں سے لگے اب جو کسی رات حنا
تو بھی اس طرح لگے گا مری چھاتی سے کبھی ۔۔۔ شوخ جس طرح سے لگتی ہے ترے ہات حنا
ہم تو مایوس رہے اس کی قدم بوسی سے ۔۔۔ جا کے قدموں سے لگی یار کے ہیہات حنا
فندقیں[۱] یار کے مشاطہ لگاتی ہیں نثار ۔۔۔ گلِ مہندی پہ نہ لادے کبھی آفات حنا

ہمارا ہی دل جب ہمارا نہیں ہے ۔۔۔ تو شکوہ ہمیں کچھ تمھارا نہیں ہے
لقب جس کا دل ہے وہ گھر ہے خدا کا ۔۔۔ یہ کعبہ بتوں کا سنوارا نہیں ہے

کانوں نے سنا جو کچھ آنکھوں سے کیا چرچا ۔۔۔ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تو دل کو دیا بتلا
یہ ہرسہ ہوئے اک دل ہم مفت ہوئے رسوا ۔۔۔ ناحق تمھیں کیا کہتے تم اپنے کرم فرما

یہ سادہ دلی اپنی اور ان کی یہ مکاری ۔۔۔ اور اپنی یہ مظلومی اور ان کی جفا کاری
ہجر میں عشق کی سوزش کا بیاں کیا کیجے ۔۔۔ شرح و تفصیل میں قاصر ہے زباں کیا کیجے
دل کو سمجھایا بہت آہ میاں کیا کیجے[۲] ۔۔۔ تم کو معلوم ہے اب زیادہ بیاں کیا کیجے

۱؎ ماخوذ از "ہندوؤں میں اردو" از رفیق مارہروی ص۱۷۹۔ فندق کے معنی ہیں انگلیوں کے سروں پر مہندی لگانا۔ ۲؎ ماخوذ از "تذکرہ شعرائے ہنود" از بشاش ص۱۳۱

جدت ادا اور ندرتِ تشبیہہ

سنگار کس کے رجھانے کو کیا تم نے چشم　　　　　　　کہ بال بال در اشک چو پروے ہیں[1]

خصوصیاتِ کلامِ نثار

نثار کے مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بے شک ایک جلیل القدر استاد کے شاگرد تھے۔ ان کی غزلوں کا دیوان اگر مل جاتا تو ان کی غزل گوئی پر زرا تفصیل سے تبصرہ کیا جاسکتا۔ پھر بھی جو چند شعر ان کی غزلوں کے پیش کئے گئے ہیں ان سے ان کی مشاقی اور کمال کا ثبوت ملتا ہے۔ چونکہ نثار لکھنؤ کے ماحول سے الگ تھلگ رہے اس لئے ان کا کلام لکھنؤ شاعری کے معائب سے پاک ہے۔ انھوں نے سودا کے تتبع میں دہلوی شاعری کے خصوصیات کو برقرار رکھا ہے۔

لیکن نثار کے شاعرانہ کمال کا راز ان کی نظم شری مد بھاگوت میں ہے۔ اس نظم میں جو زور، تاثیر اور روانی پائی جاتی ہے، اس سے ان کی قادر الکلامی اور زورِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اردو کی یہ پہلی مربوط طولانی مذہبی نظم ہے جس میں پچاس ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ اگر یہ اپنے زمانہ میں شائع ہو جاتی تو اب تک اس کی اہمیت مسلم ہو جاتی اور کسی حد تک اردو میں ایپک نہ ہونے کی تلافی ہو جاتی۔ صحیح معنوں میں یہ ایک طویل مربوط نظم ہے جس میں ہیروئک عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ ایپک کے دوسرے عناصر مثلاً جنگ و جدل بہت کم ہیں۔

---

[1] گلزار ابراہیم ص۲۴۳

۲۔ لالہ کانجی مل صبا لکھنوی

مصحفی تذکرۂ ہندی میں صبا کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :۔

"لالہ کانجی مل صبا تخلص قوم کایستھ سکسینہ وطن بزرگانش فیروز آباد وخودش در لکھنؤ نشو نما یافتہ۔ فقیر در ایامیکہ وارد ایں شہر بود چندے حسب اتفاق بر مکان ایشاں اقامت داشت۔ مشارٌ الیہ دراں ایام بمقتضائے موزونی طبع شوق شعر پیدا کردہ۔ چیزے کہ بزبان خود می گفت آنرا از نظر فقیر باعتقاد تمام میگذرانید تا اینکہ در عرصۂ قلیل دیوان مختصر درست ساخت۔ طبعش بہ خیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود۔ اگر عمرش وفا میکرد زیادہ ازیں قدم بر جادۂ ترقی می نہاد حیف کہ بہ عمر بست وپنج سالگی در عین جوانی مدقوق شدہ درگذشت۔"[1]

منشی دیبی پرشاد بشاش تحریر فرماتے ہیں :

"صبا تخلص کانجی مل ایک موزوں طبع جوان تھے جو فیروز آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں پرورش پائی۔ علم شعر کو مصحفی سے درست کیا اور مختصر دیوان جمع کر کے عنفوان شباب میں مر گئے۔"[2]

---

[1] تذکرۂ ہندی صفحہ ۱۴۲، صفحہ ۱۴۳

[2] تذکرہ شعرائے ہنود مولفہ بشاش صفحہ ۸۶

نمونۂ کلام[1]

سوز و گداز کے بہترین مرقعے۔

مجلس سے اٹھ کے جب وہ رشکِ قمر گیا ہے
اپنا تو روتے روتے نورِ نظر گیا ہے

کیا تو نے کچھ صبا سے اے تند خو کہا تھا
روتا ہوا ادھر سے با چشم تر گیا ہے

بھٹکا پھرے ہے مجنوں لیلیٰ کے قافلہ میں
یہ پوچھتا کہ یارو محمل کدھر گیا ہے

ابھی تسکیں ہوئی تھی اک ذرا فریاد و زاری سے
لگا پھر مضطرب ہونے کہ پھر دردِ جگر اٹھا

نہیں معلوم اے یارو صبا کے دل میں کیا آیا
ابھی جو بیٹھے بیٹھے وہ یکایک آہ کر اٹھا

عبث ہے یہ تمھارا پاس میرے بار بار آنا
جدائی میں مجھے مشکل ہے لے یارو قرار آنا

یہی شغل اس کے کوچہ میں ہے اب آٹھوں پہر اپنا
بصد امید جانا دن کو شب کو شرمسار آنا

ترے درد جدائی میں ترا عاشق گیا جی سے
صبا اس گل کے دروازے پہ یہ جا کے پکار آنا

ہے تھا عاشقِ لیلیٰ کہ اب میں چل نہیں سکتا
مجھے اے ساربان تو باندھ لے دوڑا کے محمل سے

نہ آیا وہ مسیحا لب دمِ آخر بھی بالیں پر
موا تو میں ولے ارمان یہ دل میں رہا میرے

عاشق مضطر کا سوزِ دل نہاں کیوں کر رہے
شمع کے شعلہ کی لے یارو زباں کیوں کر رہے

اے صبا سچ ہے جدائی میں بقول مصحفیؔ
دردمند دوست بے آہ و فغاں کیونکر رہے

مندرجہ ذیل شعر صبا کے سوز و گداز کا ایک شاہکار ہے ؎

افسوس وہ آرام عدم میں بھی نہ پایا
جس کے لئے دنیا سے سفر ہم نے کیا تھا[2]

---

[1] ماخوذ تذکرۂ ہندی از مصحفی ۔ [2] استاد ذوقؔ نے اسی مضمون کو اپنی ایک غزل کے مطلع میں یوں باندھا ہے ؎ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

مضمون آفرینی اور ندرت اسلوب بیان

مصور جب کہ زلف یار کی تصویر کھینچے ہے — تو ہاتھ اپنا وہ دہشت سے دم تحریر کھینچے ہے
چلے دامن اٹھا کے یہ کہو اس شوخ قاتل سے — کہ یہ مدفن نظر آتا ہے رنگیں خون قاتل سے
ہاتھوں میں تیرے پیارے یہ طائر حنا ہے — یا مرغ دل کسی کا بسمل ابھی کیا ہے
کبھی گل رو مرا جا کر جو دریا میں نہاتا ہے — فروغ حسن سے گلزار پانی میں دکھاتا ہے
مجھے آتا ہے تجھ پر رحم اس قاتل کے کوچہ میں — لئے جاتا ہے نامہ آج تو لے نامہ بر کس کا
دن عید کے جو مجھ سے وہ نا آشنا ملا — روٹھا تو تھا میں لیک گلے اس کے جا ملا

متفرق

ازل سے سوز تیرے عشق کا جو سر میں تھا میرے — گیا میں جی سے اپنے پر نہ وہ سر سے گیا میرے
کیا سحر ہے کہ جا کر واں ہی کا ہو رہا ہے — اس کی گلی میں یاں سے جو نامہ بر گیا ہے
صبا ہم نے تو ہر گز کچھ نہ دیکھا جذب الفت میں — غلط یہ بات کہتے ہیں کہ دل کو راہ ہے دل سے
جس روز ترے در پہ گذر ہم نے کیا تھا — اس دن ہی ترے غم سے حذر ہم نے کیا تھا
اپنے پاؤں کی صدا مجھ کو سنا کر پھر گئے — کل جو آئے تھے وہ سننے کو مرا احوال دل

پند و نصائح

فنا ہیں ایک دن سب یاں عمارت اور گھر کس کا — یہ دنیا وہم ہے یارو پدر کس کا پسر کس کا

صبا نے مندرجہ ذیل شعر اپنی چند روزہ زندگی کے حسب حال لکھا تھا ؂

اس خاکداں سے جھاڑ کے دامن کو جوں صبا — ایسا گیا کہ پھر نہ سراغ صبا ملا

خصوصیات کلام صبا

مصحفی کا شاگرد ہوتے ہوئے بھی صبا نے مصحفی کے خشک رنگ کو اختیار نہیں

کیا۔ ان کا کلام سوز و گداز کا مرقع ہے۔ انھوں نے میر کے کلام کا تتبع کیا ہے۔ یوں تو صبا کے تمام اشعار کی زبان نہایت سادہ سلیس اور شیریں ہے اور اسلوب بیان نہایت موثر ہے مگر اس لحاظ سے کہ یہ خود سچے عاشق بھی تھے۔ ان کے کلام میں حقیقت نگاری کا عنصر غالب ہے۔ افسوس کہ صبا کا انتقال عنفوان شباب میں ہو گیا۔ اگر عمر وفا کرتی تو یہ ہونہار شاعر نہ معلوم کیسے کیسے بیش بہا جواہر کا اضافہ کرتا۔

۳۔ راجہ جسونت سنگھ پروانہ لکھنوی

راجہ جسونت سنگھ پروانہ ذات کے کائستھ تھے۔ راجہ بینی بہادر نائب نواب شجاع الدولہ ان کے پدر بزرگوار تھے۔ راجہ بینی بہادر نے ۱۷۶۴ء میں بکسر کے جنگ میں بڑی داد شجاعت دی تھی۔ راجہ جسونت سنگھ نواب شجاع الدولہ کے دیوان اور منڈیاؤں دموہنہ (ضلع لکھنؤ) کے جاگیردار تھے۔ بشاش ان کی نسبت لکھتے ہیں[1]۔ پروانہ ایک جوان خرم و شگفتہ، خوش تمثال و پری جمال تھے اور وہ اردو زبان میں صاحب دیوان گذرے ہیں۔ اکثر محقق لوگ ان کو سرب سنگھ دیوانہ کے شاگردوں میں سے خیال کرتے ہیں اور جو بعض میر حسن اور مصحفی کا شاگرد لکھتے ہیں ان پر اعتبار نہیں۔ اردو کی شاعری کو حضرت پروانہ نے خوب ترقی دی۔ وہ بھی مثل اپنے استاد سرب سنگھ دیوانہ کے بڑے حامی اور مربی اس زبان کے تھے۔ فارسی گوئی میں بھی بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ چنانچہ

---

[1] تذکرۂ شعرائے ہنود ص ۴۸

ایک دفعہ شیخ علی حزیں اصفہانی کی ملاقات کو گئے۔ شیخ نے نازک دماغی سے کہلا بھیجا کہ "دریں بزم رہ نیست بیگانہ را" کاکا جی (پروانہ) نے فوراً جواب دیا کہ "پروانگی داد پروانہ را" حزیں اس لطیفۂ فی البدیہہ کے سننے سے بہت محظوظ ہوئے اور بلا کر نہایت تعظیم و تکریم کی۔"

گارساں دتاسی پروانہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں[1] "یہ شاگرد لالہ سرب سنگھ دیوانہ کا تھا۔ ذہین اور تعلیم یافتہ تھا۔ پہلے فارسی میں لکھتا تھا لیکن اپنے نام کی شہرت کے لئے یہ اچھی زبان جو ہندوستان سے مفقود ہے، چھوڑ کر اپنے ملک کی زبان ہندوستانی اختیار کی۔ اس نے شب و روز بموجب بیان مصحفی کے بارہ برس محنت کی۔ وہ ہندوستانی شعر کی نقل کیا کرتا تھا۔ پروانہ نے شاعری میں بآسانی اور جلدی لکھنے میں شہرت حاصل کی۔ اوس نے غزل اور قصیدہ سودا کے طور پر لکھی ہے۔ مگر وہ نئی تشبیہہ دینے کو بہت مائل تھا۔

اوس کے شعر دلچسپ اور فصیح ہیں۔ وہ میر تقی میر، میر حسن اور میاں بقاء اللہ کی تکریم کرتا تھا اور کبھی کبھی اون سے اصلاح بھی لیتا تھا۔ بعد ازاں مصحفی سے اصلاح لی۔ اوس کا ایک دیوان شاہ عالم ثانی کے چوبیسویں سال جلوس یعنی ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ میں تھا.... دیوان اس شاعر کا دیکھنے میں آیا۔ بہت اچھا پاکیزہ اشعار اوس کے ہیں۔ اوس میں قصائد۔ غزلیات اور قطعات اردو اور چار تاریخیں ہیں۔ اسپرنگر صاحب بہادر کے پاس وہ دیوان موجود تھا۔"

مصحفی نے دیوانہ کے متعلق تحریر فرمایا ہے[2] "جوان خلیق و ذی شعور است

---

[1] تاریخ شعرائے ہنود صفحہ ۱۴۱۔ [2] تذکرہ ہندی صفحہ ۲۴۶۔

بیش ازیں شعر فارسی میگفت و از نظر رائے سرب سنگھ دیوانہ میگذرانید چنانچہ اشعار فارسی پیش فقیر در شاہجہان آباد بوساطت مرزا قتیل رسیدہ بودند ----- روزہائے کہ مولف از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ رسید بہ بسیار گرمی و تپاک پیش آمدہ واز جہاں ایام عطف عنان فکر شعر فارسی بطرف ریختہ کردہ۔ خود داشت و روز در گفتن شعر ہندی مصروف داشت تا الی الیوم عرصہ دوازدہ سال شدہ باشد مشق او رسا و پختہ گردید۔ در گفتن قصیدہ و غزل مرزا رفیع راسلم میدارد و اکثر بہ صید معانی ہائے تازہ ہمت می گمارد۔۔۔۔ اکنوں از تہ دل بفقیر رجوع کلی دارد و در شستی اشعار درستش موقوف بر مشورہ ایں ہیچداں باعتقاد او افتادہ۔ اینہم خوبی اوست والا شاعریش از ہیچ صاحب طبیعتے در مرتبہ کمی نیست؛

تذکرہ[1] بہار سخن کے متعلق پروانہ نے ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء[2] انتقال فرمایا جیسا کہ مختلف تذکروں کے بیانات سے واضح ہوتا ہے۔ پروانہ فارسی شاعری میں رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ اردو غزل گوئی اور قصیدہ گوئی میں مرزا رفیع سودا کا تتبع کرتے تھے۔ وہ میر تقی میر، میر حسن اور مصحفی جیسے خدائے سخن کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے اور کبھی کبھی ان سے اصلاح بھی لیتے تھے۔

افسوس کہ ایسے باکمال شاعر کا دیوان نایاب ہے۔ وہ غالباً اسپرنگر صاحب کے ساتھ ہندوستان سے باہر ولایت کو چلا گیا ہے۔ گارساں دتاسی مؤلف "تذکرہ شعرائے اردو" کا اور نساخ مؤلف "تذکرہ سخن شعراء" کی نظر سے پروانہ کا دیوان گذرا

---

[1] بہار سخن مؤلفہ برق سیتاپوری ص ۹۶۔ [2] مخمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۱۰۲ پر پروانہ کا سال وفات ۱۸۵۱ء درج ہے جو غلط معلوم ہوتا ہے۔

تھا مگر ان لوگوں نے ان کا نمونۂ کلام لینے میں کوتاہ نظری اور بے پرواہی سے کام لیا ہے۔ گارساں دتاسی نے بایں ہمہ مدحت سرائی پروانہ کے محض سات شعر اور ایک قطعہ درج کیا ہے

نمونۂ کلام

مختلف تذکروں میں پروانہ کا کلام جو منتشر ہے اسے مجتمع صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پروانہ کا بہترین شعر جو ضرب المثل ہو گیا ہے یہ ہے ؎

جس نے دیکھا اسے کیا سجدہ
غرض اس بت نے بھی خدائی کی

اس غزل کے چند اور شعر یہ ہیں :-

عہد کیا کیا کئے اور قول و قرار — آہ تس پر بھی بے وفائی کی
ہم سے رکھ کر غبار خاطر میں — جا کے اغیار سے صفائی کی
اے دل زار تو ہی کر انصاف — ہے یہی طرز دل ربائی کی
دیکھ تو ہم سے راست بازوں سے — تو نے آخر یہ کج ادائی کی

(از بہار سخن)

ضعف ہے غش ہے ناتوانی ہے — بن ترے موت زندگانی ہے
کون مدفون ہے چمن میں صبا — جس کی تربت پہ گل فشانی ہے
پوچھتے اب ہو مرغ دل کا حال — کب تے وہ جنت آشیانی ہے

آپ نے رات چھپ کے پی ہے شراب
رنگ چہرے کا ارغوانی ہے
(از بہار سخن)

چشم بد دور پری ہے کہ کوئی حور ہے تو
سر سے پا تک جو تجھے دیکھے تو اک نور ہے تو
لاکھ تدبیر کریں بات کوئی آتا ہے
اپنے نزدیک تو اے جان بہت دور ہے تو
بحر ہستی میں ترا جسم ہے مانند حباب
تس پہ اکدم کی ہوا کھانے پہ مسرور ہے تو
اس کی ہم چشمی انھیں آنکھوں سے بس بس نرگس
تجھ کو بینائی سے بہرہ نہیں معذور ہے تو
تن بدن میں جو لگی آگ تو اے پروانہ
کیا کرے اپنے جلا دینے میں مجبور ہے تو
(از یادِ رفتگاں۔ جگر بریلوی)

یوں آگ دی جگر کو میں اس دل کے داغ سے
کرتے ہیں جوں چراغ کو روشن چراغ سے
بلبل ذرا تو دیکھ کہ گلچیں چمن میں آج
بُو کر رہا ہے گل کے تئیں کس دماغ سے
(از گلزار ابراہیم ؒ)

متفرق اشعار

کہتی ہے عندلیب چمن میں پکار کے
اپنے بھی دن پھریں جو پھریں دن بہار کے

اے دل تو نہ ڈر حلقۂ گیسوئے کسی کے
یہ سانپ ہیں کیلے ہوئے جادو سے کسی کے
دل یار سے اور درد مرے دل سے کہے ہے
جانے کا نہیں اب تو بیں پہلوئے کسی کے

کیا کیجئے ہمدم کہ اُسے دیکھ کے ہم تو
ہر چند سنبھالے رہے پر دل کو غش آیا
کرنے کو گیا قتل پہ خون بہتے جو دیکھا
ٹھہرا نہ گیا سامنے قاتل کو غش آیا

دیکھتے ہی ادس کو چہرے پہ کالی آگئی
زعفرانی رنگ جو تھا اس میں لالی آگئی

نسیم آہ نے شاید کسی کی تاثیر کی | شگفتگی سی ترے غنچۂ دہاں پر ہے
سدا ہے جام ہے شرمندہ چشم مست سے تیرے | صراحی بھی خجل ہے اس تیری تصویر گردن ہے
صادق نہ سمجھ اس کو محبت میں ہے کاذب | جو صبح نمط چاک گریباں میں نہیں ہے

(از تذکرۂ شعرائے ہنود۔ بشاش)

کوچۂ گیسو میں دل کو ڈھونڈھئے | کیا ہوا گر راہ کا کچھ پھیر ہے
تڑپتے جو دیکھی ہیں لاشیں تو دل اب | ترے کوچہ کو کربلا جانتا ہے

(از یادرفتگاں۔ جگر بریلوی)

قطعۂ تاریخ وفات جرأت

جو کہ کرتا ہے فکر شعر و سخن | اس زمانے میں وہ غنیمت ہے
کہ نہ اگلے سے لوگ ہیں باقی | وہ نہ مجلس ہے اور نہ صحبت ہے
اک سخن گو جو تھا قلندر بخش | نام جرأت ہے جس کی شہرت ہے
کر گیا کوچ اس مقام سے حیف | آج منزل نشیں حسرت ہے
ہے یہ تاریخ اول اور ثانی | کہو جنت نصیب جرأت ہے

(ماخوذ از تذکرہ گارساں دتاسی صـ۱۱۲)

اس قطعہ کی زبان جرأت سے ملتی جلتی ہے۔

خصوصیاتِ کلامِ پروانہ

جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہوتا ہے پروانہ کے کلام کی مابہ الامتیاز

خصوصیت عاشقانہ جذبات کی عکاسی ہے۔ حالانکہ یہ مصحفی کے شاگرد تھے۔ مگر انھوں نے مصحفی کے خشک رنگ کو غزل گوئی میں اختیار کرنے سے گریز کیا۔

یہ سودا کی نازک خیالیوں اور رنگینیٔ کلام کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ ان کے کلام کے نمایاں اوصاف بھی وہی ہیں جو سودا کے ہیں۔ خیالات کی نزاکت اور مضامین کی لطافت پر پروانہ جان دیتے تھے۔ وہ کلام میں نئی نئی تشبیہات استعمال کرنے سے بڑے شائق تھے۔ ان کی غزل میں پختگی و مشاقی کے آثار ملتے ہیں۔ زبان پر بھی ویسی ہی قدرت تھی جیسی سودا کو تھی۔ مجموعی حیثیت سے پروانہ کا کلام نہایت لطیف اور پُر اثر ہے۔

ایک بڑا وصف پروانہ کے کلام میں یہ ہے کہ ماحول لکھنؤ کے پروردہ ہوتے ہوئے بھی اس دبستاں کی پست مذاقی سے ان کا کلام پاک ہے۔ نہ تو ان کے عشق میں ہوس پرستی ہے اور نہ ان کا معشوق بازاری معشوق ہے۔ معشوق کے روایتی شان و وقار اور اس کی عزت و احترام کا انھوں نے شعرائے دہلی (سودا و میر) کی طرح کافی لحاظ رکھا ہے اور ان کے (شعرائے دہلی کے) نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا شمار اپنے زمانہ کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ پورا دیوان سامنے ہوتا تو ذرا تفصیل سے تبصرہ کیا جا سکتا تھا۔

۴۔ موجی رام موجی لکھنوی

منشی موجی رام موجی کے والد کا نام دیوان چھترپت رائے تھا اور وہ قوم کے کالیستھ سریواستو تھے۔ وطن لکھنؤ تھا۔ ان کے والد نواب حسین علی خاں خلف نواب سعادت علی خاں فرمانروائے اودھ کے یہاں ملازم تھے۔ منشی موجی رام خود قصبہ سانڈی میں قانون گو تھے۔ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے۔ بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ایک باکمال استاد اور صاحبِ تلامذہ تھے۔ ان کی تصانیف سے سات دیوان اردو فارسی کے ہیں۔ لکھنؤ کے نامور شاعر منشی دیا کرشن ریحاں موجی کے ہی شاگرد رشید تھے[1]

مصحفی منشی موجی رام کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں[2] "لالہ موجی رام موجی تخلص قوم کالیستھ سری باستبہ ساکن سانڈی جوان غریبؔ مہذب الاخلاق است۔ معرفت شیخ محمد عیسیٰ تنہا بحلقۂ شاگردی ایں عاصی در آمدہ شعر زبان ہندی و فارسی ہر دو میگوید۔ اگر لطافت اصلاح بہ فہمش در آمد بجائے خواہد رسید۔ عمرش سی و چہار سالہ خواہد بود۔"

دیوان دیا کرشن ریحاں اپنے استاد موجی کے کمالات اور فیض و کرم کا اعتراف[3] ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

---

[1] ماخوذ از تذکرہ شعرائے ہنود مؤلفہ بشاش ص ۱۲۵ اور بہار سخن ص ۲۴۳۔ [2] ریاض الفصحا مولفہ مصحفی ص ۳۰۲

موجی سے کر مشق فن شعر میں حاصل	ریحاں کوئی استاد پھر ایسا نہ ملے گا
ریحاں ہو نام شعر کا کم لکھنؤ سے کیا	موجی تو ہیں حیات اگر مصحفی نہیں
ریحاں فن شعر میں تھا استاد	موجی شاگرد مصحفی کا

نمونۂ کلام[۱]

مختلف تذکروں سے موجی کے کلام کو اخذ کر کے اور ترتیب دے کر ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

موجی کی مندرجہ ذیل رباعی بہت مشہور ہے۔ اسی ایک رباعی کی بدولت وہ دنیائے شاعری میں ابدیت کے مستحق ہیں۔

وصل بھی دیکھا جدائی دیکھ لی	حق نے جو صورت دکھائی دیکھ لی
دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار	جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

لطافتِ تشبیہ و استعارہ اور تصوف و تغزل

روئے صنم پہ کاکل پیچیدہ دیکھنا	خورشید حشر شام میں پوشیدہ دیکھنا
ایسے عارض کے مقابل لے مہ کامل نہ ہو	مہر کو جز زردیٔ رُو جس سے کچھ حاصل نہ ہو
اس ضعف پہ اٹھا ہی لیا میں نے کوہ غم	اے عشق ہمت تن کاہیدہ دیکھنا
کعبۂ دل کو مرے تو مت جلائے سوز عشق	یہ مقام یار ہے تجھ پہ بلا نازل نہ ہو
رشتۂ جاں ہے مرا ہر ایک تار گیسوئے دوست	بے دھڑک لے شانہ مت سلجھا گیسوئے دوست

[۱] ماخوذ از ریاض الفصحا صفحہ ۳۰۴ - صفحہ ۳۰۶ - تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۲۵ - سخن شعرا از نساخ صفحہ ۴۶۶ اور بہار سخن صفحہ ۴۴۳

جدت تخیل

ہم نے ابر گریہ صرصر نالہ سے بارہا
دریا کو دشت، دشت کو دریا بنا دیا

مضمون آفرینی اور شوخی و شگفتگی

تھکے گرد سے بھرے جو غریب الوطن کے پاؤں
شبنم دھلا رہی ہے نسیم چمن کے پاؤں

آئی جو اس کے آنے سے گلشن میں فصل گل
بلبل نے چوم چوم لئے گلبدن کے پاؤں

کھولی جو اس نے زلف گرہ گیر کی رسن
زاہد کے ہاتھ باندھ لئے برہمن کے پاؤں

مانی نہ ایک بات سحر تک شب وصال
میرا سر نیاز تھا اور سیم تن کے پاؤں

جاؤں گا تیشہ لے کے سوئے بے ستون اگر
ٹھہریں گے سامنے مرے کب کوہکن کے پاؤں

دلا کس منہ سے میں شکوہ کروں ان گلعذاروں کا
یہ ظالم اک نگہ میں خون کرتے ہیں ہزاروں کا

آوے جو صبا باغ میں گاہے ترے کو سے
بلبل کو ہو نفرت گل نوخیز کی بو سے

ترکش کرے اپنی اگر تم لگا چکے
ہم بھی نشان تیر بلا دل بنا چکے

اک زخم سے جو میں نہ مرا اس نے یہ کہا
کیا ایسے سخت جان پہ تلوار توڑے

خواب کو بھول گئے دیدۂ گریاں تجھ بن
جوہر آئینہ ہو جائیں نہ مژگاں تجھ بن

واں حنا بندی تھی اور زلف کو سلجھانا تھا
یاں پریشانی تھی اور خون جگر کھانا تھا

الفت نے کیا جان سے برباد ہمیں بھی
کیا دور کہیں لوگ جو فرہاد ہمیں بھی

کیا کہوں تجھ سے جو حالت مرے بیمار کی ہے
تا دم مرگ تمنا اسے دیدار کی ہے

پیش محمل اس لئے روتا چلا جاتا ہے قیس
تا نہ گرد دشت پائے ناقدراں سے اٹھ سکے

خصوصیات کلام موجی

موجی صرف نام کے موجی تھے۔ حقیقت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

ان کا کلام عموماً عاشقانہ جذبات پر مبنی ہے۔ جس میں کہیں کہیں مسائل تصوف کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ طرز بیان میں شوخی و شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ زبان پر اچھی خاصی قدرت معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی نزاکت اور مضمون آفرینی کی لطافت سے کلام خالی نہیں ہے۔ سب سے بڑا وصف ان کے کلام کا یہ ہے کہ وہ اس دور کے لکھنؤ کی شاعری کے عام معائب سے پاک ہے۔ انشا، مصحفی اور جرأت کے برخلاف انھوں نے سنگلاخ زمینوں کو اختیار کرنے اور نئے نامانوس قافیوں کو استعمال کرنے سے گریز کیا ہے۔ انھیں طولانی غزلیں یا ایک ہی طرح میں دوغزلہ اور سہ غزلہ کہنے کا خبط نہیں تھا جس سے ان کی غزلوں میں قافیہ پیمائی کا عیب نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے اپنے ماقبل دور کے شعراء (سودا، میر اور درد) کے معیار اور اعلیٰ مذاق شاعری کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام میں ابتذال کا شائبہ نہیں ملتا۔

اسلامی رہنماؤں سے عقیدت اس بات کی شاہد ہے کہ موجی وسیع النظر تھے اور دونوں کلچر کے اتحاد و امتزاج کے خواہاں تھے۔ ان کے حسب ذیل شعر سے یہ وصف ظاہر ہوتا ہے ؎

محشر کے دن وسیلہ شفاعت کا ہو مجھے ‌ ‌ ‌ ‌ موجی جو ہاتھ آئیں حسین و حسن کے پاؤں

دورِ سوم کی خصوصیات

۱۔ لکھنوی شاعری کا آغاز

دہلی سے صفِ اول کے شعراء کی مہاجرت لکھنؤ کے حق میں اچھی ثابت ہوئی۔ دبستانِ لکھنؤ انہی بزرگوں کی مہاجرت سے وجود میں آیا۔ میر و سودا اور مصحفی وغیرہ کی زندگی میں تو دہلی ہی کا بول بالا تھا۔ لکھنؤ کے نوجوان اور نو آموز شعراء کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنا الگ دبستاں بنائیں۔ لیکن دھیرے دھیرے اس کے لئے زمین ہموار ہو رہی تھی۔ خاص لکھنوی شعراء کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور رستے بھی نئے نکلتے آتے تھے۔

اس دور میں اردو شاعری مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار اور نوابانِ اودھ سے وابستہ ہو گئی۔ جس سے شعراء کی خودداری اور اظہارِ خیال کی آزادی جاتی رہی۔ شاعری حصولِ زر کا ایک ذریعہ بن گئی اور اس کا کام صرف رؤسا اور امراء کو خوش کرنا رہ گیا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ میں عیش و عشرت کی فراوانی اور لوگوں میں فارغ البالی تھی۔ لوگ رنگ رلیوں میں مست تھے۔ شاہدانِ بازاری کے ساتھ تعلقات پیدا کرنا عام شیوہ تھا۔ ناممکن تھا کہ اس ماحول کا اثر اردو شاعری پر نہ پڑتا۔ پس پردہ حسینہ کے بجائے اب ناچنے گانے والی بازاری عورتیں شعراء کے معشوق اور ان کے عاشقانہ تخیلات کا مرکز بن گئیں۔ شعراء محبوب کے نسائی خد و خال، کنگھی چوٹی اور چولی محرم کا کھلم کھلا

بیان کرنے لگے۔ جس سے شاعری میں ابتذال و شہوت پرستی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ حسرت، جرأت، انشاؔ اور رنگینؔ اس طرح کے مبتذل اشعار اور معاملہ بندی کے بڑے دلدادہ تھے۔ محبوب کے روایتی شان اور وقار اور اس کی عزت و احترام میں نمایاں فرق پڑ گیا۔ معشوق کے ہجر میں آہ و زاری کرنے اور اس کی بے وفائی و جفا شعاری کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کے بجائے شعراء اب اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے اور اس کی تغافل شعاری و بے وفائی پر سخت و سست سنانے لگے جس سے ان کے عشق کا معیار بہت پست ہو گیا۔ اس کے علاوہ انشاؔ و مصحفیؔ کی باہمی رقابت اور آپس کے نوک جھوک کی وجہ سے ان کے کلام میں ظرافت و تمسخر کی بھرمار ہو گئی۔ ان کا لہجہ بھی اکثر کرخت ہو گیا ہے جو غزل کے شایان شان نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری کا معیار گر گیا اور اس کا مذاق پست ہو گیا۔

۲۔ فن شعر کی ترقی اور شاعری کا تنزل

اس دور میں لکھنؤ میں شاعری کے پیچھے لوگ اتنے دیوانے ہوئے کہ مشاعرے گھر گھر اور روزانہ ہونے لگے۔ تعلیم یافتہ طبقے میں شعر گوئی کا شوق جنون کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ ایک ایک استاد کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ اکثر شاگرد استادوں سے غزلیں خرید کر مشاعروں میں پڑھتے تھے۔ انشاؔ و مصحفیؔ اور جرأتؔ ایسے اساتذہ اسی قابلیت اور شاعرانہ کمالات کے اظہار کے لئے بیشتر سنگلاخ زمینیں انتخاب کرتے تھے اور نئے و نامانوس قافیوں کو نظم کر کے اپنی جدت طبع دکھاتے تھے۔ طرح مشاعرہ میں پچیس تیس شعر کہہ کر جب طبیعت کو آسودگی نہ ہوتی تھی دو غزلہ اور سہ غزلہ کہتے تھے اور بھی ممکن

قافیوں کو نظم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک قافیہ کو مختلف انداز سے کئی بار باندھتے تھے۔ اس کثرت مشاقی، باہم مقابلہ اور رقابت کی وجہ سے جہاں ایک طرف فن شعر کی بڑی ترقی ہوئی وہاں دوسری طرف شاعری کی تنزلی بھی ہوئی۔ ان شعراء کی اکثر غزلوں میں قافیہ پیمائی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ ان کے کلام میں درد واثر، تصوف واخلاق اور فلسفیانہ وسنجیدہ مضامین کی بڑی کمی ہے۔

۳۔ جدت مضامین اور ندرت تخیل کی کمی

جدتِ مضامین اور ندرتِ تخیل کے لحاظ سے اس دور کی شاعری میں بہت کم ترقی ہوئی۔ قدما کے خیالات اور مضامین کو اس دور کے شعرا طرح طرح سے پیش کرتے ہیں۔ مگر خود کوئی جدت نہیں پیدا کرتے۔ ان کی نسبت مولانا آزاد نے کیا خوب فرمایا ہے[1]

"یہ لوگ ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طراری طبع بار متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ منھ تھک جائیں گے۔ مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے اور نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔ انھیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔"

۴۔ ریختی کا ایجاد و رواج

امراء کی پست مذاقی اور تعیش پسندی کے زیر اثر اس دور میں ایک جدید

---

[1] آب حیات ص۲۳۲

صنف شاعری "ریختی" وجود میں آئی۔ ریختی میں غزل عورتوں کی زبان میں کہی جاتی تھی۔ سعادت یار خاں رنگین اس نئی طرز کے موجد تھے مگر انشاء نے بھی اس میں کافی حصہ لیا۔

۵۔ زبان کی اصلاح و ترقی

فن شعر کی ترقی کے ساتھ اصلاح زبان کا کام اس عہد میں جوش و خروش کے ساتھ جاری تھا۔ بہت سے بھدے اور ثقیل الفاظ جو میر و سودا کے زمانہ میں باقی رہ گئے تھے زبان سے خارج کئے گئے اور ان کی جگہ فارسی و عربی کے نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان میں صفائی اور روانی پیدا ہو گئی۔ انشاء نے اردو زبان کی ترقی و توسیع کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ مگر مصحفی قدما کے پیرو تھے۔ ان کے کلام میں کچھ پرانے الفاظ مثلاً ٹک، نت، پون، نروز (بہت) ایدھر، انکھڑیاں، بولیاں، شرمائیاں، پوچھو ہو، جھگڑا، واچھڑے، بھلا رے، آئے ہے، جائے ہے، وغیرہ اب بھی باقی رہ گئے ہیں[1]

ایہام گوئی اس دور میں بالکل ختم ہو گئی۔ تشبیہہ و استعارہ اور فارسی الفاظ و ترکیب کی بھرمار بھی کم ہو گئی۔ کلام میں عموماً زبان کی سادگی، فصاحت اور روانی پائی جاتی ہے۔

۶۔ نظم نگاری کی ابتدا

حالانکہ نظم نگاری کی باقاعدہ اور مسلسل ترویج و ترقی دور جدید میں آزاد

---

[1] ملاحظہ ہو آب حیات ص۲۳۳، ص۲۳۵

اور حالی کے ذریعہ ہوئی۔ مگر شمالی ہند میں جس شاعر نے اس کی داغ بیل ڈالی وہ اس دور کے شاعر نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۹ء-۱۸۳۰ء) ہیں۔ دنیا کی بے حقیقتی اور زندگی کی بے ثباتی کا یقین دلانے کے لئے انھوں نے متعدد ناصحانہ اور واعظانہ نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں ہندو مذہب کی روایات اور تہواروں کے بیان کے علاوہ مقامی رنگ کافی ملتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے اپنی ساری توجہ بجائے غزل گوئی کے نظم نگاری پر صرف کی ہے۔

ہندو شعراء کے کلام کی خصوصیات

اس دور کے ہندو شعراء کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ لکھنوی شاعری کے عام معائب سے پاک ہے۔ ان کے کلام میں شہوت پرستی اور پست مذاقی کا شائبہ بہت کم ہے۔ ان کے اظہار عشق میں بوالہوسی اور عریانی نہیں پائی جاتی۔ ان کا معشوق کوئی بازاری عورت نہیں ہے۔ انھوں نے ریختی کہنا گوارا نہیں کیا بلکہ دور ماقبل کے شعراء دہلی کی طرح معشوق کے روایتی شان وقار اور اس کی عزت و احترام کا بخوبی لحاظ رکھا ہے اور غزل میں سودا و میر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔

حالانکہ لالہ کانجی مل صبا، راجہ جسونت سنگھ پروانہ اور منشی موجی رام موجی وغیرہ مصحفی کے شاگرد تھے۔ مگر انھوں نے شاعری میں ان کے خشک رنگ کو اختیار کرنے سے گریز کیا ہے۔ نثار، پروانہ اور موجی نے غزل گوئی میں سودا کا تتبع کیا ہے اور صبا نے میر کا۔ ان کے کلام میں درد و تاثیر، تصوف و اخلاق، سنجیدہ مضامین اور علوئے تخیل کی کمی نہیں ہے۔ انھوں نے کسی طرح میں نہ سنگلاخ زمین اختیار کی اور نہ دو غزلہ اور سہ غزلہ کہے۔ جس سے ان کا کلام بھرتی کے اشعار اور قافیہ پیمائی کے عیب سے بھی پاک ہے۔

دورِ سوم کے ہندو شعراء کی ادبی خدمات

منشی سدا سکھ نثار کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب شریمد بھاگوت کو نظم کی شکل میں پیش کرنا ہے۔

اردو کی یہ پہلی مربوط طولانی مذہبی نظم ہے جس میں پچاس ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اگر یہ اپنے زمانہ میں شائع ہوجاتی تو اسے ایک کا مرتبہ مل جاتا۔

لالہ کانجی مل صبا کے کلام میں میر کے سوز و گداز کا عکس بخوبی نظر آتا ہے۔ اگر عمر وفا کرتی تو وہ میر کی طرح ایک مشہور غزل گو شاعر ہوتے۔

راجہ جسونت سنگھ پروانہ کی ذات سے اردو زبان اور شاعری کی بڑی ترقی ہوئی۔ انھوں نے اردو ادب کی ترقی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ہندوؤں میں اردو کا عام مذاق پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ "تذکرۂ شعرائے اردو" میر حسن دہلوی کے مقدمہ میں مولوی محمد حبیب الرحمن شیروانی پروانہ کے متعلق فرماتے ہیں: "جو شعراء مصلح اور مروج اس زبان کے تھے اور جنھوں نے کریہہ الفاظ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کر دیا ان میں سب سے اول راجہ جسونت سنگھ پروانہ کا ذکر ہے"۔

موجی رام موجی بڑے عالم فاضل شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور ان دونوں زبانوں میں سات دیوان یادگار چھوڑے ہیں جو ان کی مشاقی، زورِ طبع اور قادر الکلامی پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ ایک باکمال اور صاحبِ فن استاد تھے۔ لکھنؤ کے مشہور شاعر دیا کرشن ریحاں موجی ہی کے شاگرد تھے۔ ریحاں نے

موجی کی استادانہ قابلیت کا اعتراف متعدد اشعار میں کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

موجی سے کرو مشقِ فن شعر میں حاصل ریحاں کوئی استاد پھر ایسا نہ ملے گا

ریحاں فن شعر میں تھا استاد موجی شاگرد مصحفی کا

ریحاں ہو نام شہر کا کم لکھنؤ سے کیا موجی تو ہیں حیات اگر مصحفی نہیں

دورِ سوم کے باقی ماندہ ہندو شعرا کی فہرست

(۱) بیخود (دہلی)۔ لالہ نراین داس شاگرد میر درد۔ طبقات الشعرا صفحہ ۳۰۸ ملاحظہ ہو۔

(۲) حسرت (دہلی)۔ ذوقی رام متوفی ۱۸۱۷ء بیشتر فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بہار سخن صفحہ ۱۳۷

چھٹا باب

اردو شاعری کا دور چہارم

ناسخ اور آتش کا زمانہ

(۱۸۲۴ء سے ۱۸۳۷ء تک)

دور سوم کے نمایندہ شعراء میں جرأت نے ۱۸۱۰ء میں، انشاء نے ۱۸۱۷ء میں اور مصحفی نے ۱۸۲۴ء میں انتقال کیا۔ ان کے بعد شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کا علم بلند ہوا۔ چونکہ دہلی اور لکھنؤ میں ان کے مقابل کا کوئی صاحب طرز شاعر نہ تھا اس لئے ۱۸۲۴ء سے ۱۸۳۷ء تک کا زمانہ ناسخ اور آتش کا دور کہلاتا ہے۔ آتش نے ۱۸۴۶ء میں انتقال کیا۔ اس لحاظ سے اس دور کی مدت ۱۸۴۶ء تک ہونی چاہیے تھی۔ مگر جب ناسخ نے ۱۸۳۸ء میں انتقال کیا تو آتش نے شعر گوئی ترک کر دی۔ اسی لئے دور چہارم کا زمانہ ۱۸۲۴ء سے ۱۸۳۷ء ہی تک متعین کیا جاتا ہے۔

دور چہارم کا سیاسی اور ادبی ماحول

شاہ عالم کی وفات کے بعد ان کے دوسرے فرزند اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۶ء میں لال قلعہ کے وارث اور برائے نام شاہانہ خطاب سے مفتخر ہوئے۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی سلطنت برطانیہ کے پنشن خوار رہے۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح شاعر تھے اور شعاع

تخلص فرماتے تھے۔ مگر فکر سخن کی طرف توجہ کم تھی۔ شعرار کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ممنون اور شاہ نصیر ان کے دربار کے شاعر تھے[1] انھوں نے ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا۔

دہلی میں اس دور میں صرف شاہ نصیر الدین نصیر ہی ایک نامور شاعر تھے۔ یہ اکبر شاہ ثانی کے دربار سے وابستہ تھے مگر شاہی انعام واکرام جب گذر بسر کے لئے کافی نہ ہوئے تو انھیں بھی کئی بار دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ دو مرتبہ لکھنؤ گئے اور کئی بار حیدر آباد۔ انشار اور مصحفی کے زمانے میں جب یہ لکھنؤ آئے تھے تو ان کی کافی قدر و منزلت ہوئی تھی مگر جب یہ دوبارہ ناسخ اور آتش کے زمانے میں لکھنؤ آئے تو ان کے کلام پر اعتراضات بھی کئے گئے۔ ان کی کلام کی خصوصیات کے متعلق ڈاکٹر رفیق حسین صاحب لکھتے ہیں[2]: "شاہ صاحب کی طبیعت دقت پسند واقع ہوئی تھی مشکل ردیفیں اور سنگلاخ زمینوں میں اشعار موزوں کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے مشق سخن اور زود گوئی کی بدولت جس قافیہ اور جس ردیف پر ہاتھ ڈالتے سیکڑوں شعر کہتے چلے جاتے لیکن لطف واثر نام کو نہ ہوتا"

دربار لکھنؤ

بادشاہ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد شاہ نصیر الدین حیدر ۱۸۲۷ء میں اودھ کے حکمراں ہوئے۔ امرار کی بری صحبتوں میں پڑکر یہ عیش پرست ہو گئے تھے۔ انھوں نے متعدد انگریزوں کو اپنی ملازمت میں رکھا تھا۔ ان میں ایک حجام تھا[3] جس کا

---

[1] تاریخ ادب اردو ص۲۰۵، [2] اردو غزل کی نشوونما از ڈاکٹر رفیق حسین ص۲۱۶، [3] لکھنؤ دی گارڈن آف انڈیا ص۱۹۱۔

اثر بادشاہ پر وزیر اعظم سے بھی زیادہ تھا۔ ان کو شاعری کا بھی شوق تھا چنانچہ بادشاہ تخلص کرتے تھے اور اکثر مرثیہ لکھتے تھے[1]۔ ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا۔

شیخ ناسخ اور خواجہ آتش اس دور کے لکھنؤ کے بہترین شعراء تھے۔ مصحفی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ آتش جیسا مایہ ناز شاگرد چھوڑ گئے۔ لیکن آتش نے مصحفی کے خشک رنگ کی تقلید نہیں کی۔ ناسخ حالانکہ مصحفی کے شاگرد نہ تھے مگر ان پر مصحفی کے کلام اور انداز بیان کا بڑا اثر پڑا۔ ناسخ نے زیادہ تر غزلیں، رباعیاں اور تاریخیں کہی ہیں۔ قصاید کا شوق نہ تھا۔ ان کے کلام کی خصوصیات کے متعلق مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں[2]: "غزلوں میں شوکت الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم۔ صائب کی تشبیہہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی دست کاری اور مینا نگاری فرمائی کہ بعض موقعوں پر بیدل اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے اور اردو میں وہ اس سے صاحب طرز قرار پائے۔ انھیں ناسخ کہنا بجا ہے کیونکہ طرز قدیم کو نسخ کیا۔ جس کا خود بھی انھیں فخر تھا۔"

رام بابو سکسینہ ناسخ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں[3]: "ناسخ تین چیزوں کے لئے مشہور رہیں۔ ایک ان کی قادر الکلامی جو ان کی غزلوں سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے وہ طرز جدید جو انھوں نے ایجاد کی۔ تیسرے ایک بڑی جماعت مشہور شاگردوں کی جن کو اپنے بعد چھوڑ گئے۔ لکھنؤ کے حلقۂ شعراء میں ان کا بڑا اثر تھا۔ کسی محاورے یا لفظ کی تحقیق کے متعلق ان کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا کلام حسن ظاہری سے تو آراستہ ہے مگر دلچسپی اور تاثیر سے خالی ہے۔ ان کی غزلیں شاندار الفاظ اور

۱۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۵۵۔ ۲۔ آب حیات صفحہ ۲۵۶۔ ۳۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۳۳۔

طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ ہوتی ہیں مگر جذبات و اثرات سے خالی ہیں۔ تصنع ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے۔ تشبیہیں اکثر نئی تو ہیں مگر عجیب ہوتی ہیں"

ڈاکٹر رفیق حسین ناسخ کے کلام کے نسبت لکھتے ہیں[۱] "ناسخ کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت ان کی نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے جس کو حقیقت، واقعیت اور صداقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف ان کی دماغی تخیل اور ذہنی اپج کے سوا کچھ نہیں" مثال میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا

کافی بس اس کو نشہ ہے بوئے شراب کا
ہو بوجھ جس کے ہاتھ میں ساغر حباب کا

کیا پڑ گیا ہے عکس تری چشم مست کا
نرگس کی شاخ بن گئی ہر موج آب میں

خواجہ آتش شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے۔ دونوں کے معتقد کثیر تعداد میں تھے۔ مشاعروں میں باہم مقابلے ہوتے تھے مگر وہ مصحفی اور انشا کی طرح کبھی ایک دوسرے کی ہجو اور فحش گوئی پر نہیں اترے۔ برخلاف وہ ایک دوسرے کے کلام کی قدر کرتے تھے۔ مولانا آزاد آتش کے طرز کلام کے متعلق فرماتے ہیں[۲] "جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورہ اردو کا دستور العمل ہے اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیئے ہیں۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی"

آتش اور ناسخ کا مقابلہ کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں[۳] "حق یہ ہے

۱۔ اردو غزل کی نشو ونما ص۲۰۳ ، ۲۔ آب حیات ص۳۸۹ ، ۳۔ تاریخ ادب اردو ص

کہ بندش کی چستی، الفاظ کی حلاوت اور مضمون کی بلندی میں آتش کو ناسخ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے۔ آتش کے یہاں الفاظ شیریں اور مزیدار ہوتے ہیں بخلاف ناسخ کے کہ ان کو موٹے موٹے الفاظ کا شوق ہے۔ آتش کے اشعار نیچرل ہوتے ہیں۔ ان میں بے تکلفی اور ناسخ کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ صوفیانہ مضامین بہ نسبت ناسخ کے آتش کے یہاں بہت زیادہ ہیں۔ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر ترجیح ہے۔"

ڈاکٹر رفیق حسین آتش کی نسبت فرماتے ہیں[1] "حقیقت تو یہ کہ اس دور کے تمام شعراء عالم بالا اور تحت الثریٰ کی سیر کرنے کے عادی ہیں وہ آتش ہوں یا ناسخ یا شاہ نصیر یا اور کوئی ہو۔ صرف فرق اتنا ہے کہ آتش کی بلند پروازی اوروں کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس ہوتی ہے اور مبالغہ کی سرحد سے ذرا الگ رہتی ہے۔ اس دور کے شعراء میں اگر کسی نے جذبات نگاری کی طرف زیادہ توجہ کی تو وہ آتش ہیں۔"

آتش کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

عاجز نواز دوسرا تجھ سا نہیں کوئی
مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا

موسیٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی
فرعون کو تو نے غرق کیا رود نیل کا

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے جو دیوانہ ہے اس کا

طبل و علم و پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

---

[1] اردو غزل کی نشو و نما ص ۳۲۵

نہ گور سکندر ہے نہ قبر دارا مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے
تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

دور چہارم کے ممتاز ہندو شعراء

اس دور میں ہندوؤں میں صرف تین شعراء نے خاص شہرت حاصل کی۔ دہلی میں منشی خوب چند ذکا نے، لکھنؤ میں پنڈت دیاشنکر کول متخلص بہ نسیم نے اور حیدرآباد میں مہاراجہ چندولال شاداں نے۔ ان کے سوانح حیات اور نمونہ کلام وغیرہ اگلے صفحات پر ملاحظہ ہوں۔

۱۔ خوب چند ذکا دہلوی

"ذکا۔ خوب چند دہلوی کایستھ ماتھر ساکن حویلی جگل کشور معروف گھنٹہ والی چاندنی چوک۔ شاگرد رشید شاہ نصیر دہلوی۔ ایک بہت بڑا تذکرہ معروف بہ "عیار الشعراء" انھوں نے تالیف کیا تھا۔ جس میں چار پانچ ہزار اردو گو شعراء کا حال قلمبند کیا تھا۔ استعداد علمی معقول تھی۔ ملازمت پیشہ اور صاحب دیوان تھے مگر وہ سب ذخیرہ ان کی اولاد کی غفلت سے ضائع ہو گیا۔ اس کی ایک نقل ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل دہلی کالج کے پاس تھی۔ ممکن ہے کہ جرمنی میں ہو۔ ان کا دیوان راقم تذکرہ کے پاس موجود ہے۔ قدیم الفاظ ادتے، بھرے، ہوئیگا، جنے، کیدھر ان کے کلام

میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔[1]

ذکا کے متعلق حکیم قدرت اللہ خاں قاسم مجموعہ نغز میں تحریر فرماتے ہیں: "ذکا تخلص لالہ خوبچند است وے سکندر آبادی الاصل وجہان آبادی المولد خلف لالہ... چند نبیرہ رائے سلامت رائے کالیستھ ماتھر است کہ بعمدگی ایام بسر می بردند در افراط تفریطے کہ بہنگامہ افاغنہ ابدالی بحضرت دہلی دردادا کثرے از نیکانش بہ پاس ناموس عیال خود را جوہر نمودہ خود معرض ہلاک در آمدند۔ بعضے از نسواں بلحاظ عصمت بچاہ افتادہ جان بجان بخش دادند... بہر کیف ایں لالہ خوب چند بہرہ از سخن سازی وانشا پردازی و (سیاق وغیرہ از فنون) متصدی گری دارد، شعر خود بہ باصلاح محمد نصیر الدین نصیر میر ساند۔ دیوانے مشتمل اکثر انواع سخن جمع نمودہ وتذکرہ ہم تالیف نمودہ۔ از شاگردان وے گوے سبقت ربودہ۔"[2]

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے تذکرہ مجموعہ نغز میں ذکا کے پچیس شعر اور لالہ سری رام نے خمخانہ جاوید جلد سوم میں ۱۰۳ شعر درج کئے ہیں۔ ان دونوں تذکروں کے منتخب اشعار یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

عاشقانہ کلام

بس نہیں چلتا کہیں زور آور دل سے اے ذکا — یار دل کو لے گیا میں سر پٹک کر رہ گیا

گہہ خیال زلف گہہ یاد رخ گلفام کر — یوں خیال یار میں اے دل سحر کو شام کر

کوئی ٹھکانا مقرر نہ کوئی در اپنا — جہاں ہے یار ہمارا وہیں ہے گھر اپنا

ہے آپ کا قیامت گلشن میں مسکرانا — لیتے ہیں جی نکالے ہر ایک کلی کلی کا

---

[1] خمخانہ جاوید جلد سوم صفحہ ۲۳۶، [2] مجموعہ نغز صفحہ ۲۰۹، صفحہ ۲۶۰

ہاتھوں[1] سے مرے یار دمینا و جام لینا — بے ہوش نشہ میں ٹک مجھ کو تھام لینا

ہوا ہے ابر ہے گلگشت ہے اور سبزہ ہے سبزہ — سوال جام ہے ساقی ہمارا آج رد مت کر

چشم میں سرمہ کی تحریر تو ظالم مت کھینچ — ہے قیامت تری اس خنجر خونخوار کی نوک

مریض عشق کو صحت اگر ہووے تو میں جانوں — کرے لاکھوں دوا لیکن اثر ہووے تو میں جانوں

رُخ تاباں پہ چھوڑو گیسوئے عنبر رنگ کو اپنے — قیامت تک پھرے پیارے سحر ہووے تو میں جانوں

نہیں جام مے گلنار کی حاجت کچھ لے ساقی — تصور میں تری آنکھوں کے ہم مخمور رہتے ہیں

دل و جاں سے معتقد ہیں اسی کے — صنم کو ہم اپنا خدا جانتے ہیں

جلوہ گر وہ خوب رو ہوتا ہے گر بازار میں — رستے رہتے بند ہیں دردو پہر بازار میں

ذکا خیال ترا کیا کسی طرف آئے — لگا رہے ہے ترا جی تو یار جانی میں

کس کی دیکھی چشم مخمور لے ذکا — خود بخود آنے لگیں انگڑائیاں

ہر طرف خوبرو ہیں جلوہ نما — کب تلک دل کی پاسبانی ہو

گھر سے ٹک اپنے نکل شوخ ستم گر باہر — منتظر بیٹھے ہیں عاشق ترے در پہ باہر

کیوں نہ ہو اس پہ اک جہاں عاشق — جبکہ یہ حسن اور جوانی ہو

شعلۂ شمع کا یہ دود نہیں جلوہ نما — کھولے بیٹھی ہے لٹا اپنی فرنگن سر پہ

ہے لطف میکشی کا اسی وقت ساقیا — بیٹھے ہوں جبکہ یار برابر کے آس پاس

جلوہ گر ہے جو لب بام پیارا اپنا — ہے بلندی پہ ذکا آج ستارا اپنا

ہزار افسوس وہ بیگانہ نکلا — جسے سمجھے تھے اپنا آشنا ہم

---

(۱) ذکا کا یہ شعر مرزا سودا کے مندرجہ ذیل شعر کی یاد تازہ کرتا ہے —

کیفیت چشم کی اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

نہ کیجے اس قدر بیگانگی آپ — کبھی تو تھے تمہارے آشنا ہم
خیال آتا نہیں اتنا بھی ہرگز — کہ آئے کیوں تھے اور کرتے ہیں کیا ہم
مے گلنار کا پی کر پیالہ — ذکاؔ سب فکر دیتے ہیں بھلا ہم

پند و اخلاق

کہیں مدہوش ہووے گا بہت مت پی ذکاؔ اسکو — مئے گلگوں نہیں یہ دیو ہے نادان شیشے کا
ذکاؔ قسمت پہ شاکر رہ نصیحت تجھ کو کرتا ہوں — کسی کے جاہ و حشمت پر ارے ناداں حسد مت کر
کر بنائے زندگی پر اپنی اے منعم نظر — فکر کیا کرتا ہے ناداں ہر گھڑی تعمیر کا
کسی کا دل کوئی بیدرد گر ستاوے گا — تو عاقبت میں کبھی آرام وہ نہ پاوے گا
جو توبہ کی ہے تو مجلس میں میکشوں کے نہ جا — کہ خواہ مخواہ پیالہ کوئی پلا دے گا

سوز و گداز

ہونا تھا جو کچھ مرض کا انجام ہو چکا — رخصت کرو طبیب کو یاں کام ہو چکا
آنکھیں کھلیں رہی تھیں کس واسطے ذکاؔ کی — کیا جانے مرتے دم تک تھا انتظار کس کا
لکھوں تھا خط میں تجھ سے کے دلربا کاغذ — اٹھا قلم سے یہ شعلہ کہ جل گیا کاغذ
روتا ہوں اے پیارے اس واسطے میں ہر دم — مٹ جائے تیرے دل سے تا سب غبار دل کا
غم کے ہاتھوں تنگ ہوں یارب بتا جاؤں کہاں — آسماں تو دور ہے اور سخت پتھر ہے زمیں
نقش پا خالق گیتی نے بنایا ہم کو — جس کے قدموں سے لگے اس نے مٹایا ہم کو
بیکسی پر نہ جلا میرے کسی دوست کا دل — کوئی تربت پہ دیا بارنے والا نہ رہا
اب تو اس بت سے ہم ہوئے ہیں جدا — دیکھئے کب خدا ملا دے گا
عمر رفتہ نے پھر گذر نہ کیا — گئی ایسی کہ منہ ادھر نہ کیا

حیرت سے بن گیا ہے تصویر اب سراپا
کوئی کچھ کہو ذکا کو چپکا سنا کرے گا

اے ہم نشیں تو یار کا ذکر کمر نہ کر
بھولے ہوؤں کو راہ عدم کی خبر نہ کر

نکلے ہے اشک چشم سے میرے ٹپک ٹپک
ساغر سے مئے یہ گر گئی آخر چھلک چھلک

حال یکساں ہے سدا اپنے دل دلگیر کا
یا الٰہی دل ہے یہ غنچہ ہے یا تصویر کا

دیگر اشعار

جواب خط سے میں گذرا خبر تو لو یارو
گلی سے یار کی قاصد ابھی پھرا کہ نہیں

یہ کوہ عشق تو فرہاد سے بھی اٹھ نہ سکا
ذکا کی تاب ہے کیا جو اسے اٹھاوے گا

جنبش ابرو سے اس کے ہل گئی یکسر زمیں
جس طرح بھونچال سے کرنے لگے تھرتھر زمیں

جام مئے دے ساقیا یہ ابر و باراں پھر کہاں
ابر و باراں گر ہوا تو بزم یاراں پھر کہاں

بے گنہ ہرگز کسی کو قتل اے ظالم نہ کر
آدمی ہوتا ہے پیدا آہ ناداں پھر کہاں

گذارہ کس کے گھر میں ہو کسی انسان قابل کا
ذکا اب قدر دانوں کی ہوئی برباد سرکاریں

صبا کرنا ہوا خواہی سے ٹک آگاہ بلبل کو
کہ آئے ہے خزاں رکھ کوئی دم آغوش میں گل کو

رخ پہ قطرے ترے گرمی کے عرق سے چھوٹے
روز روشن میں یہ بے وجہ ستارے ٹوٹے

سیہ بختی نصیب اپنے زیادہ اس سے کیا ہوگی
کہ دست غیر میں پیارے ترے زلفوں کا شانہ ہے

ملے ہرگز نہ جیتے جی کبھو پھر دلربا تجھ سے
عجب کمبخت ساعت سے ہوئے تھے ہم جدا تجھ سے

نہیں ہے غم کسی کا عیش و عشرت کی باتیں ہیں
بغل میں یار ہے برسے ہے مینہ ساون کی راتیں ہیں

اگر خواہش ہو تجھ کو دیدۂ بیدار ہو پیدا
تو آئینہ بنا دل کو کہ شکل یار ہو پیدا

تجربات دنیوی

سمجھا جسے میں دوست ہوا وہ ہی مخالف
اخلاص کسی کا بھی مرے کام نہ آیا

آوارہ و بدنام ہوا قیس ہی آخر | لیلیٰ پہ کسی بات کا الزام نہ آیا
اہل دنیا کو رہے ہے رات دن دنیا کی یاد | اس قدر فرصت کہاں ہے جو کرے عقبا کی یاد
نہیں خوشی کا یہاں اب تو نام سو سو کوس | گیا وہ ساقی و مینا و جام سو سو کوس
آگیا وہ دور کوئی فکر سے خالی نہیں | ہو گئی عنقا کہیں عالم میں خوش حالی نہیں

فلسفیانہ

آسیا جبکہ چلے سر پہ ذکا نیند کہاں | ہاتھ سے چرخ کے ڈھونڈھے ہے تو آرام کہیں

دہلی کی تعریف میں

شہر دہلی نہ کہو ہے یہ عزیز فردوس | پوچھئے کیا ہو عمارت و مکاں کی تعریف
سیر کرتا ہو کبھی اس کی تو بے ساختہ بس | منھ سے نکلے ہے مرے شاہجہاں کی تعریف
ارادہ گر کسی کے دل میں ہووے سیر جنت کا | تو دیکھے اک نظر آکر جہاں آباد کی گلیاں

شہر دہلی بھی اک تماشہ ہے | آٹھ دن نو طرح کے میلے ہیں

اپنی معاشرتی زندگی کے متعلق ذکا فرماتے ہیں ؎

گرہ میں کیا ہے میرے میں ہوں ذات کا کالیتھ
پڑے ہیں ایک دو شیشے شراب کے گھر میں

جیسا کہ اشعار مندرجہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے ذکا کے کلام کا نمایاں رنگ عاشقانہ ہے۔ تخیلات و جذبات میں لطافت اور رعنائی پائی جاتی ہے۔ اشعار میں واقعیت و صداقت ہونے کے باعث زور و تاثیر کی کمی نہیں ہے۔ عاشقانہ رنگ کے علاوہ ان کے کلام کی دوسری خصوصیت سوز و گداز ہے۔ اس موضوع پر بھی انھوں نے اچھے شعر کہے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کا کلام ستھرا اور پاکیزہ ہے۔ فصاحت

زبان، لطافت روزمرہ و محاورہ اور ندرت تشبیہ کے ساتھ تغزل کی چاشنی خوب ملتی ہے۔ ذکا اپنے وقت کے ایک نامور اور باکمال شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت میں صرف کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اردو شعراء کا ایک بہت بڑا تذکرہ "عیار الشعراء" لکھا ہے۔

۲- پنڈت دیاشنکر کول نسیمؔ لکھنوی

اردو شاعری میں پنڈت دیاشنکر نسیم اور پنڈت برج نرائن چکبست نے جو ابدی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے وہ سب پر آفتاب جہاں تاب کے مانند روشن ہے۔ پنڈت دیاشنکر نسیم کو عموماً لوگ ایک اعلیٰ پایہ کا مثنوی نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ وہ اپنی معرکتہ الآرا مثنوی گلزار نسیم کی وجہ سے عام و خاص میں مشہور رہیں۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ نسیم ایک اچھے غزل گو بھی ہوئے ہیں۔ نسیم کی مثنوی نگاری کا ذکر آگے چل کر مثنوی کی صنف میں کیا جائے گا۔ یہاں ہم نسیم پر بحیثیت ایک غزل گو کے نظر ڈالیں گے۔

حالات زندگی[۱]

شاعر باکمال و سخنور نازک خیال پنڈت دیاشنکر کول المتخلص بہ نسیم لکھنوی

---

[۱] مضامین چکبست ص ۱۲۳، ۱۲۴۔

۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے پدر بزرگوار کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔
لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ کہتے ہیں کہ وجاہت جس کے لئے اہل خطہ کشمیر مشہور ہیں
ہیں ان کا حصہ نہ تھی۔ یہ پست قامت، گندمی رنگ، سیہ چشم اور چھریرے بدن
کے آدمی تھے۔ عام دستور کے مطابق اردو فارسی کی تعلیم صغرسنی میں پائی تھی۔
شعرائے اردو فارسی کا کلام نظر سے گذرتا رہا۔ خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے
شاعری کا شوق دلایا۔ غرض کہ بیس برس کی عمر میں شعروسخن کا خاصہ اچھا مذاق
پیدا کر لیا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی گرمیٔ سخن اور آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا
کہ ان کی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں غزل گوئی کا شوق رہا۔ لیکن جو دل
کا ولولہ تھا وہ غزل میں نہ نکل سکا اس لئے مثنوی کے کوچہ میں قدم رکھا گل بکاولی
کا قصہ جو کہ نثر میں تھا اس کو نظم کے سانچے میں ڈھالا۔ پچیس برس کی عمر میں یہ
مثنوی تیار ہوئی۔ چونکہ گلہائے مضامین سے پُر تھی۔ لہذا نام "گلزار نسیم" رکھا۔

گلزار نسیم کو طبع ہوئے صرف چار سال کا زمانہ گذرا تھا کہ دفعتاً ہیضہ کی
بیماری میں مبتلا ہو کر محض ۳۲ سال کی عمر میں ۱۸۴۳ء میں وفات پائی۔ انگریزی
زبان کے مشہور شعرا شیلی اور کیٹس کی طرح نسیم نے اپنی مختصر حیات میں وہ غیر فانی
شہرت حاصل کر لی جو اپنی لمبی حیات کے باوجود بہت کم شعرا حاصل کر سکے۔

نسیم کی قناعت اور ان کا جذبۂ خودداری

نسیم کے مزاج میں آزادی اور بے باکی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی دنیا
کے مال و دولت کی تمنا نہ کی۔ گو کہ بہت سے اہل کشمیر اس زمانے میں عہدہ ہائے

جلیلہ پر مامور تھے اور دربار شاہی میں ان کی رسائی تھی۔ اور انھوں نے کئی مرتبہ نسیم سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کو دربار شاہی تک پہنچائیں اور ان کے منصب و جاگیر کی فکر کریں مگر اس شہنشاہ سخن نے دوات و قلم کو طبل و علم پر ترجیح دی اور دنیا کی شان و شوکت کی طرف رخ نہ کیا۔

ایک مرتبہ امجد علی شاہ کے سامنے ایک طوائف نے نسیم کی وہ لاجواب غزل گائی جس کا مطلع ہے ؎

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی　　کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

جب اس مرصع غزل کا یہ مقطع گایا ؎

جاں نکل جائے گی تن سے اے نسیم　　گل کو بوئے گل ہوا بتلائے گی

تو سخن شناس بادشاہ نے کہا "کیا یہ غزل اس نسیم کی ہے جو گلزار نسیم کا مصنف ہے؟" اس نے کہا "ہاں" یہ سننا تھا کہ ارشاد ہوا کہ اس سخنور باکمال کو دربار شاہی میں حاضر کرو۔ حریفوں نے کہا کہ حضور نسیم کا تو انتقال ہو گیا[1] اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد نسیم کا واقعی انتقال ہو گیا۔ مرنے کے دو تین گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا تھا ؎

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو بلکہ اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بار تھم تھے مرکے وبال دوش ہوئے

نسیم کی ظرافت و بذلہ سنجی

نسیم بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے۔ تیزی ذہن و ذکاوت طبع کا عجیب

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۱۵۰

عالم تھا۔ حاضر جوابی تیغ زبان کا جوہر تھی۔ انھیں صفات خاص نے ان کا وقار حجھر شعرا میں قائم کیا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ نے شعر و سخن کا ایسا عروج دیکھا کہ باید و شاید۔ آتش و ناسخ کی جادو کار طبیعتیں اپنا زور دکھا رہی تھیں۔ انیس و دبیر فن مرثیہ گوئی کو عرش پر پہنچا رہے تھے۔ خواجہ وزیر، صبا، رند و خلیل وغیرہ کی نوجوان اور شوخ طبیعتیں ایک طرف قیامت برپا کر رہی تھیں۔ اس زمانے میں ایک ہندو شاعر کے لئے شعرا کے زمرہ میں اپنا وقار قائم کرنا آسان کام نہ تھا لیکن نسیم نے اپنے گلہائے مضامین کا سب کو ہزار جان سے شیدا بنا لیا۔ ایسے ایسے معرکے جیتے کہ دھاک بیٹھ گئی۔[1]

ایک مشاعرے میں نسیم نے مطلع پڑھا ؎

منت دلا کسی کی نہ اصلا اٹھائیے
مرجائیے نہ ناز مسیحا اٹھائیے

آتش بھی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ انھوں نے نسیم کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میرا مطلع اس کے آگے گرد ہے۔ مطلع آتش ؎

جاں بخش لب کے عشق میں ایذا اٹھائیے
مرجائیے نہ ناز مسیحا اٹھائیے

خصوصاً نسیم کی حاضر جوابی و موزونی طبع کے سب قائل تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہیں مشاعرے کی صحبت تھی۔ یہ بھی وہاں موجود تھے۔ مشاعرہ شروع کرنے کے قبل شیخ ناسخ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت صاحب ایک مصرع کہا

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۱۵۱

ہے دوسرا مصرع نہیں سوجھتا کہ شعر پورا ہو جائے۔ انھوں نے جواب دیا کہ فرمائیے۔ ناسخ نے مصرع پڑھا ع

شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا

ان کے منہ سے یہ مصرع نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرع تیار تھا۔ ع

تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

اس مصرع کا سننا تھا کہ حاضرین جلسہ پھڑک اٹھے۔ ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔

ایک روز آتش کے یہاں شاگردوں کا جمگھٹ تھا۔ رند، صبا، خلیل وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ نسیم بھی موجود تھے۔ صبح کا سہانا وقت، برسات کا موسم، مینہ برستا ہوا عجیب کیفیت تھی۔ موسم بہار نے کچھ ایسی طبیعتیں مست ہوئیں کہ شاگردوں نے آتش سے فرمائش کی کہ استاد اس وقت ایک غزل کہہ ڈالئے۔ گو کہ آتش کا بڑھاپا تھا مگر طبیعت میں جوانی کا زور بھرا تھا۔ فی البدیہہ اشعار موزوں کرنے شروع کر دیئے اور کہا کہ لکھتے جاؤ جس غزل کا مطلع یہ ہے ۔

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

وہ اسی موقع کی کہی ہوئی ہے۔ نسیم کی طبیعت بھی جوش بہار سے لہرائی ہوئی تھی انھوں نے ان اشعار کی تخمیس کرنی شروع کر دی۔ جتنی دیر میں آتش دوسرا شعر سوچتے تھے یہ اس عرصہ میں ان کے پہلے شعر پر تین مصرعے لگا چکے تھے۔ اور بعض بعض مصرعے تو واقعی اس انداز سے لگائے ہیں کہ اگر کوئی برسوں فکر میں سر بگریباں لیے

تو اس سے بہتر مصرع نہیں لگا سکتا۔ آتش کے ایک شعر کی تخمیس مثالاً لکھی جاتی ہے ؎

نہ زخمی بدن ہیں نہ بسمل ہوئے ہیں
نہ خونی کفن ہے نہ گھایل ہوئے ہیں
تمھارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
لہو مل کے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

اسی طرح چودہ پندرہ اشعار پر مصرع لگائے۔ جب آتش نے غزل ختم کی تو صبا، رند و خلیل کے چہروں کے رنگ فق تھے۔ ابھی تک یہ لوگ اپنے تئیں اہل زبان خیال کرتے تھے اور نسیم کو ہندو سمجھ کر زیادہ وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن اس روز سب لوہا مان گئے کہ موزونیٔ طبع ہو تو ایسی ہو اور مضمون آفرینی کا مادہ ہو تو ایسا ہو۔[1]

آتش کے شاگردوں میں صبا اور نسیم میں بہت یارانہ تھا۔ ان کے مرنے پر صبا نے یوں اظہار غم کیا ؎

اے صبا وہ ہوائے باغ نہیں
اٹھ گئے ہیں نسیم جس دن سے

نسیم کی غزل گوئی

نسیم کی غزلوں کا دیوان مختصر اور ناتمام ہے۔ ان کی بہت سی غزلیں جو تلف ہو گئیں اس میں شامل نہ ہو سکیں۔ مگر ان کا مختصر دیوان بہ تقاضائے مختصر حیات واقعی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جانے کے لائق ہے۔ ذیل میں نسیم

[1] مضامین چکبست صفحہ ۱۵۳، ۱۵۴

کی غزلوں کا انتخاب مندرجہ ذیل دو کتابوں سے پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) گلزار نسیم معہ انتخاب دیوان نسیم مرتبہ پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی۔

(۲) یادگار نسیم مرتبہ مولانا اصغر صاحب اصغر گونڈوی۔

مضمون آفرینی و تناسب لفظی

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی — کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی
جب ملے دو دل مخل پھر کون ہے — بیٹھ جاؤ خود حیا اٹھ جائے گی
گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا — شاخ گل اک روز جھونکا کھائے گی
جاں نکل جائے گی تن سے لے نسیم — گل کو بوئے گل ہوا بتلائے گی

تخم نہ بن کر خود غرض ہو جائیے — مثل ساغر اور کے کام آئیے
ابر رحمت سنتے ہیں نام آپ کا — خاکساروں پر کرم فرمائیے
جوہر تیغ نگہ کھل جائے گا — منھ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

منت دلا کسی کی نہ ہرگز اٹھائیے — مر جائیے نہ ناز مسیحا اٹھائیے
کیسا حجاب کیسی حیا اور کہاں کی شرم — پردہ سے ہاتھ سے پردہ اٹھائیے
جلئے مگر چنار کے پنجہ کی طرح سے — پھر دعا نہ دست تمنا اٹھائیے
لے جان دل جلا کے نہ لیجے کسی کی آہ — آنچ آتی ہے جو آگ سے شعلہ اٹھائیے
کیا کیا حسیں چنے ہوئے مٹی میں مل گئے — افشاں سمجھ کے خاک سے ذرہ اٹھائیے
ہم سے سوا ہیں غیر ہوا خواہ واہ واہ — ہوتے ہوئے نسیم کے پنکھا اٹھائیے

کسی کے دل سے نہ یارب کوئی خراب گرے — نہ شیشہ طاق سے نے شیشے سے شراب گرے
کہوں جو اپنی میں افتاد بزم ساقی میں — سبو سے بادہ گرے سیخ سے کباب گرے

بے رخ ہے وہ پری دل دیوانہ کیا کرے
روروکے آنکھ بھرتی ہے پیمانہ کیا کرے

دست و زبان و دیدہ و دل دیتے ہیں دغا
کرتے ہیں وہ یگانے کہ بیگانہ کیا کرے

صفائی زبان و روانی کلام

کیوں خفا رشک حور ہوتا ہے
آدمی سے قصور ہوتا ہے

خاکساری وہ ہے کہ ذرّوں پر
روز باران نور ہوتا ہے

جس کو دیکھا وہ اس زمانہ میں
اپنے نزدیک دور ہوتا ہے

بندش الفاظ و تناسب لفظی اور واقعیت

چمن میں دہر کے آکر میں کیا نہال ہوا
برنگ سبزہ بیگانہ پائمال ہوا

مجنوں کی چاک زنی نے اثر کیا واں بھی
جو خط میں حال لکھا تھا سو خط کا حال ہوا

عشق میں دل بن کے دیوانہ چلا
آشنا سے ہو کے بیگانہ چلا

بوئے گل غنچہ سے کہتی ہے نسیم
بات نکلی منہ سے افسانہ چلا

کان میں سب کے اپنی بات نہ ڈال
آبرو مثل آب گوہر ہے

کیا مخالف ہے اس چمن کی ہوا
خار دیتا ہے جو گل تر ہے

اب تو جاتے ہیں اس گلی میں نسیم
ہو رہے گا جو کچھ مقدر ہے

مضمون آفرینی

دوزخ و جنت ہے اب میری نظر کے سامنے
گھر رقیبوں نے بنایا اس کے گھر کے سامنے

عشق کے رتبے کے آگے آسماں بھی پست ہے
سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

گم ہوا سینے میں جب دل چشم گریاں کیا کرے
گھر میں جو کھویا اسے خضر بیاباں کیا کرے

چشم گریاں کر سکے کیا آہ سوزاں کا علاج
آتش برق دماں کو آب باراں کیا کرے

شریکِ بزم ہوئے ہو تو دور کیجے حجاب — جو نکلے ناچنے تو کیا لحاظ گھونگھٹ کا
وہ گلعذار جو یاد آگیا چمن میں نسیم — تو آنکھ میں گلِ تر خارِ خشک سا کھٹکا

شوخی و بذلہ سنجی

بتوں کو جو دیکھا گنہ کیا ہمارا — خدائی خدا کی تماشا ہمارا
بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جائے — یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

تصوف

بتخانہ کا پابند نہ کعبہ سے تعلق — آزاد ہے قید دل سے گرفتار تمہارا
کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ — بند کی آنکھیں تو رستا کھل گیا

واقعیت و حقیقت بیانی

کل تک جو شمعِ محفلِ عیش و نشاط تھے — جلتا نہیں چراغ بھی آج ان کے گور پر
قرار پر نہ ملا اضطراب. ہو کہ نہ ہو — شراب غیر کو درد دل کباب. ہو کہ نہ ہو
جس قدر وصل بتاں کا متقیں رہتا ہے فراق — اے نسیم اتنی کبھی یاد خدا آتی ہے
چشم نم ہو تو امڈ آتے ہیں دریا منھ پر — کھینچیے آہ تو آتا ہے کلیجہ منھ پر
خواب گونگے کا ہوا یار کا شکوہ گویا — دل میں پھرتا ہے مگر لا نہیں سکتا منھ پر
خود چلا ہر قدم پہ کہتے نسیم — ٹھہر تو نامہ بر کہوں گا کچھ
منزل سے دور رکھتا ہے خواب سحر نسیم — کھول آنکھ دیکھ باندھ چلے ہم سفر کمر

جذبۂ خودداری

ذلت ہے جو پھیلائے بشر پیش بشر ہاتھ — یارب نہ کبھی ہاتھ کا ہو دست نگر ہاتھ
نام پر حرف نہ آنے دیجے — جاں اگر جائے تو جانے دیجے

کیا ملا عرض مدعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے
میں وہ بے آس ہوں کہ تیرے پاس
یاس آئی ہے آسرا کر کے

فلسفہ نگاری و باریک بینی

دیوانہ باشں تا غم تو دیگراں خورند
واللہ ہوشیار ہے وہ جو کہ مست ہے
باغ جہاں میں خاک کوئی فیضیاب ہو
غنچہ کی مٹھی بند ہے گل بار دست ہے
اے مرغ دل تو شاخ نشیمن سے گر پڑا
حیف آشیاں بلند ہے پرواز پست ہے
کھنچے محو زلف دیدۂ تر دل بھی آ پھنسا
مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے

استاد آتش کا احترام اور لطافت صنعت ایہام

شاگرد خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیم
کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

نسیم کی فطرت میں جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے اعلیٰ غزل گوئی کی فطری صلاحیت تھی۔ ان کا مزاج فطرتاً شاعرانہ واقع ہوا تھا۔ اس زمانہ کے مذاق کے مطابق ان کی مثنوی کے علاوہ غزلوں میں بھی تناسب لفظی اور صنائع و بدائع کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ان کی غزلیات میں غنچہ و گل، بلبل و صیاد، آشیاں و نشیمن، سبزہ و نہال، نسیم و صبا وغیرہ لوازمات گلشن کی بھرمار ہے۔ مگر پھر بھی ان کا کلام فرسودہ و مبتذل مضامین اور روایتی شاعری سے پاک ہے۔

مومن، داغ اور نوح ناروی کی طرح نسیم بھی اپنے تخلص کا استعمال مقطع میں اس خوبی سے کرتے ہیں کہ اس سے لطف شعر دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان کے کلام میں واقعات زمانہ اور واردات زندگی کے اشارے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری صحیح

معنی میں تنقید حیات ہے۔ بندش کی چستی، تناسب لفظی، زبان کی صفائی، کلام کی روانی اور لطافت روزمرہ و محاورہ کے ساتھ ساتھ اکثر مقامات پر بلند پروازی اور معنی آفرینی بلا کی ہوتی ہے۔

چکبست نسیم کی غزل گوئی کی نسبت فرماتے ہیں "یہ ضرور ہے کہ نسیم کا کلام آتش و ناسخ، ذوق و غالب کے کلام کا ہمپایہ نہیں۔ یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہیں۔ ان کے برابر کسی کو عروج نہیں ہوا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ نسیم، رند، صبا و خواجہ وزیر کے ہم پلہ ضرور تھے۔"[1]

"گویہ (نسیم) آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمی سخن ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا۔ مگر باوجود اس تصنع کے جو کہ اس رنگ کا خاص جوہر ہے۔ نسیم کا کلام بے نمک نہیں۔ طبیعت میں ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو مزیدار بنا دیتی ہے۔"[2]

اصغر گونڈوی "یادگار نسیم" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: "نسیم نے اس کلام کو پیشے کے طور پر نہیں بلکہ شوقیہ شروع کیا تھا اس لئے ان کا نام استادان فن کے ساتھ لینا ناقابل عفو جرم ہوگا۔ نسیم نے سوے اتفاق سے وہ سن بھی نہ پایا کہ ان کے متعلق استادی کا کسی کو گمان ہو سکے۔"

غزل گوئی میں نسیم کو بہت زیادہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی لیکن ان کی مثنوی گلزار نسیم اپنی آپ نظیر ہے۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے بعد اسی مثنوی کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میدان میں دوسرے فن کار بہت پیچھے

---

[1] مضامین چکبست ص۱۳، [2] مضامین چکبست ص۱۳

رہ گئے۔ کم عمری میں اس پایہ کی نظم لکھنا اوروں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس سے نسیم کی شاعرانہ قدرت کا پتہ چلتا ہے۔

۳۔ مہاراجہ چندولال شاداںؔ حیدرآبادی

فخر قوم انتمی رالملک حاتم وقت راجۂ راجگان مہاراجہ چندولال وزیر اعظم و مدار المہام سرکار دکن خلف مہاراجہ نرائن داس ابن راجہ مول چند کھتری ۱۷۶۶ء میں بمقام برہان پور پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن لاہور تھا۔ راجہ ٹوڈرمل وزیر اکبر بادشاہ نے آپ کے جد اعلیٰ کو بلا کر دہلی میں عہدۂ جلیلہ پر ممتاز کیا۔ محمد شاہ کے وقت تک آپ کا خاندان دہلی میں مقیم رہا۔ جب نواب فتح جنگ نظام الملک دکن تشریف لائے آپ کے جد اعلیٰ راجہ مول چند ان کے ہمراہ آئے اور عہدہ کروڑ گری پر ممتاز ہوئے۔ آپ کے خاندان میں یہ عہدہ موروثی ہو گیا۔ آپ کی عمر دس سال کی تھی جب آپ کے والد نے انتقال فرمایا۔

نواب ارسطو جاہ کی وزارت میں آپ ریاست میں ملازم ہوئے۔ درجہ بدرجہ ترقی پا کر نواب سکندر جاہ کے عہد حکومت میں ۱۸۰۶ء میں عہدہ پیشکاری وزارت آصفیہ پر ممتاز ہوئے۔ ۱۸۱۶ء میں آپ کو مہاراجہ بہادر کا خطاب ملا۔ اور ۱۸۲۰ء میں ہفت ہزاری منصب و ہفت ہزار پیادہ و نوبت و گھڑیال و جواہر گرانبہا اور جاگیر سے سرفراز ہوئے۔ ۱۸۲۸ء میں راجایان راجہ مہاراجہ چندولال بہادر کے خطاب

سے سربلند رہے۔ ۱۸۴۳ء میں آپ سے کوئی ایسی بات واقع ہوئی کہ مستعفی ہونا پڑا۔
اور نواب ناصر الدولہ نے آپ کے لئے تیس ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ آپ نے
عہدہ پیشکاری کو تقریباً پچاس برس تک خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ آپ صبح
سے بارہ بجے رات تک مہمات سلطنت کے انتظام میں مصروف رہتے تھے اور بارہ بجے
کے بعد شعراء اور علماء کے ساتھ مشاعرہ و مذاکرہ فرماتے تھے۔ دو ڈھائی بجے رات
کو جلسہ برخاست کرکے خواب گاہ میں آرام فرماتے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں آپ نے انتقال
فرمایا۔

مہاراجہ چندو لال بہت بڑے منتظم اور فیاض مشہور تھے۔ آپ کی دریادلی اور
فیاضی کے متعلق صدہا حکائتیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ مدبری، سخن پروری، عدل
گستری اور مہمان نوازی میں آپ بے مثال تھے۔ نظام سلطنت میں منہمک رہنے کے
باوجود ارباب کمال کے عموماً اور شعراء کے خصوصاً قدرداں تھے۔ آپ نے کروڑوں روپیہ
فقراء و علماء اور صاحبان علم و ہنر پر تقسیم کردیا۔ ایران و ہندوستان کے اکثر شعراء آپ
کے دربار میں جمع تھے۔ ان کی تعداد تین سو سے زائد تھی۔ تمام شعراء ماہوار وظیفہ
پاتے تھے۔ کسی کا ماہانہ وظیفہ ہزار روپیہ کسی کا پانچ سو کسی کا دو سو اور کسی کا سو روپیہ
ہوتا تھا۔ آپ علم و ہنر کے نقاد تھے۔ ہر ایک کے کمال کی داد دیتے تھے اور حسب لیاقت
انعام و صلہ اور ماہوار وظیفہ سے سرفراز فرماتے تھے۔ آپ کے دربار میں پہنچنا گویا ستارۂ
اقبال کا بلند ہونا تھا۔ آپ روزانہ فقراء و مساکین کو بھی دو ڈھائی ہزار روپیہ اور
کافی غلہ تقسیم فرماتے تھے۔ سخاوت و کرم کی بدولت آپ نے بڑی نیکنامی و شہرت پائی۔
آپ نے استاد ذوق اور ناسخ کو بھی دکن بلایا تھا۔ مگر ذوق نے شاداں کے بھیجے ہوئے

نذرانہ کو واپس کر دیا اور معذرت میں جو خط لکھا تھا اس کا ماحصل آپ کا یہ شعر تھا۔

گرچہ ہے ملک دکن میں آج کل قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

شادآں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں قتیلؔ کے اور اردو میں شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے۔ آپ کے تین دیوان ہیں دو اردو میں ایک فارسی میں۔ جملہ اصناف سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ نے جو اسی خاندان کے ایک رکن تھے آپ کے اردو دیوان کو طبع کرایا ہے۔ شاداں شعر فہم اور سخن سنج کامل تھے۔

نمونۂ کلام[۱]

تصوف و معرفت

یاد اللہ کی کرتا ہے جہاں میں شاداں — صوفیوں میں وہ اسی واسطے محبوب ہوا

آتا ہے کس ادا سے بت نازنیں مرا — کرتا ہے مہر و ماہ کو خجل مہ جبیں مرا

اے دوستو میں کیا کہوں کس کی تلاش ہے — میں ڈھونڈھتا ہوں یار ملے یاں کہیں مرا

جدھر دیکھو ادھر جلوہ ہے تیرا — نہیں خالی ہر اک شے میں بھرا ہے

شاداں طلب یار کچھ آسان نہیں ہے — ہم ڈھونڈھیں کہاں اس کو پتا کچھ نہیں معلوم

نہیں معلوم مجھ کو میں کدھر ہوں — تجھے دیکھا ہے جب سے بے خبر ہوں

اجی بچہ بغل میں اور ڈھنڈھورا — تجھے میں ڈھونڈھتا ادھر ادھر ہوں

---

[۱] ماخوذ از تذکرہ محبوب الزمن حصہ اول مولفہ مولوی عبدالجبار ملکاپوری

وہی ہے ایک ہر گھٹ میں سمایا — مگر یہ بھید ہر اک نے نہ پایا

پاگل ہے سرو جس کی خوش خرامی دیکھ کر — میں ہوں دیوانہ اسی کے نرگس مخمور کا

بھروسہ ہے ترا ہی اور ہے تیرے سوا کس کا — نہ دیوے آسرا جب تو مجھے ہو آسرا کس کا

دیکھا تو خواب میں بھی ترا ہی خیال تھا — اٹھا جو چونک کر وہی شوق وصال تھا

ہو تیرا سہارا تو کھنچے کاہ سے آہن — ہمراہ بگولے کے چڑھے سنگ ہوا پر

پتھرا کے رہ گئیں وہیں موسیٰ کی چشم شوق — نور اس کا جلوہ گر جو ہوا کوہسار پر

آنکھ سے نیند بھی راتوں کو اچٹ جاتی ہے — دل میں کھٹکا جو ترا آٹھ پہر رہتا ہے

لطافت تغزل

آتا نہیں جو سامنے مارے حجاب کے — ہم دل سے ہیں نثار اسی آفتاب کے

سب ہوئے محو اسے دیکھ جدھر سے نکلا — تھے تعجب میں کہ یہ چاند کدھر سے نکلا

جلوہ حسن ترا کیا کہئے — جس نے دیکھا بس اک نشانہ تھا

منتظر ہوں نہیں آیا ہے مرا یار ہنوز — کیوں نہ خورشید ہوا آج نمودار ہنوز

جس نے دیکھا اسے سو جان سے تماشائی تھا — طاق نسیاں پہ وہاں دفتر دانائی تھا

نقش دیوار ہوا دیکھ کے ہر اک اس کو — مل کے غازہ کو وہ جب محو خود آرائی تھا

ملا کے گیسوئے دلبر سے سلسلہ دل کا — عجب بکھیڑے میں ڈالا معاملہ دل کا

سختیاں عشق بتاں میں نہ اٹھاؤ شاداں — کون جوڑے گا اسے دل جو تمھارا ٹوٹا

اس طرف دھوم سے ساون کا مہینہ آیا — اس طرف یار لئے ساغر و مینا آیا

بھلی لگی ہے کسے سیر بوستاں تنہا — نہ جاؤں باغ کو بے یار باغباں تنہا

دیکھ رفتار تری کبک بھی گم کردے چال — قد و قامت سے ترے سرو کی رعنائی گیا

گلبدن دیکھ تجھے غنچہ ہوا ہے دل تنگ — آگے عارض کے ترے گل کی ہے رعنائی کیا

آنکھ یوں بیٹھ کے ظالم پس چلمن مارے — تیر جیسے کہ صف جنگ میں ارجن مارے

کہاں ہے چال صبا میں ترے چلن کی سی — نہیں ہے غنچہ میں تنگی ترے دہن کی سی

ہم تو مشتاق دید تھے صاحب — اپنا منہ ہم سے کیوں چھپایا تھا

چھپا نہ راز محبت کا بوئے گل کی طرح — جو بات دل میں تھی وہ درمیاں نکل آئی

حسن تشبیہہ واستعارہ

صنم وہ جب گھڑی کھولے ہے منہ پر اپنے بالوں کو
کھلاتا ہے دو طرفہ ہاتھ میں لے لے کے کالوں کو

خوبرو معشوق پر شاداں کا یوں آتا ہے دل — جس طرح جائے پتنگا دوڑ کر سوئے چراغ

ترک دنیا

برنگ بوئے گل رہتے ہیں گل میں اور جدا اس سے
جو ہیں آزاد دنیا میں وہ کب پابند ہوتے ہیں

جس طرح بحر میں حباب رہا — اپنا اس طرح سے شباب رہا

فلسفہ ہستی

شکل ہستی سراب کی سی ہے — بے ثباتی حباب کی سی ہے

جیساکہ اشعار مندرجہ بالا سے ثابت ہوتا ہے شاداں کے کلام کا جوہر پاکیزگی، سنجیدگی اور متانت ہے۔ بیشتر اشعار تصوف و معرفت کے رنگ میں بہت خوب کہے گئے ہیں۔ تصوف کے ساتھ ساتھ تغزل کی چاشنی بھی آپ کے کلام میں موجود ہے۔ آپ کا کلام رعایت لفظی، ابتذال اور رکاکت سے بالکل پاک ہے۔ اس میں قدما

کی بے تکلفی وسادگی پائی جاتی ہے۔ دلی جذبات واردات کو سیدھے سادے ڈھنگ سے ادا کرنے میں آپ مہارت رکھتے تھے۔ آپ کے پاکیزہ کلام میں میر تقی میر کے تغزل اور خواجہ دردؔ کے تصوف کا لطف ملتا ہے۔ زبان کی سادگی وسلاست کے ساتھ مضامین کی پاکیزگی، اسلوب کی شگفتگی اور تخیل کی بلندی کا آپ نے خاص لحاظ رکھا ہے۔

دورِ چہارم کی خصوصیات

لکھنؤ اسکول کی ابتدا

دورِ سوم میں آتشؔ مصحفیؔ وغیرہ شعرائے دہلی کی آمد سے لکھنؤ میں شعرگوئی کا شوق اتنا عام ہوا کہ ان اساتذہ کے سیکڑوں شاگرد ہوئے اور اہل لکھنؤ شاعری کے پیچھے اتنے دیوانے ہوئے کہ مشاعرے اکثر روزمرہ منعقد ہوتے تھے۔ شاعری میں شعراء کے باہم مقابلے ہوتے تھے جس میں وہ ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان وجوہات سے لکھنؤ میں فن شعر کی بڑی ترقی ہوئی۔ رفتہ رفتہ کثرت مشق سے دورِ چہارم میں وہ زمانہ آیا جس نے لکھنؤ میں ناسخؔ اور آتشؔ ایسے دو صاحب طرز شعراء پیدا کئے۔ ناسخؔ کی جدت پسند طبیعت نے شعرائے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ کر اظہار جذبات کے لئے ایک نیا راستہ نکالا جس سے

لکھنؤ اسکول کی ابتدا ہوئی۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں[1]: "ناسخ اس طرز جدید کے پیشوائے اعظم ہیں اور ان کے بعض شاگرد بھی قدم بقدم چل کر کامیاب ہوئے یہاں تک کہ زمانہ موجودہ میں وہ طرز خاص نامقبول ٹھہری اور اب شاعری نے ایک جدید روش اختیار کی۔" ڈاکٹر رفیق حسین صاحب فرماتے ہیں[2]: "اب وہ زمانہ آیا کہ لکھنؤ کے شعراء اپنی انفرادیت کا احساس کرنے لگے۔ شیخ امام بخش ناسخ پہلے شاعر تھے جنھوں نے اپنے آپ کو دہلی اسکول کی تقلید و پیروی سے آزاد کیا اور وہ درجہ کمال حاصل کیا کہ دہلی کے شعرائے مابعد اور معاصرین نے ان کی پیروی کرنا عیب نہ سمجھا۔"

طرز دہلی اور طرز لکھنؤ کا فرق

طرز دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شعراء اپنے جذبات کا اظہار سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اس اسلوب سے کرتے ہیں کہ شعر میں بہت تاثیر اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی توجہ شعر کے ظاہری حسن کے بجائے اس کے باطنی حسن پر ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے لکھنؤ طرز کے شعراء کی خاص توجہ شعر کو ظاہری حسن سے آراستہ کرنے پر ہوتی ہے۔ دور چہارم میں ناسخ اور شاگردان ناسخ (صبا، بحر، رشک اور سحر وغیرہ) پُرشکوہ الفاظ، رعایت لفظی، تکلف و تصنع آمیز زبان، فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت، پیچیدہ اور دور از کار تشبیہات و استعارات کی بھرمار، فضول مبالغے، سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی، مشکل اور عجیب قافیوں و ردیفوں کے استعمال کو شاعری کے محاسن سمجھنے لگے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان شعراء کا کلام ظاہری

---

[1] تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۲۲؛ [2] اردو غزل کی نشوونما صفحہ ۲۹۵

محاسن سے مزین ہوتے ہوئے بھی اصلیت اور درد و اثر سے معرّا ہے۔ وہ دماغ کو تو متوجہ کرتا ہے مگر دل پر اثر نہیں کرتا۔ رام بابو سکسینہ فرماتے ہیں[۱] "گویا محض رعایت لفظی شعر کی خوبی اور عمدگی کا دارومدار رہ گئی اور الفاظ کے قربان گاہ پر درد و اثر، جذبات، سادگی، سلاست اور فصاحت و بلاغت وغیرہ سب بھینٹ چڑھا دی گئیں۔ اور اس کمی کو اغراق، غلو اور دور از کار تشبیہوں نے پورا کیا۔۔۔ اس میں شعر الفاظ رنگین کا ایک خوشنما گھروندا ہوتا ہے، جو نظروں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر کبھی دلکش نہیں ہوتا۔۔۔ ان کی غزلیں شاندار الفاظ اور طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ ہوتی ہیں مگر جذبات و اثرات سے خالی ہوتی ہیں۔ تصنع ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے۔ ان سے کسی شعر پر پڑھنے والے کا دل نہیں پھڑکتا۔"

حالانکہ آتش کے کلام میں ان کے تخلص کے اعتبار سے گرمی اور دلچسپی کافی ہے مگر ماحول سے مجبور ہو کر وہ بھی تصنع اور رعایت لفظی کی وبا سے بچ نہ سکے۔ بقول انیس ع

بچا نہ گرد سے دامن بہت بچا کے چلے

چنانچہ آتش نے بھی بعض اوقات محض قافیہ پیمائی اور رعایت لفظی کے لئے اشعار کہے ہیں۔ مثلاً[۲]

آئینے میں خط نورس کا نظارہ کیجے ... آہوان چشم کو ریحاں چرایا چاہیے
بوسہ اس لب کا ہے قوت بخش روح ناتواں ... ایسی یاقوتی میسر ہو تو کھایا چاہیے
کسی چشم سیہ کا جب ہوا ثابت میں دیوانہ ... تو مجھ سے مست ہاتھی کی طرح جنگلی ہرن بگڑا

۱؎ تاریخ ادب اردو ص۲۲۳ ، ۲؎ آب حیات ص۳۴۳ ، ص۳۴۰

رند، صبا، خلیل، بسمل اور پنڈت دیا شنکر نسیم وغیرہ آتش کے نامور شاگرد ہوئے ہیں اور یہ سب تصنع اور رعایتِ لفظی کے بہت دلدادہ تھے۔ مگر آتش اور شاگردانِ آتش ساتھ ہی ساتھ معنویت اور کلام کی پاکیزگی کا بھی خیال رکھتے تھے۔

اس دور کے تمہید میں مولانا آزاد فرماتے ہیں[1]: "اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے۔ ایک وہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین و آئین سمجھا۔ یہ ان کے باغوں میں پھریں گے۔ پرانی شاخ زرد پتے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ اور نئے ڈھنگ کے گلدستے بنا کر گلدانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے۔ دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے ایجاد کی ہوائیں اڑائیں گے اور برج آتشبازی کی طرح اس سے رتبہ عالی پائیں گے۔ ... چنانچہ تم دیکھو گے کہ بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے جہاں آفتاب تارہ ہو جائے گا اور بعض ایسے اڑیں گے کہ اڑ ہی جائیں گے۔ وہ اپنے آئین کا نام خیال بندی اور نازک خیالی رکھیں گے۔ اب تک مضمون کا پھول اپنے حسنِ خداداد کے جوبن سے فصاحت کے چمن میں لہلہاتا تھا۔ یہ اس کی پنکھڑیاں لیں گے اور اس پر موقلم سے ایسی نقاشی کریں گے کہ بے عینک کے دکھائی نہ دے گی۔ اس خیال بندی میں یہ صاحبِ کمال اس قدرتی لطافت کی بھی پروا نہ کریں گے، جسے تم حسنِ خداداد سمجھتے ہو کیونکہ ان کی طبیعت بے اس کے اپنا رنگ نہیں دکھا سکتی ... ان سے پہلے جو صاحبِ کمال لکھنؤ میں تھے وہ دلی کے خانہ برباد تھے۔ وہ یا ان کی اولاد اس وقت تک دلی کو اپنا وطن سمجھتے تھے اور اہلِ لکھنؤ ان کی تقلید کو فخر سمجھتے تھے نہ کہ عیب کیونکہ وہاں اب تک کوئی صاحبِ کمال

---

[1] آبِ حیات ص ۳۳۹، ص ۳۴۰

اس درجہ کا پیدا نہ ہوا تھا۔ اب وہ زمانہ آتا ہے کہ ان میں خود صاحب زبانی کا دعویٰ ہوگا اور زیبا ہوگا۔ اور جب ان کے اور دلی کے محاورہ میں اختلاف ہوگا تو اپنے محاورے کی فصاحت اور دلی کی عدم فصاحت پر دلایل قایم کریں گے ۔ بلکہ انھیں کے بعض بعض نکتوں کو دلی کے اہل انصاف بھی تسلیم کریں گے ؟

اصلاح زبان کی تکمیل

حاتم کے ہاتھوں دورِ اول میں اردو زبان کی صفائی اور اصلاح کی ابتدا ہوئی۔ سودا و میر کے ذریعہ دورِ دوم میں اور انشا و مصحفی کے ذریعہ دورِ سوم میں اس اہم کام پر کافی توجہ دی گئی جس سے زبان لگاتار منجھتی اور صاف ہوتی چلی گئی۔ دورِ چہارم کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ اصلاح زبان کی تکمیل ہے جو ناسخ کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ ناسخ نے ایسے الفاظ و افعال جو ثقیل اور بھدّے معلوم ہوتے تھے، شاعری کے لئے متروک قرار دیا اور ان کی جگہ فصیح الفاظ کو رواج دیا۔ وہ نپٹ کے بجائے بہت، ٹک کے بجائے ذرا، تلک کے بجائے تک، کبھو کے بجائے کبھی، تجھ سوا کے بجائے تیرے سوا، اور آئے ہے، جائے ہے کے بجائے آتا ہے، جاتا ہے وغیرہ کے رواج دینے پر زور دیتے رہے۔ ناسخ کی توجہ فارسی و عربی الفاظ اور ترکیبوں کی طرف زیادہ تھی۔ زبان کی صفائی اور روانی کی طرف آتش نے بھی کافی توجہ دی۔

دورِ چہارم میں ہندو شعراء کی ادبی خدمات

مثنوی :۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے "گلزارِ نسیم" کہہ کر میر حسن کی شہرہ آفاق

مثنوی سحرالبیان کے جواب میں اور اس سے بالکل مختلف رنگ میں ایک دوسری بے نظیر مثنوی کا اردو ادب کے خزانہ میں اضافہ کیا۔ انھوں نے محض ستائیس سال کی عمر میں مثنوی گلزارنسیم لکھ کر اپنی غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت اور قادر الکلامی کا زبردست ثبوت پیش کیا۔ فن کے اعتبار و نیز تخیل کے اعتبار سے گلزارنسیم ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔

مرثیہ ۔ اس عہد میں منشی چھنولال دلگیر نے مرثیہ گوئی میں خوب نام پیدا کیا یہاں تک کہ یہ نواب سعادت علی خاں (۱۷۹۷-۱۸۱۴ء) اور نواب غازی الدین حیدر (۱۸۱۴-۱۸۲۷ء) کے زمانے کے مرثیہ گویوں کے سرتاج سمجھے جاتے تھے۔ دلگیر انیس اور دبیر کے پیش رو تھے۔ ان کے مراثی چار ضخیم جلدوں میں مرتب ہو کر طبع ہو چکے ہیں۔ ان کی مرثیہ گوئی پر مفصل بحث دسویں باب میں عنوان مرثیہ میں کیا گیا ہے۔

رزمیہ نظم ۔ مول چند منشی دہلوی شاگرد شاہ نصیر دہلوی نے اس عہد میں شاہنامہ فردوسی کا منظوم ترجمہ کر کے اردو میں ایک رزمیہ نظم کا اضافہ کیا۔ اس مثنوی میں فارسی زبان کے فصیح، شیریں اور مستعمل الفاظ بھرے پڑے ہیں۔ یہ مثنوی مول چند منشی کی اعلیٰ زبان دانی اور زبان فارسی پر کمال دستگاہی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے شمشیر خانی کا ترجمہ بھی شاہنامہ اردو کے نام سے کیا ہے جو بہت مشہور ہے۔

تذکرہ نویسی ۔ منشی خوب چند ذکا دہلوی نے اس دور میں اردو شعرا کا ایک بہت بڑا تذکرہ معروف بہ "عیار الشعرا" تالیف کیا تھا جس میں حسب بیان خمخانہ جاوید جلد سوم صفحہ ۲۴۶ چار پانچ ہزار اردو گو شعرا کا حال قلمبند کیا گیا تھا۔

مگر وہ تذکرہ ان کی اولاد کی غفلت سے ضایع ہو گیا۔ اس کی ایک نقل ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل دہلی کالج کے پاس تھی۔

اردو شعرا کی سرپرستی۔ اس دور میں مہاراجہ چندو لال شاداں وزیر اعظم و مدار المہام سرکار دکن نے فیاضی اور مہمان نوازی میں بہت شہرت حاصل کی۔ یہ ارباب کمال کے عموماً اور شعرا کے خصوصاً بڑے قدردان تھے۔ انھوں نے کروڑوں روپیہ شعرا اور علما اور صاحبان علم و ہنر پر تقسیم کر دیا۔ ایران و ہندوستان کے اکثر شعرا ان کے دربار میں جمع تھے شعرا کی تعداد تین سو سے زاید تھی۔ تمام شعرا وظیفہ پاتے تھے کسی کا ماہانہ وظیفہ ہزار روپیہ، کسی کا پانچ سو، کسی کا دو سو اور کسی کا سو روپیہ ہوتا تھا۔ انھوں نے ناسخ اور استاد ذوق کو بھی دکن بلایا تھا۔ مگر ذوق نے معذوری کا اظہار کیا۔ شاداں نے فارسی اور ار.و دونوں زبانوں میں شعر کہے تھے۔ چنانچہ ان سے دو دیوان اردو میں اور ایک دیوان فارسی میں یادگار ہیں۔

دور چہارم کے باقی ماندہ ہندو شعرا کی فہرست

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
دہلی			
۱	سخنور	دیوانی سنگھ	متوفی ۱۲۲۳ھ بہار سخن ملاحظہ ہو۔
لکھنؤ			
۲	آذر	جوالا پرشاد	بہار گلشن کشمیر ملاحظہ ہو۔

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۳	الفت	راجہ الفت رائے	مرثیہ گوئی میں مشہور تھے۔ بہارِ سخن دیکھئے۔
۴	تمنا	بھیروں داس	شاگرد مصحفی۔ بہار سخن دیکھئے۔
۵	حریف	لالہ چینی لال	شاگرد مصحفی۔ تذکرہ ریاض الفصحا دیکھئے۔
۶	حیرت	پنڈت اجودھیا پرشاد	شاگرد امانت۔ متوفی ۱۸۱۰ء بہارِ گلشن کشمیر دیکھئے۔
۷	ذوق	شیو پرشاد	شاگرد مصحفی۔ صاحب دیوان تھے بہار سخن دیکھئے اور تذکرہ ریاض الفصحا۔
۸	رند	گنگا پرشاد	شاگرد جرأت۔ بہار گلشن کشمیر دیکھئے۔
۹	شائق	شیو رام	شاگرد مصحفی۔ تذکرہ ریاض الفصحا ص۱۲۶ دیکھئے۔
۱۰	ظریف	لالہ بینی پرشاد	شاگرد مصحفی ریاض الفصحا ص۲۰۳
۱۱	عاصی	طوطا رام	بینڈو لال زار کے استاد تھے بہار سخن ص۲۷۱
۱۲	گلشن	راجہ جیا لال	نامور شاعر تھے۔ بہار سخن دیکھئے۔
۱۳	مظفر	کنور سین	شاگرد مصحفی۔ تذکرہ ہندی ص۲۲۳ دیکھئے۔
۱۴	نسیم	مرزا راجہ کیدار ناتھ	شاگرد رنگین متوفی ۱۸۱۹ء تذکرہ شعرائے ہنود ص۱۳۱

دور چہارم کے وہ ہندو شعرا جن کا ذکر اس کتاب کے اگلے ابواب میں کیا گیا ہے

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۱	منشی	محول چند دہلوی	نامور شاعر تھے۔ شاہنامہ فردوسی اور شمشیر خانی کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ باب مثنوی (منظوم) ترجمہ ملاحظہ ہو۔
۲	دلگیر	چھنو لال لکھنوی	نامور مرثیہ گو تھے۔ باب مرثیہ ملاحظہ ہو۔

ساتواں باب

دورِ پنجم

ذوق، غالب اور مومن کا زمانہ

(۱۸۳۷ء - ۱۸۶۷ء)

اس دور کا سیاسی پس منظر

یہ وہ دور ہے جس میں سلطنت مغلیہ اور صوبہ اودھ کا خاتمہ ہوا اور تقریباً سارا ہندوستان انگریزی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ سراج الدین محمد بہادر شاہ متخلص بہ ظفر (۱۸۳۷ء - ۱۸۵۷ء) سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار تھے۔ ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے اور اکبر شاہ ثانی کے بعد ۱۸۳۷ء میں برائے نام شاہانہ خطاب سے پکارے گئے۔ یہ برطانوی حکومت کے پنشن خوار تھے۔ ان کی حکومت محض لال قلعہ کے اندر ہی باقی رہ گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں غدر میں شرکت کرنے کے جرم میں برطانوی حکومت نے ان پر مقدمہ چلایا اور جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیا۔ جہاں انھوں نے ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔ بہادر شاہ شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور اپنا وقت زیادہ تر شاعری میں صرف کرتے تھے۔ استاد ذوق اور مرزا غالب کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ان کے چار دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کلام بہت سادہ و سلیس اور درد و اثر سے مملو ہے۔

---

(۱) تاریخ ادب اردو ص ۲۰۰

امجد علی شاہ (۱۸۴۷-۱۸۴۲ء) بادشاہ صوبہ اودھ علوم و فنون کے مربی اور شعر و سخن کے قدردان تھے۔ یہ ایک کمزور حکمراں تھے۔ جس سے صوبہ میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند سلطان عالم واجد علی شاہ بعمر بیس سال ۱۸۴۷ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ انھیں فن تعمیر سے بے حد شوق تھا۔ چنانچہ قیصر باغ تعمیر کرایا۔ جس کی عمارت و محلات کی تعمیر میں دو کروڑ روپے صرف ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد نالایق مصاحبوں اور بدخواہ ہم نشینوں نے عیش و عشرت کی طرف مائل کیا جس سے بجز محفل رقص و سرود اور کوئی مشغلہ باقی نہ رہا۔ نواب کی عیش و عشرت اور ناچ و رنگ کی وجہ سے ملک میں بڑی بدنظمی پھیل گئی جس کے لئے برطانوی حکومت کو بار بار تنبیہہ کرنا پڑی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار ۷ رفروری ۱۸۵۶ء کو صوبہ اودھ انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ واجد علی شاہ معزولی کے بعد کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ وہاں انھیں ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن ملتی تھی۔ ڈیڑھ دو سال قلعہ فورٹ ولیم میں نظر بند رہنے کے بعد محلہ مٹیا برج میں سکونت اختیار کی۔ انھوں نے ۶۸ سال کی عمر میں ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو انتقال کیا[۱]۔ واجد علی شاہ کو شعر و سخن کا بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان سے متعدد تصانیف یادگار ہیں[۲]۔

اس دور کا ادبی ماحول

سودا و میر اور انشا و مصحفی وغیرہ شعرائے دہلی کے ترک وطن کر کے لکھنؤ چلے

---

[۱] لکھنؤ دی گارڈن آف انڈیا صفحہ ۳۰، [۲] تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۵۶

آنے سے نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت (۱۷۷۵-۱۷۹۳ء) میں اردو شاعری کا مرکز دہلی سے ہٹ کر لکھنؤ آگیا تھا جس سے تھوڑے عرصہ کے لئے دہلی کے بزم سخن کی شمع کی روشنی بہت مدھم پڑ گئی تھی۔ وہاں اس اثنا میں بجز شاہ نصیر کے کوئی نامور شاعر نہیں ہوا۔ وہ بھی صف اول کے نہیں بلکہ صف دوم کے شاعر تھے۔ مگر تھوڑے دنوں کی افسردگی کے بعد دہلی کا بزم سخن پھر گرم ہوا۔ اس کے خزاں رسیدہ گلشن میں عروس بہار کی پھر آمد ہوئی اور دہلی دوبارہ اردو شاعری کا مرکز بنی۔ دہلی کے افق سے ایک بار پھر غالب سے اچھوتے اور فلسفیانہ مضامین باندھنے والے، ذوق سے روزمرہ و محاورہ کا سادہ و سلیس زبان میں حق ادا کرنے والے اور مومن سے رمز و کنایہ میں لطیف جذبات کا اظہار کرنے والے درخشندہ ستارے طلوع ہو کر سپہر سخن پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنے کلام کی آب و تاب سے ایک عالم کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ یہ عہد اردو شاعری کا بہترین عہد تصور کیا جاتا ہے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق (۱۷۸۷-۱۸۵۵ء) شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد اور بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ شاہی دربار کے ایک جشن کے موقع پر بہادر شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے صلہ میں خاقانیٔ ہند کا خطاب ملا اور ملک الشعرا کے ممتاز عہدے پر سرفراز ہوئے۔ مولانا آزاد ان کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں[1] "عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے۔۔۔۔ چنانچہ

---

[1] آب حیات صفحہ ۴۶۹ ملاحظہ ہو

وہی مشکل طرحیں، چست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی، الفاظ کی شکوہیں ان کے یاں بھی پائی جاتی ہیں۔"

ڈاکٹر رفیق حسین ذوق کے کلام کی نسبت لکھتے ہیں[۱] "یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ذوق اپنے دور کے بہترین غزل گو تھے لیکن اتنا ضرور ہے کہ میر و سودا اور درد کے بعد غزل کی شان و منزلت میں جو کچھ کمی واقع ہو گئی تھی اس کو ذوق نے اپنے رنگ تغزل سے بحسن و خوبی پورا کیا۔۔۔۔ان کا دل و دماغ شعرائے ماسبق کے دواوین اور اشعار سے گونج رہا تھا جو انھیں نئی بات کے کہنے سے برابر روکتا رہتا تھا۔ یہی ایک خاص وجہ تھی کہ ان کے کلام میں میر، سودا، درد، سوز اور ناسخ کا رنگ نمایاں ہے لیکن باوجود اس ہم آہنگی کے ذوق اپنی انفرادی حیثیت قایم کرتے گئے۔"

ذوق کے چند بہترین شعر ملاحظہ ہوں۔

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر ——— پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو ——— زبان دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ——— مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے ——— لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو ——— زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا ——— آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے ——— حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

---

[۱] اردو غزل کی نشو و نما ص ۳۶۵

اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ بمقام اکبرآباد ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ تہتر سال کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو انتقال کیا اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں مدفون ہوئے۔ شہرت کے لحاظ سے ذوقؔ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ مشہور رہے۔ غالبؔ حالانکہ اپنے ہمعصروں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے لیکن انھیں اپنی زندگی میں اتنی شہرت وناموری حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ عہد حاضر میں حاصل ہوئی ہے۔ ان کے ابتدائی کلام کو سمجھنا آسان نہیں تھا اس لیے لوگ ان پر پھبتیاں کہتے تھے۔ جن کا جواب اپنی ایک غزل کے ایک شعر سے یوں دیا تھا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مولانا آزاد غالبؔ کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں[۱]: "اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین ومعانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھی۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح نہیں بولتے ہیں لیکن جو شعر صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔ غالبؔ کے متعلق رام بابو سکسینہ فرماتے ہیں[۲]: "غالبؔ کی خداداد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو دنیا کے بہترین شعراء سے کیا جاسکتا ہے۔ ذوقؔ ومومنؔ گو کہ غالبؔ کے مقابلہ میں نہیں چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے حاضرین میں بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے۔"

۱۔ آب حیات ص ۵۱۰، ۲۔ تاریخ ادب اردو ص ۳۰۳

ڈاکٹر رفیق حسین غالب کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں[۱] "یہ حقیقت ہے کہ غالب کی شاعرانہ انفرادیت اسی انوکھے اور نرالے انداز بیان کی وجہ سے قایم ہوئی۔ ان کے کلام میں ایسے اچھوتے مضامین نظم ہوئے ہیں جو دوسرے شعرا کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئے تھے۔ معنی آفرینی اور نازک خیالی صحیح معنوں میں ان کا حصہ تھی۔۔۔۔ برخلاف ناسخ کے غالب شعروں میں لفظی شان و شکوہ کے ساتھ ایسے معنی پیدا کرتے ہیں کہ جن کو معلوم کر کے دل کو مسرت ہوتی ہے۔۔۔۔ ان[۲] کے اس مختصر سے دیوان میں کیا کچھ نہیں۔۔۔۔ ایک اچھے شاعر کو جو کچھ کہنا چاہئے وہ کہہ گئے اور خوب کہہ گئے۔ غزل کی جتنی اصطلاحی اور معنوی خصوصیات ہو سکتی ہیں وہ سب ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔۔۔۔ غالب کے کلام کا ایک جوہر یہ بھی ہے کہ وہ اپنی شوخی اور طنز گفتاری سے ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ لبوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔۔۔۔ خواجہ[۳] میر درد کے بعد مسائل تصوف کو غالب سے بہتر کسی نے موزوں نہیں کیا۔۔۔۔ رندی[۴] اور مئے خواری کے مضامین اردو کے ہر شاعر نے باندھے ہیں عام اس سے کہ وہ شراب پیتے رہے ہوں یا نہ پیتے رہے ہوں لیکن غالب سے پہلے شاید ہی کسی نے اعتراف گناہ کرنے کی جسارت کی ہو۔ فلسفۂ حیات اور اخلاقی نکات پچھلے شعرا نے بھی نظم کئے ہیں لیکن غالب نے جس اچھوتے انداز سے موزوں کیا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔ میرے خیال میں غالب اس میدان میں سب سے آگے ہیں۔"

ڈاکٹر رفیق حسین نے اپنی کتاب "اردو غزل کی نشو و نما" میں غالب کے

۱؎ اردو غزل کی نشو و نما ص۲۹۳، ۲؎ اردو غزل کی نشو و نما ص۲۹۵، ۳؎ اردو غزل کی نشو و نما ص۲۹۶

۴؎ اردو غزل کی نشو و نما ص۳۰۱، ۵؎ اردو غزل کی نشو و نما ص۳۰۲

کلام کی نسبت ایک جامع اور مبسوط تبصرہ پیش کیا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ آخر میں آپ اپنے تبصرہ کا لب لباب یوں پیش کرتے ہیں[1] "اس میں شک نہیں کہ غالب نے فارسی الفاظ اور تراکیب سے اپنے کلام کو بہت آراستہ کیا جس کی وجہ سے ان کے اشعار عموماً عام فہم نہیں ہوتے لیکن آخری زمانے میں جو غزلیں چھوٹی بحروں میں صاف صاف کہی ہیں وہ سہل ممتنع کی بہترین مثالیں ہوتے ہوئے بھی عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں..... ان سے پہلے یا ان کے بعد کوئی شاعر ان کے طرز بیان کی نقل نہ کر سکا ہے اور نہ شاید کر سکے گا۔ ان کا اسلوب بیان نرالا تھا.... غالب نے پرانے اساتذہ مثلاً درد، میر، ناسخ اور آتش سب کے کلام سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور اٹھایا ہے۔ لیکن جو مضمون ان سے مستنبط کیا ہے اسے اپنا کر کے چھوڑا ہے۔"

غالب کے چند منتخب شعر

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب — دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

---

[1] اردو غزل کی نشو و نما صفحہ ۱۴۸

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب — شرم تم کو مگر نہیں آتی
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی — جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
زندگی اپنی جب اس طور سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

حکیم مومن خاں مومن سنہ ۱۷۹۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۱ء میں وفات پائی۔ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اساتذہ میں شمار تھا۔ چنانچہ کافی تعداد میں شاگرد چھوڑے۔ ان کے کلام میں جرأت اور ناسخ کے ملے جلے کلام کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کا شمار بہترین غزل گویوں میں ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں بیشتر حسن و عشق کے مضامین نظم کئے گئے ہیں۔ ان کے کلام کی نسبت ڈاکٹر رفیق حسین فرماتے ہیں۔[۱]
"مومن کے کلام کا اگر نصف نہیں تو تہائی حصہ ضرور ایسا ہے کہ جس میں ناسخ کا رنگ جھلکتا ہے۔ وہی نازک خیالی اور وہی معنی بندی۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ ناسخ مضمون کی تلاش میں عرش و کرسی و فلک کی سیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور مومن اس دنیا

---

[۱] اردو غزل کی نشوونما ص ۲۷۶، ۲۷۷

میں رہتے ہیں۔ وہ ایسے واقعات کی تصویر پیش کرتے ہیں جو غریب المثال ہوتے ہیں۔
ناسخ اور مومن کے کلام میں یہ بھی ایک امتیازی فرق ہے کہ ناسخ کے ہاں اکثر کلام بے نمک اور بے تاثیر رہتا ہے۔ مومن کے یہاں باوجود فارسی تراکیب، تشبیہات واستعارات کی بھرمار کے لطف واثر ان سے کہیں زیادہ رہتا ہے۔ ناسخ کے یہاں ڈھونڈنے سے دو چار صاف غزلیں اور دس بیس اشعار ملیں گے لیکن مومن کے ہاں ایسے اشعار اور ایسی غزلوں کی تعداد کافی ملے گی۔"

نمونۂ کلام

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حال دل یار کو لکھوں کیوں کر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمھارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرض مضطر اے مومن — صنم آخر خدا نہیں ہوتا

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے — جور اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے
حجاب چرخ بلا ہے ہوا کرے بے تاب — فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے

ملے رقیب سے وہ جب سنا وصال ہوا — دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لئے

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی — زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے

عمر ساری تو گئی عشق بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

دورِ پنجم کے ممتاز ہندو شعراء

اس دور میں ممتاز ہندو شعراء کی تعداد ۶ ہے۔ ان کے سوانح حیات اور نمونہ کلام وغیرہ اگلے صفحات پر ملاحظہ ہوں۔

امینڈو لال زار لکھنوی

منشی مینڈو لال زار منشی چندی لال کے فرزند اور منشی طوطا رام عاصی لکھنوی کے مایۂ ناز شاگرد تھے۔ ذات کے کایستھ سکسینہ تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر مستقل سکونت لکھنؤ میں اختیار کر لی تھی ۱۸۸۵ء میں انتقال فرمایا۔

حضرت زار فارسی میں عالمانہ قابلیت رکھتے تھے۔ ان کی علمی نکتہ دانی کا دور دور شہرہ تھا اور نامی اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی۔ منشی گوبند پرشاد فضا، منشی کنور جی مدہوش، منشی للے جی تجلی، رائے دولت رام شوق، منشی نوندر رائے وقار وغیرہ زار ہی کے شاگرد تھے۔ مولانا حیدر علی نظم طباطبائی

---

(۱) ملاحظہ ہو کتاب "ہندوؤں میں اردو" از رفیق مارہروی۔

جیسے جید عالم نے زآر ہی سے فارسی پڑھی تھی۔ طباطبائی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں زآر کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا ہے۔

زآر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور دونوں میں دیوان مرتب کیا تھا۔ مگر ان کے دونوں دیوان طبع نہ ہو سکے اور ان کے قلمی نسخے بھی ضائع ہو گئے۔ زآر کو نثر پر بھی نظم کے برابر ہی قدرت حاصل تھی چنانچہ ان کی مصنفہ کتاب "انشائے گلزار فصاحت" اتنی مشہور کتاب ہے کہ وہ آج تک بطور درس پڑھائی جاتی ہے۔

نمونۂ کلام[1]

جس دم دھواں اٹھا دلِ پر اضطراب کا — گل ہو گیا فلک پہ چراغ آفتاب کا

میں وہ پژمردۂ خاطر ہوں کہ میری آہ افسردہ — ہوئی فصل بہاری کے لئے باد خزاں پیدا

یہ آتش غم یار کی محفل سے لگی ہے — اے شمع تیرے سر سے مرے دل سے لگی ہے

آنکھ اپنی بت حور شمائل سے لگی ہے — بت بن گئے جنت کی ہوا دل سے لگی ہے

لیلیٰ رگ جان قیس کی کھینچ آئی ہے شاید — ڈوری یہ نہیں پردۂ محمل سے لگی ہے

کون کرتا ہے کشتوں کی گور پر روشن چراغ — ہم کو چشم غول ہے گویا سر مدفن چراغ

کام ہے کیا شمع کافوری سے اور فانوس سے — گور ہے فانوس داغ دل ہے یاں روشن چراغ

جان سے گذرے جو عاشق غم نہ ہو معشوق کو — موت پر پروانے کی کرتا نہیں شیون چراغ

اس نے زلفیں کھول دیں یاں داغ غم کم ہو گیا — زآر سچ ہے سانپ کے آگے نہ ہو روشن چراغ

---

[1] زآر کا کلام تذکروں سے خاطر خواہ حاصل نہ ہو سکا۔ تذکرۂ سخن شعرا مولفہ نساخ میں صرف ایک شعر، بہار سخن میں چار شعر اور خمخانۂ جاوید میں صرف سولہ شعر ان کے مل سکے۔

لپٹی ہے پھر وہ زلف گرہ گیر پاؤں میں
بھائے نہ کس طرح مجھے زنجیر پاؤں میں

تا اس کی ہرزہ گوئی کا قایم رہے نشاں
پھرتا ہوں باندھے قیس کی تصویر پاؤں میں

نقش قدم ہے پنجۂ خورشید روز حشر
کیا حق نے دی ہے یار کے تنویر پاؤں میں

خاک لحد گو میری کیا صورت طلا
تھی زارؔ اس پری کے یہ اکسیر پاؤں میں

باندھے وہ آج ہی نہیں پھرتا ہے نیمچہ
کس دن ہمارے قتل پہ باندھے کمر نہ تھا

جیسا کہ اشعار مندرجہ بالا سے ظاہر ہے۔ پختگی و مشاقی، الفاظ کی عمدہ بندش، روزمرہ و محاورہ کا صرف اور رعایت لفظی کا التزام حضرت زارؔ کے کلام کی خصوصیات ہیں مگر حقیقت اور اصلیت کے فقدان کے باعث ان کے اشعار روکھے اور پھیکے اور جوش و تاثیر سے خالی ہوتے ہیں پھر بھی نازک خیالی اور مضمون آفرینی کے باعث بعض بعض شعر خوش گوار ہوتے ہیں۔

زارؔ کے کلام کی نایابی کے باعث تفصیلی تبصرہ نہیں کیا جا سکا۔

۲۔ گھنشیام لال عاصیؔ دہلوی

منشی گھنشیام لال عاصیؔ مرزا غالبؔ اور استاد ذوقؔ کے ہمعصر اور شاہ نصیرؔ کے مایۂ ناز شاگرد تھے۔ ان کے بزرگ سلطنت مغلیہ کے عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے پدر بزرگوار رائے چنی لال شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں دیوانی کے عہدہ پر ممتاز تھے۔ ان کے برادر زادہ کلاں منشی مکند لال بہادر شاہ

کے میر منشی تھے۔

حضرت عاصی ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۵ء میں وفات پائی۔ یہ مرزا بابر خلف اکبر شاہ ثانی کی ملازمت میں تھے۔ اپنے زمانہ کے ہر فن میں استاد مانے جاتے تھے۔ خصوصاً خوشنویسی، موسیقی اور پیراکی میں انھیں کمال حاصل تھا۔

منشی بنسی لال عاصی کے تنہا فرزند تھے جو علاقہ انگریزی میں تحصیلدار تھے۔ منشی بنسی لال کے تین فرزند تھے جن میں منشی بنس گوپال المتخلص بہ شاعر سب سے بڑے تھے۔ ان ہی نے دیوان عاصی کا قلمی نسخہ برائے طباعت پروفیسر من موہن لال ماتھر سکریٹری کایستھ اردو سبھا دہلی کو عنایت فرمایا تھا جو اکتوبر ۱۹۳۹ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔

عاصی کا مطبوعہ مجموعہ کلام[1] ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ردیف دار غزلوں کے علاوہ چند قصیدے اور قطعات ہیں۔ ان کے علاوہ چند مخمس، مسدس اور تاریخیں بھی ہیں۔

عاصی کو مختلف اصناف سخن اور زبان پر پوری دسترس حاصل تھی۔ طبیعت میں شاعری کا لگاؤ فطری تھا۔ راجا جیت سنگھ برادر مہاراجہ پٹیالہ جو دہلی میں قیام کرتے تھے ان کے بڑے معتقد تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک دن یہ مصرعہ پیش کیا اور گرہ چاہی ؎

آہنیں بنوائے پہلے مرغ آتشگیر چونچ

عاصی نے فوراً یہ مصرع چست کر دیا۔ ؎

---

(۱) عاصی کے مطبوعہ مجموعہ کلام سے ان کے حالات زندگی اور کلام کا اقتباس پیش کیا گیا ہے۔

اے ہما تب استخواں پہ دل جلوں کے چیر چونچ

اسی طرح پر عاصی نے پوری غزل کہہ ڈالی جس کا مقطع یہ ہے ؎

بلبل باغ سخن وہ ہوں کہ میرے روبرو　　　بند ہو طوطی کی اے عاصی دم تقریر چونچ

عاصی آزاد طبع اور صاف گو تھے۔ ان کے دو نواسے منشی بہاری لال مشتاق اور منشی گوری شنکر قیصر دہلوی بھی اچھے شاعر ہوئے ہیں چنانچہ قیصر کا ایک شعر یہ ہے ؎

کیوں ہوں نہ قیصر آپ سخن سنج سخنور　　　مشتاق کے بھائی ہیں تو عاصی کے نواسے

منتخب کلام

شوخی و شگفتگی اور جدت تخیل

بری بلا ہے یہ کاکل کا ہائے کالا سانپ　　　دلا نہ چھیڑ یہ کالوں سے ہے نرالا سانپ

نہیں ہے آپ کا موباف سرخ سانپ سے کم　　　بجا ہے اس کو اگر کہیے ہاں رنگیلا سانپ

چمکتا کان کا موتی ہے زلف پیچاں میں　　　نکالے بیٹھا ہے یا اپنا منکا کالا سانپ

کوئی جہان میں کاٹا ہوا نہ جس کا جیا　　　وہ قہر آپ نے جعد سیہ کا پالا سانپ

شب میں نے کہا جب کہ نہ جاؤ ابھی ہے رات　　　زلفوں کو اٹھا کر یہ کہا رات نہیں اب

عاصی کی شب و روز جو گریاں رہیں آنکھیں　　　پھر کون بھلا کہوے کہ برسات نہیں اب

زلف اٹھا کر منہ جو لے رشک قمر دکھلا دیا　　　شام ہی کو تو نے بس نور سحر دکھلا دیا

عاصی کا مندرجہ ذیل شعر جدت ادا کے لئے مشہور ہے ؎

چڑھے جو بام پہ تم کر گیا کنارا چاند

اب آ کے جانے دو تم جیتے اور ہارا چاند

اس قسم کے چند اور شعر یہ ہیں :۔

بلبلو عارض رنگیں صنم گر دیکھو
پھر طرف گل کی نہ زنہار نظر بھر دیکھو

ہمسر ابر گہر بار ہے کیا دیدۂ تر
رو کش برق ہے میرا دل مضطر دیکھو

ساتھ رخ کے ترے کس روسے اسے دوں نسبت
کہ سیاہی سی نمایاں ہے قمر کے اندر

ستم ہے میں ہوں عین وصل میں ناکام جوں ساحل
کہ لب ہیں خشک میرے اور ہے آغوش میں دریا

عاصی کی طبیعت میں شوخی بہت تھی چنانچہ اس کا رنگ ان کے ان اشعار میں بھی نمایاں ہے جن میں انھوں نے درد و فرقت کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

غم فرقت سے گل اندام کے اے یار آہ
سوکھ کر خار بنا یہ تن لاغر دیکھو

جھڑی آٹھوں پہر آنکھوں سے اشکوں نے لگائی ہے
اٹھے گا ایسا طوفاں قافیہ ہو تنگ باراں کا

مضمون آفرینی اور بندش الفاظ ملاحظہ ہو :۔

وجودی اور شہودی میں شرف حق ہے انساں کا
نفس کی آمد و شد پر ادا ہو شکر یزداں کا

خط ریحاں سے چمکا حسن دوبالا روئے جاناں کا
چڑھایا بوستاں پر حاشیہ کس نے گلستاں کا

جلیں ہیں رات دن ہم اور وہ اک رات جلتی ہے
لگن میں مرتبہ کم مجھ سے ہے شمع شبستاں کا

اے زاہد تری شہوت پرستی ہو گئی ظاہر
فقط اک نفس کی خاطر یہ چرچا حور و غلماں کا

لکھے دیوار کے سینوں پہ ہیں اشعار عاصی کے
جمع کرنا ہے مشکل آپ کے دفتر پریشاں کا

معنی آفرینی اور صفائی و روانی :۔

خاک در پر تیری گر یہ نہ جبیں سا ہوتا
تو فروغ اس مہ انور کا نہ اتنا ہوتا

چاک زنہار روش گل کے نہ سینہ ہوتا — عشق گر وہ نہ اگر ہار گلے کا ہوتا
کیوں پریشانی خاطر ہمیں ہوتی گر دل — نہ گرفتار خم زلف چلیپا ہوتا
درد پہلو میں مرے کس لئے اٹھتا ظالم — وہ دلآرام مرے پاس جو بیٹھا ہوتا

عشاق کا دم ہے بت خود کام نکلتا — جب گھر سے تو ہاں لے کے ہے صمصام نکلتا
چھٹ آہ کے کچھ اور ترے دھیان میں منہ سے — ہرگز نہیں لے زلف سیہ فام نکلتا
حسرت دل شیدا کی نکل جاتی بہر رنگ — گر جی کبھی ترے آگے گل اندام نکلتا
ہر لحظہ ترا ذکر مرے ورد زباں ہے — ق — ہر دم مرے منہ سے ہے ترا نام نکلتا
اور تیری یہ خوبی ہے کہ تو مجھ کو شب و روز — رستے میں ہے دیتا ہوا دشنام نکلتا
کرتی نہ اگر خانہ خرابی تری الفت — تو گھر سے یہ کیوں عاصی بدنام نکلتا

کیا تیزیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی — ٹھہرے نہ جس پہ ران کسی شہ سوار کی
دیکھی تڑپ جو میرے دل بے قرار کی — لوٹا کی برق گود میں ابر بہار کی

دروازے سے بیٹھے ہیں لگا کر ترے سر ہم — اے خانہ خراب اٹھ کے بہلا جائیں کدھر ہم
دانہ کے عوض دام میں یاں شام و سحر ہم — منقار سے بس کھاتے ہیں نوچ اپنے ہی پر ہم
قاتل ترے کوچہ میں کریں کیوں نہ گذر ہم — جاتے ہیں سدا رکھ کے وہاں ہاتھ پہ سر ہم
اس پہلو میں خنجر ہے ادھر تیر ہے عاصی — لے سکتے ہیں کروٹ نہ اُدھر ہم نہ اِدھر ہم

ادھر اپنے رخ روشن پہ زلف اس نے پریشاں کی — ادھر خورشید پہ چھائی گھٹا بس آکے جھٹ کالی
سیہ چوٹی نہیں ہے ساعد سیمیں پہ لے عاصی — یہ شاخ صندلی سے ہے گئی ناگن لپٹ کالی

پیتا تھا بزم غیر میں دلبر شراب رات — اور دل تھا اپنا آتش غم سے کباب رات

جھٹکا نہ دینا زلف کو زنہار دیکھنا — اٹکا ہے اس میں یہ دل بیمار دیکھنا

حسن کی گرمی سے آہو نے نکالی ہے زباں　　کب قریب چشم یہ سرمے کا دنبالہ ہے آج

مشکل اور نادر ردیف والی کچھ غزلوں کے چند شعر:۔

تمھارا عاشق جو کھینچے نالہ فلک کے نیچے زمیں کے اوپر
تو ہو قیامت پھر ایک برپا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر

ذرا بھی آنکھیں اٹھا کے یارب جو سوئے شمس و قمر نہ دیکھیں
کئے ہیں خوباں وہ تونے پیدا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر

الٰہی کیا جانیں ہم ہے کیا کیا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
جو کچھ ہے خالق تو ہی ہے سب کا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر

ہر ایک تجھ کو ہے یاد کرتا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
ہر ایک جپتا ہے نام تیرا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر

کریم و پروردگار ہے تو کرم ہیں لیل و نہار تیرے
ہر ایک کو رزق ہے پہونچتا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر

تو اپنی خوبروئی پر غرور اتنا نہ کر ناداں　　کہ ہرگز حسن کا عالم نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا

دل بیتاب کو آئے قرار اے ہمدمو کیونکر　　کہ پارہ جانتے ہیں ہم نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا

جو ہیں کم اصل ان کا اصل سے پیوند کیونکر ہو　　طلا پر رانگ کا ٹانکا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا

تری تجلی کو دیکھ اے جاں ملک فلک پہ زمیں پہ انساں
کمال بے خود ہیں اور پریشاں ملک فلک پر زمیں پہ انساں

عجب ہے عشوہ غضب ہے غمزہ طلسم بالوں میں کیا بلا ہے
کتابی صورت پہ جائیں قرباں ملک فلک پر زمیں پہ انساں

گریہ میں ابر و دیدۂ تر دونوں ایک ہیں ۔ عاشق تڑپ میں برق و جگر دونوں ایک ہیں
صورت میں گرچہ فرق ہے پر دونوں ایک ہیں ۔ بل کھانے میں تو زلف و کمر دونوں ایک ہیں
گا ہے فراق رخ ہے گہے ہجر زلف یار ۔ آفت زدوں کو شام و سحر دونوں ایکسا ہیں

ایک ضرب المثل غزل کے چند شعر:۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے
رہے دل میں ہمارے رنج و الم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
کبھی کعبہ میں ہم نے نہ سجدہ کیا کبھی دیر میں ہم نے جبیں نہ گھسی
رہے آہ اسی افسوس میں ہم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے
نہ وصال ہوا نہ وصال ہوا اسی رنج و عذاب سے لے عاشق
شب و روز بہاتے ہیں چشم سے یم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے

حضرت عاشق ایک پُرگو مشاق اور باکمال شاعر تھے۔ ان کے کلام میں مرزا سودا کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی شوخی و شگفتگی اور جدت تخیل و مضمون آفرینی کے ساتھ زبان کی صفائی اور کلام کی روانی بدرجہ احسن پائی جاتی ہے۔ مگر سوز و گداز جو تغزل کی روح ہے عنقا صفت ہے۔ ان کے کلام کا اثر بجائے دل کے دماغ پر زیادہ ہوتا ہے۔ جملہ علوم و فنون سے واقفیت رکھنے کے باعث ان کے کلام میں ہر فن کی اصطلاحات بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ان کی قادر الکلامی کا خاص ثبوت ان کی وہ متعدد غزلیں اور نظمیں ہیں جن میں انھوں نے مشکل اور نادر ردیفیں انتخاب کی ہیں اور کمال کے ساتھ انھیں نباہا ہے۔ انھوں نے دو غزلے اور سہ غزلے بھی خوب کہے ہیں۔ وہ مطلع کی تکرار کے بھی شایق تھے۔ ایک مسدس

بے نقط اور ایک فارسی غزل صنعت رقطع میں کہہ کر اپنے شاعرانہ کمال کا اظہار کیا ہے۔
حالانکہ اس دور کا اردو کا سب سے بڑا ہندو شاعر پنڈت دیا شنکر کول نسیم لکھنوی ہوئے ہیں مگر نسیم لکھنؤ کے سب سے بڑے اور نامور ہندو شاعر تھے۔ اور عاصی دہلی کے۔ اس کے علاوہ عاصی نسیم کی وفات کے بعد بھی بائیس سال تک زندہ رہے۔ اس لحاظ سے عاصی کا مرتبہ دہلی کے و نیز نسیم کی وفات کے بعد اس دور کے تمام ہندو شعرا میں بہت بلند ہے۔

۳۔ منشی ہرگوپال تفتہ سکندر آبادی

منشی ہرگوپال تفتہ ولد منشی موتی لال کایستھ بھٹناگر سکندر آباد ضلع بلند شہر کے باشندہ تھے۔ ان کا سن ولادت ۱۷۹۹ء ہے۔ انگریزی محکمہ بندوبست میں یہ مدتوں قانون گو رہے۔ شاعری کے شوق میں ملازمت کو خیرباد کیا۔ کچھ دنوں ریاست جے پور میں بھی ملازم رہے۔ ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء کو سکندر آباد میں وفات پائی۔ اولاد میں دو بیٹے اور ایک بیٹی یادگار چھوڑے۔
تفتہ مرزا اسداللہ خاں غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے۔ مرزا غالب کو ان سے نہ صرف انس تھا بلکہ اپنا سرمایہ ناز تصور کرتے تھے۔ اور ہمیشہ عزیزداری کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ مرزا تفتہ کا لقب انھیں نے عنایت کیا تھا۔

مرزا تلامذۂ غالب" از مالک رام ص۹۷ میں سنہ ۱۸۰۰ء درج ہے۔

اردوئے معلیٰ میں مرزا غالبؔ کے اکثر خطوط تفتہ کے نام کے ہیں۔ تفتہ نے عمر کا زیادہ حصہ اپنے وطن سکندر آباد اور نواح دہلی میں گذارا۔ مرزا غالبؔ کے دس سال بعد انتقال کیا۔

تفتہ نے فارسی میں ہزاروں غزلیں حافظ، عرفی، ظہوری، نظیری، صائب اور جامی وغیرہ فارسی اساتذہ کی غزلوں پر کہی ہیں۔ ان کا فارسی کا کلام اس پایہ کا ہوتا تھا کہ اُسے سن کر اہل زبان ستایش کرتے تھے۔ اردو میں طبع آزمائی نہیں کرتے تھے۔ مگر شاگردوں کے اردو کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ منشی بال مکند بیصبر سکندر آبادی آپ ہی کے مایہ ناز شاگرد تھے۔

ان کے اردو کلام میں اب تک صرف حضرت غالبؔ کی ایک تاریخ وفات دستیاب ہو سکی ہے جو تبرکاً ذیل میں درج کی جاتی ہے[1]

غالبؔ وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے ۔۔۔ ہم سے ہزار ہیچمداں نامور ہوئے

فیض و کمال صدق و صفا اور حسن و عشق ۔۔۔ چھ نقطہ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

۴۔ بال مکند بیصبر سکندر آبادی

منشی بال مکند بیصبر خلف لالہ کانجی مل کایستھ بھٹناگر سال ولادت ۱۸۳۰ء سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے، جہاں کے تفتہ تھے اور ان سے کچھ

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد دوم صفحہ ۱۱۵، صفحہ ۱۱۶

عزیز داری بھی تھی۔ بہت صغر سنی میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ چندے تفتہ سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ غالباً فارسی کے علاوہ عربی و سنسکرت بھی جانتے تھے۔ مدتوں محکمہ مال سرکار انگریزی میں منشی گری اور داروغگی کے عہدہ پر متمکن رہے۔ اسی سلسلہ میں دہلی میں سکونت کا اتفاق ہوا اور اس طرح مرزا غالب سے ملنے کی تقریب نصیب ہوئی جس سے وہ ان کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو سکے۔ ۱۸۵۵ء میں ان کا قیام میرٹھ میں تھا۔ پنشن پاتے تھے۔ ستر برس کی عمر میں ۱۸۹۰ء میں انتقال ہوا۔

بیصبر اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ دونوں زبانوں میں صاحب دیوان بھی تھے۔ نامی استادوں میں شمار ہوتا تھا۔ متعدد شاگرد تھے۔ جن میں منشی بنواری لال شعلہ علی گڈھی شہرۂ آفاق ہوئے۔ بیصبر، ذوق، مومن، غالب، تفتہ اور شیفتہ وغیرہ شعرائے باکمال کے ہمعصر تھے۔ دیوان اور ایک مثنوی "لخت جگر" یادگار چھوڑا۔ اس مثنوی میں تقریباً ڈھائی ہزار اشعار ہوں گے۔ ایک دوسری مثنوی "اخگر عشق" غیر مطبوعہ رہ گئی۔ یہ مثنوی ۱۸۵۶ء میں لکھی گئی تھی۔

نمونہ کلام[1]

جبکہ بسم اللہ وصف عارض جاناں ہوا — مطلع خورشید اپنا مطلع دیواں ہوا

گھر ہوا ویران جب اپنا گھر ہوا ویرانہ میں — میں رہا صحرا میں صحرا میرے گھر مہماں ہوا

---

[1] ماخوذ از "تلامذہ غالب" از مالک رام ص۵۳، ص۵۶ و نیز تذکرہ آثار الشعرائے ہنود مرتبہ بشاش ص۳۲-۲۶

شور سن کر جس کو دیوانہ کہا کرتے تھے آپ — اب وہی بیقبر دیکھو صاحب دیواں ہوا

بندش کی چستی اور کلام کی روانی

گھبرائی سی کسی کی ستائی ہوئی سی ہے — اپنی طبیعت اب کہیں آئی ہوئی سی ہے

دست جنوں سے باقی ہے اک آستیں سودہ — تیزاب اشک تر کی جلائی ہوئی سی ہے

رہنے لگا جو مجھ سے غبار اس کے دل میں اب — یہ خاک تو صبا کی اڑائی ہوئی سی ہے

سوز جگر یہ اپنا نہیں خود بخود ضرر — یہ آگ تو کسی کی لگائی ہوئی سی ہے

بوٹا سا قد چھریرا بدن چمپئی سا رنگ — بھولی سی صورت آنکھ لجائی ہوئی سی ہے

بیقبر روتے ہیں پہ نکلتی نہیں ذرا — رقت کچھ ایسی دل میں سمائی ہوئی سی ہے

کمر نہیں ہے تو ذکر اس کا موبمو کیا ہے — دہن نہیں ہے تو پھر اس میں گفتگو کیا ہے

نہیں ہے صبر تو بیقبر ہے تلاش عبث — جو چیز کھوئی گئی اس کی جستجو کیا ہے

فتور پیری نے آکے قویٰ میں ڈال دیا — سحر نے تفرقہ مہماں سرا میں ڈال دیا

دل اپنا قابوئے زلف دوتا میں ڈال دیا — الٰہی تو نے مجھے کس بلا میں ڈال دیا

صبا نے کیا یہ خطا کی کہ زلف اس کی ہلا — ختن میں زلزلہ لرزہ خطا میں ڈال دیا

بے خودانِ عشق کو کیا حاجت ترک لباس — تن سے پیراہن جدا ہوتا نہیں تصویر کا

آدمی کی کٹتی ہے بیقبر کس سختی سے عمر — پیر ہونا طفل کا لانا ہے جوئے شیر کا

لطافت تشبیہ و استعارہ اور مضمون آفرینی

نقاب دیکھ کے مجھ کو لیا ذقن تک کھینچ — گھٹا کے بدر کو کافر ہلال تو نے کیا

۱؎ اسی زمین میں مرزا غالب کی بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

رخصت وہ ہوا اشک ہمارے نکل آئے — خورشید کے چھپتے ہی ستارے نکل آئے
سبو غنچہ لئے لالہ لئے پیمانہ آتا ہے — چمن میں موسم گل کس روش مستانہ آتا ہے

فصاحت زبان و بندش الفاظ

صبا نے جو اُن کو سحر گدگدایا — گئے لوٹ گل ہائے ترکیسے کیسے
غر غیر کو دیکھنا بچشم عتاب — دیکھنے کا بہانہ تو دیکھو
یاد جب مجھ کو یار آتا ہے — گریہ بے اختیار آتا ہے
زمیں سے آسماں اور آسماں سے لامکاں پہونچے — تلاش یار میں دیکھو کہاں سے ہم کہاں پہونچے
تیغ ابرو شہرۂ آفاق ہے — چشم بد دور اپنے فن میں طاق ہے

متفرق اشعار

اٹھا نہ بہر خدا ہم کو اے سگِ درِ یار — ہزار منت درباں اٹھا کے بیٹھے ہیں
مریض غم کو ترے تا کہ پھر نہ منھ دکھلائیں — مسیح چرخ چہارم پہ جا کے بیٹھے ہیں
پیش ابرو سجدہ جائز ہو گیا آفاق میں — رکھ دیا محراب کو سب نے اٹھا کر طاق میں
رتاک میں اپنی لگا ہے محتسب — دخت رز سے جب سے یارانہ ہوا

رباعیات

آخر ترے غم میں مر گئے ہم — بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم
بیقبر نہ جان کا کیا خوف — اس کوچے میں بے خطر گئے ہم
اس دل نے کیا خراب مجھ کو — دکھلائے نہ کیا عذاب مجھ کو
بیقبر میں اس زندگی سے ہوں تنگ — دے موت خدا اشتاب مجھ کو

بیقبر کے کلام میں عموماً حسن وعشق کا ہی تذکرہ ہے۔ اس میں نہ

کوئی تصوف ہے نہ فلسفہ۔ سوز و گداز کا بھی دخل بہت کم ہے۔ پھر بھی لطافت تغزل بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ کلام رعایت لفظی کے عیب اور ابتذال و رکاکت سے پاک ہے۔ مضمون آفرینی، جدت بیان، شیرینی زبان اور شگفتگی و رعنائی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ لطیف تشبیہہ و استعارہ کے استعمال سے اکثر اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ زبان کی فصاحت و سلاست کے ساتھ بندش کی چستی اور کلام کی روانی خوب ہوتی ہے۔

۵۔ مہاراجہ بلوان سنگھ۔ راجہ اکبر آبادی

آپ مہاراجہ چیت سنگھ والی ریاست بنارس کے خلف ارشد تھے۔ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے مورث اعلیٰ راجہ منسارام گنگاپور (ضلع بنارس) کے زمیندار تھے۔ راجہ چیت سنگھ انگریزوں کے خوف سے ریاست گوالیار میں پناہ گزیں ہوئے تھے اور وہیں ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد ان کے لڑکے مہاراجہ بلوان سنگھ سرکار انگریزی کی منظوری سے آگرہ میں آبسے اور چالیس سال تک آگرہ میں تشریف فرما رہے۔ آپ کے لئے بنارس راج سے دو ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر تھی جس سے آپ ایک رئیس اعظم کی طرح آگرہ میں رہتے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں آپ نے انتقال کیا۔

شاعری کا شوق آپ کو آگرہ میں وہاں کے منتخب اور نامی شعرا مثل گلزار علی اسیر اور مرزا حاتم علی مہر کی صحبت میں پیدا ہوا۔ اور انھیں سے آپ نے مشورہ سخن

بھی لیا۔ آپ بڑے قادر الکلام ذکی اور طباع سخنور تھے۔ تلاش مضامین نو کی طرف خاص رغبت تھی اور اس کے ساتھ ہی زبان کی صفائی کا اس قدر خیال تھا کہ کیا مجال اسلوب میں ذرا بھی دقت یا الجھاؤ پیدا ہو مشکل زمینوں میں خوب خوب شعر نکالتے تھے۔ شاعروں کے بڑے قدر دان تھے۔ ہمیشہ دولت کدے پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ آپ کا دیوان موسوم بہ "گل ریاض" ۱۸۵۳ء میں عظیم الاخبار پریس آگرہ سے طبع ہوا۔ آپ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔

نمونہ کلام[۱]

بندش الفاظ و مضمون آفرینی

حرف بالش نہ ہوئے بلبل گلزار کے پر — کچھ بھی کام آ نہ سکے طایر بیکار کے پر

وہ سیہ بخت ہوں روشن ہو اگر شمع مزار — جمع پروانے ہوں گل کر دیں اسے مار کے پر

شش جہت میں ہے یہی ظلم عنادل کے نصیب — دو کے پر باندھے گئے کترے گئے چار کے پر

اب کبوتر کو مرے طاقتِ پرواز نہیں — گر پڑا چونچ سے خط ڈال دئے ہار کے پر

شیخ ناراض ہو ہم سے کہ برہمن روٹھے — ہوں گے پابند نہ ہم سبحہ و زنار کے پر

کیا سوتی ہے لیلیٰ تو پڑی خواب لحد میں — روتا ہے کھڑا قیس بچارا سرِ تربت

اے قیس تری جان کی نہیں خیر نہیں خیر — خالی ہے کھڑا ناقۂ لیلیٰ سرِ تربت

ہیں بے خبر ایسے کہ خبر ہم نہیں رکھتے — دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے

۱؎ ماخوذ از تذکرہ آثار الشعرائے ہنود مرتبہ بشاش ص۱۷۵، ص۱۷۶، ونیز تذکرہ ہندو شعرا مولفہ برق سیتاپوری ص۱۶۳

جس جا پہ گرے تھک کے وہی گھر ہے ہمارا
دیوانے ہیں سودائی ہیں گھر ہم نہیں رکھتے

کیا تم کو تصدق کریں کیا نذر دیں تم کو
دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے

کیسا خیالِ ہجر شبِ وصل آ گیا
یا سرخ تھا میں یا کہ ہوا ایک بار زرد

عاشق کا رنگ زرد نہ ہو کیونکہ ہجر میں
کر دیتی ہے خزاں شجر و برگ و بار زرد

خانۂ دل میں خدا دخل بتوں کا نکلا
کعبہ ہم سمجھے تھے جس کو وہ کلیسا نکلا

رنگ مہندی کا نہیں شام و سحر ہاتھ میں ہے
پنجۂ مہر ترے رشک قمر ہاتھ میں ہے

دست مشاطہ نے زلفوں کو بنایا افعی
صاف پیدا کفِ موسیٰ کا اثر ہاتھ میں ہے

دانتوں پہ موتی تصدق کر کے جانی بھیجئے
جاں بلب ہوں اب تو آبِ زندگانی بھیجئے

کشتۂ ابرو کو کیجئے دفن بیت اللہ میں
قیدیٔ گیسو کو صاحب کالے پانی بھیجئے

آستانِ یار پر ہم جبہ سائی کرتے ہیں
دیکھیں کیا ہوتا ہے قسمت آزمائی کرتے ہیں

کوئی مرتا ہے کوئی جیتا ہے ان کے حکم سے
اللہ اللہ آج کل بت بھی خدائی کرتے ہیں

تغزل کے پردہ میں آپ اپنے زمانہ کے پُرآشوب سیاسی حالت اور انگریزی حکومت کے مظالم پر یوں چوٹ کرتے ہیں۔

اقلیم کبھی زیرِ نگیں رہتے تھے راجہ
اب حرف بھی غالب ہے نگیں پر نہ رہیں گے

معلوم نہیں ہاتھ کرے گا وہ کدھر صاف
تلوار ملی باتی ہے ہوتی ہے سپر صاف

مرغان قفس کو نہ تو دانہ ہے نہ پانی
صیاد گذرتے ہیں انہیں آٹھ پہر صاف

قاتل سے کہیں کیا دل افگار کا احوال
ہر وقت وہاں میان سے تلوار ہے باہر

لے آئینہ رو جھانک کے غرفہ سے ذرا دیکھ
اک خلق کھڑی نقش بہ دیوار ہے باہر

کس تاک میں آتا ہے تو اے دردِ محبت
دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے

مشکل ردیف میں :-

مطیع خوبوں کے خلق پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
صنم بھی کرنے لگے خدائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
جنھیں تھا دعوائے میرزائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
نصیب ہے اب برہنہ پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
صنم کدہ سے کسے تھی فرصت حرم میں آنا ہے اتفاقاً
غضب ہے ہم اور پارسائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
شروع کی میں نے جو چھیڑ ان سے تو جھ سے تیوری چڑھا بولے
تو ہم سے کرتا ہے ہاتھا پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
فقط مجھی کو نہیں ہے الفت مطیع شاہ و گدا ہیں راجہ
صنم بھی کرنے لگے خدائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت حزن و یاس اور سوز و گداز ہے جو برٹش حکومت کے ہاتھوں تخت و تاج سے محرومی کا لازمی نتیجہ ہے۔ معشوق کے ظلم و ستم اور بے وفائی و سفاکی کا گلہ کرکے در پردہ آپ نے برٹش حکومت کے مظالم پر نکتہ چینی کی ہے۔ آپ کے کلام میں نزاکت تخیل اور ندرت بیان کے ساتھ ساتھ زبان کی فصاحت و سلاست اور بندش کی چستی و کلام کی روانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لطافت تغزل آپ کے کلام میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ مشکل ردیفا اور قافیہ میں دلچسپ و دلگداز شعر کہنا آپ کی قادر الکلامی اور مشاقی کا ثبوت ہے۔ تناسب لفظی کا آپ نے بہت کم استعمال کیا ہے اور جہاں استعمال کیا بھی ہے وہاں بجائے

عیب کے حسن کلام میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۶۔ پنڈت شمبھر ناتھ منشی۔ ہجر لکھنوی

ان کے پدر بزرگوار کا نام پنڈت بدری ناتھ منشی تھا۔ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے اور بیالیس برس کی عمر میں ۱۸۶۶ء میں انتقال کیا۔ بڑے بہادر اور فن سپہ گری کے ماہر تھے۔ مزاج میں بانکپن اور متانت کا رنگ حاوی تھا۔ ضلع ہردوئی میں کچھ دنوں کوتوال تھے۔ بعد میں ہردوئی کے ڈپٹی کمشنر کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں تک چودھری حشمت علی صاحب تعلقہ دار ضلع ہردوئی کی نیابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مگر وہاں زیادہ عرصہ تک قیام نہ کر کے لکھنؤ چلے آئے۔

ان کا دیوان ان کے ابتدائی کلام کا فراہم کیا ہوا ۸۰ صفحات کا مجموعہ ہے۔ ان کے زمانہ شباب کا پختہ کلام گم ہو گیا۔

ہجر خواجہ حیدر علی آتش کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

آگ پانی میں لگاتے ہیں جو مضموں اپنے
گرمیٔ صحبت آتش کا اثر دیکھتے ہیں

ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

کلام ہجر کا قایل ہے آتش
ہنر کا قدرداں اہل ہنر ہے

نمونۂ کلام[1]

ہجر کا مندرجہ ذیل شعر زبان زد خلایق ہو گیا ہے ؎

ساتھ پردوں میں عبث چھپتے ہو ناحق ہے حجاب
ہم تصور میں تمھیں آٹھ پہر دیکھتے ہیں

اس غزل کا ایک اور شعر یہ ہے ؎

صاف پہلو سے چرا لیتے ہیں دل کو دیکھو — جس کی جانب کو وہ دزدیدہ نظر دیکھتے ہیں

تصوف و معرفت

چشم مجنوں سے کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے — منزلوں حسن سے آباد ہے ویرانۂ عشق
لامکاں گوشۂ خلوت ہے اک اس کا اے ہجر — عرش سے فرش تلک سب ہے جلوہ خانۂ عشق

ترک دنیا

بزم عالم میں وجود اپنا سمجھتے ہیں عدم — بیٹھے ہیں محفل میں لیکن ہیں الگ محفل سے ہم
کس قدر ہیں غرق گرداب محیط بے خودی — عین دریا میں پڑے ہیں بےخبر ساحل سے ہم

بندش کی چستی اور مضمون آفرینی

دونوں ابرو ہیں کہ قاتل کے مقابل قاتل — ہمدگر ہیں کہیں لڑ جائیں نہ قاتل قاتل
زلف و ابرو و مژہ چشم خط و خال سبھی — سچ تو یہ ہے کہ ہے قاتل ترا تل تل قاتل

آہوں کا سوے عرش جو ہوگا دھواں رواں — سر پر زمیں کے ہوگا نیا آسماں رواں
ناداں نہ ہو چمن کی یہ بربادیاں نہ کر — دو دن میں تو بھی باغ سے ہوگی خزاں رواں

---

[1] ماخوذ از بہار گلشن کشمیر جلد دوم ص ۶۴۶، ص ۶۶۳

مصحف رخ کے مجاور ہیں یہ ہندو دونوں ‏— اب تو کافر رہے یار کے گیسو دونوں
سرو شمشاد کو کچھ بھی نہیں اس کی پروا — قمری و فاختہ کرتے رہیں کوکو دونوں

اندھیر دیکھو جا کے پھنسا زلف یار میں — سودائی ہو گیا ہے دل بے قرار کیا
نظروں میں گل رخوں کی کھٹکتا ہوں اسقدر — کانٹا بنا ہے سوکھ کے یہ جسم زار کیا

گنتی میں اب گناہ ہمارے نہیں رہے — جو بے حساب چیز ہے اس کا شمار کیا
برباد کر رہی ہے جو تو ہم کو اے صبا — ہم مشت خاک کیا ہیں ہمارا غبار کیا

بار الم فرقت جاناں نہ اٹھے گا — مر جائیں گے ہم صدمۂ جاناں نہ اٹھے گا
کیا سہل ہے یار غم الفت کا اٹھانا — یہ بوجھ بڑا ہے دل ناداں نہ اٹھے گا
پہلو میں نہ ہوگا جو وہ خورشید قیامت — اے ہجر کبھی لطف زمستاں نہ اٹھے گا

تشبیہ چشم یار کو آہو سے تم نہ دو — دیکھو کہاں بشر کی کہاں جانور کی آنکھ
جلوہ دکھا گئی ہے جو برق نگاہ یار — جھکی ہوئی ہے شرم سے شمس و قمر کی آنکھ

اے گبر شیخ سب یہ سمجھ کا فتور ہے — دیر و حرم کہاں نہیں اس کا ظہور ہے
دنیا میں بھی بہشت ہے زندوں کے واسطے — جام شراب ہاتھ میں پہلو میں حور ہے

کاش کہ ہندو مسلماں میں نہ ہوتا یہ نفاق — ایک جا یہ کافر و دیندار اوٹھتے بیٹھتے
بتکدوں میں لٹ رہی ہے دولت دیدار یار — مسجدوں میں مفت ہیں دیندار اوٹھتے بیٹھتے
جان کے ہمراہ دم کے ساتھ ہیں رنج والم — گرد رہتے ہیں مرے غمخوار اوٹھتے بیٹھتے

شیرینیٔ زبان، سلاست کلام اور علوئے تخئیل

پیش نظر ہے صورت جاناں تمام رات — کرتے ہیں ہم تلاوت قرآں تمام رات
حیرت ہے رات بھر ترے منہ کو تکا کیا — کیا کیا جلا کیا مہ تاباں تمام رات

نیند آگئی تصور کاکل میں سو گیا — دیکھا کیا میں خواب پریشاں تمام رات
اے ہجرؔ ہم تو تاروں کو بیٹھا گنا کئے — چلتے رہے وہ ماتھے پہ افشاں تمام رات

کہیں کہیں یہ ابھی یادگار باقی ہے — مٹا مٹا سا جو نقش مزار باقی ہے
نہ وہ چمن ہے نہ وہ گل نہ وہ ہوائے بہار — ہزار حیف کہ تنہا ہزار باقی ہے

اے دل نہ بتوں کی التجا کر — توبہ توبہ خدا خدا کر
پامال جفائے چرخ ہوں گے — چلتے ہیں جو کہ سر اٹھا کر
اے دل گیسوئے یار کا عشق — سودائی ہوا ہے کچھ دوا کر
اے ہجرؔ جو تو ہے مرد عقبا — ترک دنیائے بے وفا کر

کھل گیا چہرے سے غصہ آپ کا — دیکھئے پھر رنگ بدلا آپ کا
سچ تو یہ ہے کون میری سی کہے — ایک میں سارا زمانا آپ کا

حقایق زندگی و تجربات دنیوی

جل بجھ کے خاک ہو گئے اک حور کے لئے — مٹی میں مل گئے بت مغرور کے لئے
دنیائے دوں میں رنج بھی راحت کے ساتھ ہے — ہے نیش بھی جو نوش ہے زنبور کے لئے
جاری رہیں جو آنکھ سے آنسو تو خوب ہیں — بہنا بہت مفید ہے ناسور کے لئے
اے ہجرؔ سامنا شب ہجراں میں چاند کا — یہ داغ اور ہے دل رنجور کے لئے

بہار گل تو دوبارہ بار آتی ہے — شباب کی نہیں جا کر بہار آتی ہے

رندانہ شوخی و بے باکی

جو سنتے ہیں سب جھوٹ ہے واعظ کی کہانی — جنت ہے نہ دوزخ ہے جزا ہے نہ سزا پھر
میخوار ہیں تو ہم ہیں گنہگار ہیں تو ہم — واعظ تجھے کیا کام ہے کی ہم نے خطا پھر

سوز و درد

نہ دوڑا ساربان بس روک لے ناقہ کو لیلیٰ کے
مقام رحم ہے مجنوں تھکا ماندہ ہے منزل کا

ہے جائے رحم تیز روی ساربان نہ کر
مجنوں غریب ناقۂ لیلیٰ سے دور ہے

ہاں آتش جاں سوز محبت کی حرارت
پوچھے کوئی اس دل سے کہ جس دل سے لگی ہو

بے سوز دروں آنکھ سے آتا نہیں رونا
اشکوں نے بجھائی ہے جہاں دل سے لگی ہو

ہجر کے کلام کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں ابتذال و رکاکت نہیں ہے۔ اس لفظی رعایت سے بھی وہ پاک ہے جس کی اس زمانے میں ایک وباسی پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے اشعار سے آتش اور صبا کے حلقہ کا رنگ پھوٹا پڑتا ہے۔ زبان کی فصاحت، بیان کی شگفتگی، روزمرہ کی دلآویزی، بندش کی چستی اور مضامین کی برجستگی ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ کہیں کہیں سوز و درد کا پہلو اور تصوف و حقایق زندگی کا اظہار بھی خوب ملتا ہے۔ ان کے جو چند شعر یہاں پیش کیے گئے ہیں وہ ان کے ابتدائی کلام کا نمونہ ہیں۔ اگر ان کے زمانہ شباب کا کلام گم نہ ہو گیا ہوتا تو اس سے ان کے استادانہ کمال اور مشاقی و پختگی کا بھی کچھ اندازہ لگتا۔

نسیم لکھنوی کے کلام سے ہجر کے کلام کا رنگ جداگانہ ہے۔ وہ تناسب لفظی کے دلدادہ ہیں اور یہ زبان کی سلاست اور بے تکلفی کے گرویدہ ہیں۔ وہ طرز ناسخ کے مقلد ہیں اور یہ رنگ آتش کے پیرو ہیں۔

دورِ پنجم کے اوصاف و خصائص

یہ عہد اردو ادب کی تاریخ کا بہترین عہد تصور کیا جاتا ہے جس میں ذوق، غالب اور مومن ایسے شعرائے باکمال اور عدیم المثال کی خدمات کی بدولت اردو شاعری کو انتہائی عروج حاصل ہوا۔ اس عہد میں جہاں ایک طرف غالب اور مومن اردو شاعری کو علوئے تخیل، معنی آفرینی اور جدت بیان کے لحاظ سے اوپر اٹھانے کی جدو جہد کر رہے تھے وہاں دوسری جانب شاہ نصیر، ذوق اور ظفر وغیرہ نے زبان کی اصلاح اور صفائی پر کافی توجہ دی۔ مرزا غالب نے فلسفیانہ عنصر کا اضافہ کیا اور اردو شاعری کو روزمرہ زندگی کے رموز و نکات کی ترجمانی اور قلبی جذبات و واردات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ذوق نے پاکیزگی تخیل اور معنی آفرینی کے ساتھ زبان کی صفائی و سلاست اور روزمرہ و محاورے کے استعمال پر خاص توجہ دی۔

اس دور سے قبل ناسخ نے شاعری کی بنیاد تکلف و تصنع پر رکھی تھی جس سے اس میں لطف و اثر کی بڑی کمی ہو گئی تھی اور گلزارِ سخن میں خزاں کا عالم چھا گیا تھا۔ غالب اور مومن نے علوئے تخیل اور معنی آفرینی کے دریا بہا کر گلستانِ شاعری کی آبیاری کی۔ ذوق نے پاکیزگی تخیل اور سلاست زبان کے چشمے نکال کر اس کو تازگی بخشی جس سے اس کی پژمردگی اور افسردگی دور ہو کر اس میں موسم بہار کی پھر آمد ہوئی۔ عروس سخن کے چہرے سے تصنع اور بے اثری کا دھبہ دور ہوا اور اس میں رعنائی و دلکشی پیدا ہوئی۔

اس دور میں اردو شاعری کا مرکز لکھنؤ سے ہٹ کر ایک بار پھر دہلی میں قایم ہوا۔ لکھنؤ نے کوئی بھی ایسا اچھا شاعر نہیں پیدا کیا جو اساتذہ دہلی کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے بجز انیس اور دبیر کے جو مرثیہ گو تھے۔

اس دور میں غالب اور مومن کی طبیعتیں بہت جدت پسند واقع ہوئی تھیں جس سے انھوں نے مذاق عام کی پروا نہ کر کے اپنی فطری اپج سے شاعری میں کام لیا۔ انھیں اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ تصنع آمیز شاعری کے پرستاران کے کلام کی قدر کریں گے یا نہیں۔ ان کے برخلاف ذوق نے البتہ اپنے کلام کی صفائی اور محاورات وضرب المثل کی بیساختہ بندشوں سے مذاق عام رکھنے والوں کو مسحور اور گرویدہ کرنے کی بڑی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں جتنی قدر ذوق کے کلام کی ہوئی اتنی غالب اور مومن کے کلام کی نہیں ہوئی۔ غالب کے کلام کی خوبیوں کی طرف سب سے پہلے دور جدید کی باریک بیں اور نکتہ سنج نگاہیں متوجہ ہوئیں اس کے بعد غالب اردو کے سب سے بڑے مقبول خاص وعام اور مشہور خلایق شاعر جانے جانے لگے ہیں۔

اس دور میں تصوف وروحانیت کے مسائل اور نکات کو بھی نظم کرنے کی طرف شعرا نے کافی توجہ دی۔ چنانچہ ذوق اور غالب کے دیوان میں اس قسم کے متعدد اشعار ملتے ہیں حالانکہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ عشق مجازی ہی کا حامل ہے مگر ان کا معیار عشق بہت بلند ہے[1]

دور ما قبل کے مقابلہ میں اس دور کے شعرا نے بازاری اور مبتذل جذبات کو نظم کرنے سے بہت گریز کیا ہے۔ ان کا بیشتر کلام اس عیب سے پاک ہے۔ ان کے

۱؎ اردو غزل کی نشو ونما از ڈاکٹر رفیق حسین ص۲۱۵

انداز بیان میں صاف گوئی اور بے باکی کے بجائے متانت اور طنز آمیز شوخی پائی جاتی ہے۔ غزل کی ناہمواری عموماً دور ہوئی اور اس کی سطح بلند ہوئی شعرائے مابعد غزل کو پھر اس بلندی پر برقرار نہ رکھ سکے۔

"عام طور پر کلام سے ناہمواری دور ہوئی اور شاعرانہ انفرادیت کا مظاہرہ ہوا۔ غالب و مومن اور ذوق کے کلام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بہت کچھ ان کی سیرت پر ان کے خیالات سے روشنی پڑے گی۔ اس دور کے شعرا میں اتنی جسارت و ہمت پائی جانے لگی تھی کہ وہ اعتراف حقیقت سے گریز نہ کرتے تھے۔ خواہ وہ ان کے اچھے عملی کردار کی منافی کیوں نہ ہو۔ غالب کو اس سے انکار نہ تھا کہ وہ شراب سے لذت آشنا تھے۔ اسی طرح مومن نے بار بار کسی پردہ نشین سے عشق کی طرف اشارہ کئے ہیں۔۔۔۔ ان تمام باتوں سے قول و فعل میں یک گونہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو بہت شاذ و نادر رونما ہوا کرتی تھی"۔[۱]

اس عہد میں وہ ہندی الفاظ جو قدما سے اب بھی باقی رہ گئے تھے کلام سے نکل گئے اور ان کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ و تراکیب خصوصاً غالب اور مومن کے ذریعہ اردو شاعری میں کثرت سے داخل ہوئے۔ چونکہ غالب اور مومن فارسی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اس لئے ان کے اردو کلام میں فارسیت کا غلبہ ہے۔

اس عہد میں غزل کے علاوہ قصیدے میں بھی ترقی ہوئی۔ چنانچہ سودا کے بعد غالب اور ذوق کے قصائد اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

۱؎ اردو غزل کی نشو و نما از ڈاکٹر رفیق حسین صفحہ ۲۱۶

شعرا اظہار کمال کے لئے سنگلاخ زمین، مشکل قافئے و ردیف اور غیر معمولی بحریں اختیار کرکے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ جس سے مضامین میں جدّت اور خیالات میں ندرت پیدا ہوئی۔

دہلوی شاعری کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یاس و قنوطیت کا غلبہ ہے جو دہلی کی تباہی و بربادی اور یاس و افلاس کے باعث پیدا ہوئی۔ برخلاف اس کے لکھنؤ کی شاعری میں شگفتگی، زندہ دلی اور رجائیت کا اثر غالب نظر آتا ہے۔

مرثیہ گوئی

اودھ کے آخری تاجداران نصیرالدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ تعزیہ داری بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے اور مرثیہ کہتے تھے۔ مرثیہ میں ان کی دلچسپی کی وجہ سے اس دور میں فن مرثیہ کو انتہائی عروج حاصل ہوا۔ مناظر قدرت کی عکاسی، واقعات کا بیان، رزم و بزم کی تصویریں، سراپا، گھوڑے اور تلوار کی طولانی تعریفیں اور کردار نگاری وغیرہ وہ موضوعات ہیں جن کو اپنے مراثی میں انیس (۱۸۰۲-۱۸۷۴ء) اور دبیر (۱۸۰۳-۱۸۷۵ء) نے ترقی کے آسمان پر پہنچا دیا۔ آزاد، حالی، سرور اور چکبست وغیرہ اپنی زوردار اور دلآویز نظموں کے لئے مراثیِ انیس و دبیر کے ہی رہین منت ہیں۔ اسی زمانے سے مسدس جس میں انیس و دبیر نے اپنے مراثی لکھے نظم نگاری کے لئے بھی موزوں خیال کیا جانے لگا۔ حالی نے اپنی نظم "مدوجزر اسلام" اور سرور و چکبست نے اپنی قومی اور نیچرل نظموں کے لئے اسی صنف کو آلۂ کار بنایا۔

اس دور میں ہندو شعرا کی خدمات

غزل گوئی

اس عہد میں ہندوؤں میں زارؔ لکھنوی، عاصیؔ دہلوی، ہجرؔ لکھنوی، بیقیرؔ سکندر آبادی اور راجہ بلوان سنگھ راجہؔ اکبر آبادی نے غزل گوئی میں خوب نام پیدا کیا۔ منشی مینڈو لال زارؔ لکھنوی میں نامی گرامی استاد گزرے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر تھی۔ ان کی لکھی ہوئی ایک کتاب "انشائے گلزار فصاحت" کتب درسیہ میں بہت مشہور رہی۔ منشی گھنشیام لال عاصیؔ مرزا غالبؔ اور استاد ذوقؔ کے ہمعصر، شاہ نصیرؔ کے مایہ ناز شاگرد اور اس دور کے سب سے بڑے ہندو شاعر تھے۔ انھیں مختلف اصناف سخن پر پوری دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی اکثر غزلوں میں مشکل اور نادر ردیفیں انتخاب کرکے اور دو غزلے و سہ غزلے کہہ کر اپنی قادر الکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ منشی بالمکند بیقیرؔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اپنے زمانے میں نامی گرامی استاد تھے۔ یہ ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، تفتہؔ اور شیفتہؔ وغیرہ شعرائے باکمال کے ہمعصر اور ہم مشاعرہ تھے۔ مہاراجہ بلوان سنگھ راجہؔ بڑے قادر الکلام، مشاق، ذکی اور طباع سخنور تھے۔ پنڈت لچھمی ناتھ ہجرؔ لکھنوی بھی اس عہد کے بڑے خوشگوار اور نامور شاعر تھے۔

ان نامور ہندو شعرا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لفظی رعایت سے پاک ہے۔ ان کے کلام میں ابتذال اور رکاکت نہیں پائی جاتی یعنی

آفرینی و علوے تخیل اور زبان کی صفائی اور سلاست ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ مگر یہ سب دوسرے درجہ کے ممتاز شاعر تھے۔ ان میں کوئی بھی ذوق، غالب یا مومن کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوؤں کے مذہبی کتب کا منظوم ترجمہ

اس عہد میں منشی جگناتھ خوشتر لکھنوی نے ہندوؤں کے مذہبی کتابوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے اردو شاعری میں ہندوؤں کے لئے مذہبی عنصر کی خامی کو دور کیا۔ ۱۸۵۱ء میں انھوں نے رامائن کا منظوم ترجمہ کیا جس کی دنیائے سخن میں بڑی عزت و شہرت ہوئی۔ فصاحت زبان اور خوبیٔ بیان کے باعث یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۹۲۳ء تک مطبع نول کشور سے یہ سولہ بار طبع ہو کر فروخت ہوئی۔ خوشتر کی شاعری کا رخ مذہبی کلام کی طرف ہی تھا۔ رامائن منظوم، سریمد بھاگوت منظوم، مثنوی چترگپت منظوم اور پدم پوتھی ان کی تصانیف سے مشہور ہیں۔ خوشتر کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کے مذہبی کتابوں کا جو سنسکرت اور بھاشا میں تھیں اردو میں اس خوبی سے منظوم ترجمہ کیا کہ اصل کلام کی دلچسپی اور تاثیر میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ ان کے حالات زندگی اور نمونہ کلام منظوم تراجم کے باب میں ملاحظہ ہوں۔

دورِ پنجم کے باقی ماندہ ہندو شعرا کی فہرست

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۱	آرام	لکھن لال (دہلوی)	شاگرد انشا ۔ سن وفات ۱۸۵۸ء بہار سخن صفحہ ۲۵
۲	جگت	جگت نرائن بھان (دہلوی)	۱۸۱۵ - ۱۸۷۹ء - بہار گلشن جلد ۱ صفحہ ۱۹۳
۳	خوشتم	دیپ چند (دہلوی)	وفات ۱۸۶۱ء بہار سخن صفحہ ۱۴۱
۴	رتم	حکیم سکھانند (دہلوی)	شاگرد شاہ نصیر ۱۸۰۵ - ۱۸۶۸ء بہار سخن ملاحظہ ہو
۵	طرب	دھومی لال (دہلوی)	شاگرد شاہ نصیر ۔ بہار سخن ۔
۶	عبرت	دولت رام (دہلوی)	ایضاً ذوق ۔ نامی شاعر تھے ۔ بہار سخن ملاحظہ ہو ۔
۷	تسلی	رائے ٹیکا رام (لکھنوی)	شاگرد مصحفی ۔ وفات ۱۸۶۳ء تذکرہ ہندی صفحہ ۵۶
۸	رند	گنگا پرشاد (لکھنوی)	شاگرد جرأت وفات ۱۸۵۰ء ۔ بہار گلشن کشمیر ملاحظہ ہو
۹	گلشن	راجہ جیا لال (لکھنوی)	نامور شاعر تھے ۔ بہار سخن ملاحظہ ہو ۔
۱۰	مضطر	کنور سین (لکھنوی)	شاگرد مصحفی ۔ تذکرہ ہندی ملاحظہ ہو ۔
۱۱	نادم	رام دیال (لکھنوی)	شاگرد راز ۔ وفات ۱۸۶۰ء ۔ بہار سخن ملاحظہ ہو ۔
۱۲	اکبری	دیوان امر ناتھ مدن	۱۸۲۳ - ۱۸۶۷ء - بہار گلشن کشمیر ملاحظہ ہو ۔
۱۳	راضی	جانی بہاری لال اکبر آبادی	شاگرد غالب ۔ بہار سخن ۔
۱۴	مجنوں	سندر پرشاد فرخ آبادی	شاگرد غالب و تجیر ۔ رسالہ زمانہ اگست ۱۹۱۰ء

آٹھواں باب

دورِ جدید (طبقہ اول)

اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کا عہد

(سنہ ۱۸۶۸ء لغایت سنہ ۱۸۹۰ء)

دورِ جدید کا سیاسی و ادبی پس منظر

۱۔ اردو شاعری پر پہلی جنگ آزادی کے اثرات

سلاطین مغلیہ اور شاہانِ اودھ کی حکومتوں کے خاتمہ کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ میں اردو کی شاہانہ محفلیں ویران ہوگئیں اور اردو شعرا شاہی درباروں سے محروم ہوگئے۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے زیر اثر رہی سہی محفل بھی منتشر ہوگئی۔ چونکہ دہلی اور لکھنؤ جنگ آزادی کے سب سے بڑے مرکز تھے اس لئے وہاں جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا بھی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ انگریزوں کے مظالم کی وجہ سے وہاں کے شعرا بھی تلاش معاش میں دوسرے مقامات کو چلے جانے پر مجبور ہوئے۔ اکثر شعرا نے رام پور کا رخ کیا کیونکہ وہ لکھنؤ اور دہلی سے قریب تھا۔ کچھ لوگ حیدر آباد چلے گئے اور کچھ

ٹونک، الور، بھوپال، پٹیالہ اور کپورتھلہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ کچھ شعرا جو واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے ان کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے۔ ان لوگوں کی وجہ سے مٹیا برج میں بھی محفل شعر و سخن خوب گرم ہوئی۔ وہاں مشاعرے آئے دن ہوتے تھے۔ یہاں کی پر لطف مجلسوں میں داغ اور نظم طباطبائی بھی جاکر شریک ہوئے۔

نواب کلب علی خاں والئ ریاست رام پور شعرا کے بڑے مربی اور قدر دان تھے۔ اسی وجہ سے ۱۸۵۷ء کے بعد رام پور میں امیر، داغ، جلال، تسلیم، اسیر، بحر، منیر، قلق، جان صاحب، آغا جو اشرف اور آتش وغیرہ ایسے شعرا باکمال کا اجتماع ہو گیا۔ یہ سب شعرا دربار رام پور سے منسلک تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب حیدر آباد بھی علم و فن اور شعر و شاعری کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ داغ اور امیر اپنی زندگی کے آخری ایام میں رام پور سے حیدر آباد چلے گئے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

دہلی اور لکھنؤ میں اردو مشاعرے بجائے شاہی دربار کے امرا اور رؤسا کے دولت کدوں پر منعقد ہونے لگے۔ حالانکہ وہاں اب شاعری ذریعۂ معاش نہیں رہ گئی تھی مگر پھر بھی تفریح طبع اور شہرت و ناموری کے لئے شعر و سخن کا ذوق بہت بڑھ گیا۔

ب۔ اردو ادب پر انگریزی تعلیم کا اثر

پہلی جنگ آزادی کے بعد عیش و نشاط کی محفلیں درہم برہم ہو گئیں۔

۱؎ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ ص ۳۴۶

اب لوگ خواب غفلت سے چونک کر عملی دنیا میں مشغول ہوئے۔ برطانوی حکومت کے اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و تمدن کا اثر ہندوستان کی سماجی اور ثقافتی زندگی پر پڑنے لگا اور انگریزی تعلیم نے ہندوستان کی زبانوں پر وہی اثر ڈالا جو رومینٹک تحریک نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں انگریزی ادب پر ڈالا تھا۔ جس کے زیر اثر انگلستان میں ورڈسورتھ، کولرج، شیلی اور کیٹس وغیرہ نئی طرزِ شاعری کے نہایت گراں قدر اور مشہور عالم شعرا پیدا ہوئے۔ اسی طرح جنگ آزادی کے بعد انگریزی تعلیم نے آزادیٔ خیال و وسعتِ نظر کی ایک نئی روح ہندوستانیوں میں پھونکی۔ اس نے اردو شعرا کا مطمح نظر اور اردو شاعری کا دائرہ وسیع کر دیا۔ انگریزی ادب سے روشناس ہوتے ہی اردو داں اصحاب نے اس سے استفادہ کرنے کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ رام بابو سکسینہ فرماتے ہیں[۱] "انگریزی تعلیم کے اثر نے زبان اردو کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کیا جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو ایسا جکڑ رکھا تھا کہ ان کے خیالات میں تنوع باقی نہیں رہا تھا۔ ان کا مطمح نظر محدود ہو گیا تھا اور ان کی ذہانت و طباعی زنگ خوردہ ہو گئی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں اس کی وجہ سے گویا کایا پلٹ ہو گئی۔"

آزاد اور حالی کو اردو شاعری کے جدید رنگ کا مجدد اور بانی سمجھنا چاہیئے۔ انھوں نے طرزِ قدیم کی اردو شاعری پر جس میں تصنع و تکلف اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں ضرب کاری لگائی اور اسے تصنع و تکلف اور فرسودہ

۱۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۱۴

و رسمی روایات سے آزاد کیا[1]

آزادؔ اور حالیؔ کی نظروں میں غزل کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کے لئے تنگ و ناموزوں پایا گیا۔ فطری مناظر اور مختلف سماجی، قومی، سیاسی اور اخلاقی عنوانات کو قلم بند کرنے کے لئے انھوں نے مسدس کو منتخب کیا اور نظم نگاری کو رواج دیا۔

کرنل ہال رائڈ ڈائرکٹر تعلیمات صوبۂ پنجاب کی سرپرستی میں مئی ۱۸۷۴ء میں مولانا آزادؔ نے لاہور میں ایک ادبی انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ اردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہہ و استعارہ کے انبار ہیں وہ سب نکال دیئے جائیں۔ نیز یہ کہ مشاعروں میں جو طریقہ مصرعۂ طرح دینے کا مروج ہے وہ موقوف کیا جائے اور بجائے اس کے شعرا خاص خاص مضامین و عنوان پر طبع آزمائی کیا کریں[2]

مئی ۱۸۷۴ء میں جو ایڈریس انجمن کے افتتاح کے موقع پر آزادؔ نے پڑھا تھا اس میں اردو شاعری کے عیوب تکرار مضامین، غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات و استعارات، اس کا تصنع اور خلاف فطرت رنگ غرضکہ جو جو عیوب موجودہ شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ سب بہ وضاحت بیان کر دیئے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اردو شاعری کی بقا منظور ہے تو ہم کو چاہئے کہ عشق و عاشقی کے پرانے ڈھکوسلے ترک کریں اور عروس شاعری کو تیرہ و تار حجروں سے نکال کر زمانۂ موجودہ کی روشنی میں لائیں[3]

---

[1] [2] [3] تاریخ ادب اردو ص۱۰۴۳، ص۴۱۸، ص۴۱۹

صنف غزل میں امیر مینائی و داغ دہلوی اس دور کے سربرآوردہ شعرا اور اساتذہ ہیں۔

امیر مینائی کے تین دیوان اور متعدد مفید کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ "امیر اللغات" کو منشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ ان میں جلیل، ریاض، کوثر خیر آبادی، وسیم محسن، اصغر، مضطر، سرشار، حفیظ خاص طور سے مشہور ہوئے۔[1]

فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے استاد ذوق کے شاگرد تھے۔ بعد غدر رام پور آئے۔ وہاں ولیعہد ریاست نواب کلب علی خاں بہادر کے مصاحب مقرر ہوئے اور داروغۂ اصطبل کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے ۲۴ سال نواب کلب علی خاں کی ملازمت میں رام پور میں گزارے۔ ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد چلے گئے اور وہاں اعلحضرت (میر محبوب علی خاں) کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ تقریباً اٹھارہ برس حیدر آباد میں رہے۔ وہاں ان کے سیکڑوں شاگرد ہوئے۔ بعارضۂ فالج ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد میں انتقال کیا۔

دور جدید کے ممتاز ہندو شعرا

اس دور میں دہلی کے قابل ذکر ہندو شعرا کی تعداد حالانکہ نو ہے مگر ان میں منشی بہاری لال مشتاق شاگرد مرزا غالب زیادہ مشہور ہوئے۔

لکھنؤ۔ اس دور میں جب کہ دہلی میں صف اول کا کوئی ہندو شاعر

---

[1] تاریخ ادب اردو ص ۳۶۲

نہیں ملتا لکھنؤ اس لحاظ سے بڑا خوش نصیب کہا جاسکتا ہے۔ وہاں اسوقت رائے جوہر سنگھ جوہر، دیوان دیا کرشن ریحاں، منشی طوطارام شایاں اور منشی تنکر دیال فرحت ایسے باکمال شعرا ہوئے ہیں جن کا شمار صف اول کے شعرا میں کیا جاسکتا ہے۔

اسی عہد میں اردو کا سب سے پہلا گرانقدر افسانہ نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار کا بھی مولد و مسکن لکھنؤ ہی تھا۔ ان کے علاوہ صفِ دوم کے نامور اور خوش کلام شعرار پنڈت دیا شنکر کوچک انور، منشی شادی لال چمن، منشی لالتا پرشاد شفق، منشی خیراتی لال شگفتہ، منشی مہادیو پرشاد عاصی، کنور عنایت سنگھ عنایت، اور منشی شیو پرشاد وہبی وغیرہ کے باعث لکھنؤ اس وقت ایک پر بہار چمنستان سخن بنا ہوا تھا۔ یہاں گلی گلی میں شاعر تھے۔ اس دور میں یہاں کے قابل ذکر ہندو شعرا کی تعداد ۳۴ ہے مگر ان میں سے محض پانچ ممتاز ہندو شعرار پر مفصل بحث اس باب میں ہوگی۔

شعرائے دیگر مقامات

دیگر مقامات میں منشی بنواری لال شعلہ اس دور کے سب سے بڑے ہندو شاعر ہوئے ہیں۔ ان کے بعد منشی گور سہائے ملتجی کاکوروی مثنوی نگار سدا ماچرتر اور منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی کا نمبر آتا ہے۔

صف دوم کے ہندو شعرار میں لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی، منشی دیبی پرشاد بشاش اجمیری، ہرگو بند سہائے نشاط اکبر آبادی، راجہ کشن کمار وقار

مراد آبادی اور رائے بہادر شیو نرائن آرام اکبر آبادی شمار کیے جاتے ہیں۔

ا۔ منشی بہاری لال مشتاق دہلوی

(۱۸۳۶ء - ۱۹۰۸ء)

منشی بہاری لال[1] مشتاق ولد رائے من بھاون لال قوم کائستھ ماتھر، شاگرد مرزا غالب۔ حصول تعلیم کے بعد حکیم غلام رضا خاں کی وساطت سے مرزا غالب تک ان کی رسائی ہو گئی۔ اس وقت سے یہ اپنے کلام کی اصلاح مرزا غالب سے لینے لگے۔

مشتاق کو فن خوش نویسی میں خوب دستگاہ حاصل تھی۔ اسی وجہ سے یہ اکمل الاخبار کی کتابت اور ایڈیٹری دونوں کیا کرتے تھے۔ ان کی خوشنویسی کے باعث مرزا غالب اپنے احباب کو اکثر انہی سے خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ "اردوئے معلیٰ" کی تحریر و تالیف میں بھی انھوں نے نمایاں کوشش کی ہے جیسا کہ میر مہدی مجروح کی تقریظ سے ظاہر ہے۔ مشتاق کے تعلقات مولانا حالی سے بھی اچھے تھے۔ چنانچہ مرزا غالب کی وفات پر مشتاق نے یہ اشعار کہے۔

غالب کے بعد بیشک غش کھا کے گر پڑا تھا ۔۔۔ حالی نے ہاتھ پکڑا مشتاق کا سخن میں

شاعری میں خضر اے مشتاق حالی کو سمجھ ۔۔۔ شرق کو جس کی بدولت غرب کا رستہ ملا

۱۸۸۷ء میں ان کے تعلقات اکمل الاخبار کے مطبع سے منقطع ہو گئے اور

---

[1] ماخوذ از دیوان مشتاق مطبوعہ ۱۹۳۶ء از طرف کائستھ اردو سبھا دہلی۔

اس کے بعد لالہ سری کرشن داس گڑوالہ نے اپنے یہاں بلا لیا اور آخر وقت تک ان کو اپنے یہاں بڑی عزت و احترام سے رکھا۔ مشتاق منشی گھنشیام لال عاصی کے نواسے اور منشی گوری شنکر قیصر کے بڑے بھائی تھے۔

مشتاق کا قلمی دیوان گم ہو گیا تھا۔ بعد میں حافظہ سے اور کچھ پس ماندہ مسودوں سے جو کچھ دستیاب ہو سکا اسے ایک جگہ فراہم کر دیا جو آپ کے بڑے فرزند منشی چندو لال کے پاس محفوظ تھا اسے ۱۹۴۵ء میں کائستھ سبھا دہلی نے کلام مشتاق کے نام سے طبع کیا۔ اس کتاب میں منجملہ ساٹھ صفحات ہیں جن میں ایک مثنوی "فتوح امید" ایک مسدس "قرارداد" اور چند غزلیات فارسی کو چھوڑ کر بقیہ سب اردو غزلیں اور پہیلیاں ہیں۔

انتخاب کلام

اتحاد و یک جہتی

ہم ہیں ہندو تم مسلماں باہم دونوں ایک ہیں — جس طرح اعداد جمنا اور زمزم ایک ہیں
زر شادی فرط غم دونوں ہیں یکساں جانستاں — دور بینوں کی نظر میں شادی و غم ایک ہیں

عاشقانہ

تم جاتے ہو تو جاؤ خدا کے لئے مگر — لے جاؤ اپنے ساتھ نہ صبر و قرار کو
مجھے دوزخ بھی ہے فردوس اگر روز جزا — حور زاہد کو ملے اور ملو تم مجھ کو

شوخی و بے باکی

مشتاق دیکھ پائے جو شیشہ کو محتسب — پوچھے گر اس میں کیا ہے تو کہنا گلاب ہے

بوسہ لیا تو عارض گل رنگ کا لیا
پوچھے کوئی کہ زلف کو کیوں پیچ و تاب ہے

دوڑیو لیجیو نہ جانے پائے
جس کی چوٹی کی گانٹھ میں دل ہے

ساری خلقت کا ایک سا دل ہے
جس کو دیکھو وہ ان پہ مائل ہے

اخلاق

جس شخص کی طینت میں برائی نہیں ہوتی
کہنے سے کسی کے وہ برا ہو نہیں سکتا

تم نے اے رہروانِ ملک عدم
کچھ نہ لکھا وہاں کا حال ہمیں

ہیں جب تجھی پہ شیخ و برہمن مٹے ہوئے
پھر فرق کیا ہے بت کدہ و خانقاہ میں

دیا ہے کعبہ و بت خانہ کا عجب دھوکا
کسی کو ٹھیک بتاتے نہیں نشاں اپنا

مشتاق غم کو پاس نہ آنے دے زینہار
خوش خوش گذار زندگی مستعار کو

مشتاق کے کلام میں پختگی، روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ خیالات بلند اور جذبات پاکیزہ ہوتے ہیں۔ مضمون آفرینی اور بیباکی جا بجا ملتی ہے۔ مرزا غالب کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کے کلام میں غالب کے رنگ کی جھلک کہیں کہیں نمایاں ہے۔ تصوف اور فلسفہ بھی کافی ملتا ہے۔ غرض کہ مشتاق ایک خوش فکر و خوش کلام شاعر تھے۔ شاعری میں ان کا درجہ صفِ دوم کے اردو شعراء میں کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ رائے جوہر سنگھ جوہر لکھنوی

(۱۸۲۴ء - ۱۸۸۰ء)

حالاتِ زندگی

رائے جوہر سنگھ جوہر ولد رائے بختاور سنگھ قوم کائستھ سکسینہ ساکن لکھنؤ کے مورثان شاہی دربار میں عہدۂ جلیلہ پر ممتاز تھے۔ منشی منی لال صفا ایک نامور شاعر گذرے ہیں۔ وہ جوہر کے دادا کے بھائی تھے۔ راجہ رتن سنگھ بہادر ہوشیار جنگ متخلص بہ زخمی ان کے ماموں تھے۔ والد کی وفات پر جوہر ان کی جگہ پر دفتر شاہی دیوانی میں مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں جب اودھ کا الحاق سلطنت انگلشیہ میں ہوا تو جوہر چیف کمشنر کے دفتر میں منصرم کاغذات شاہی مقرر ہوئے۔ غدر کے بعد ملیح آباد میں تحصیلدار مقرر ہوئے

مہاراجہ دگ بجے سنگھ بہادر والئ ریاست بلرام پور کی فہمائش پر عہدۂ تحصیلداری چھوڑ کر بلرام پور چلے گئے اور وہاں مہاراجہ کے رفقائے خاص میں داخل ہوئے۔ مہاراجہ دگ بجے سنگھ نے ان کی شاگردی قبول کرلی۔ نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔ جوہر کی طبیعت کی آمد اور زور کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ پانچ دیوان ان کی تصنیف سے شائع ہوئے۔ اردو دیوان موسومہ مخزن فصاحت اور نغمستان، دیوان فارسی موسومہ مطلع خورشید، مثنوی ہائے قیافیہ و نجوم، جوہر افلاک و جوہر

---

(۱) تذکرہ شعرائے ہنود مرتبہ دیبی پرشاد بشاش صفحہ ۱۷

ادراک اور تسکار نامہ وغیرہ ان کی تصنیفات سے ہیں۔ گل محمد خاں ناطق سے فارسی میں اور خواجہ وزیر سے اردو میں تلمذ تھا۔

نمونۂ کلام

اصل مطلب ایک ہے آگاہ و ناآگاہ کا ‏ ہے الکھ کا ترجمہ عربی میں لفظ اللہ کا
دیکھے جو بینا ہو انساں صنعت رب حفیظ ‏ طاق ابروئے بتاں گنبد ہے بسم اللہ کا

گردش سے آسماں کی کسی جا مفر نہ تھا ‏ کس سرزمیں پہ یہ فلک فتنہ گر نہ تھا
میں عشق سے وہ حسن سے بیہوش دونوں تھے ‏ جو کچھ ہوا معاف کوئی با خبر نہ تھا
کچھ اور ہی مزہ ہے نئے شوق و ذوق کا ‏ جو لطف پہلے دن تھا وہ روزِ دگر نہ تھا
ٹھہرا وصال وعدۂ فردائے حشر پر ‏ دل کو یہاں تحمل روزِ دگر نہ تھا

آفتِ جاں ہوا عالم کے لئے تو پیدا ‏ کس بلا کے ہوئے چشم و رخ و گیسو پیدا
وہ جوانی کے مزے دلبر کم سن میں کہاں ‏ غنچہ جب تک نہ ہو گل نہ ہو خوشبو پیدا
دونوں ہاتھوں سے بلائیں تری لیتا ہے حسین ‏ چہرے پہ تیرے پہلے بت نہیں ابرو پیدا

جلد لا ساغر الماس میں ساقی مئے لعل ‏ موتی برساتا ہوا ابر گہر بار آیا

خیال زلف سے ہے دیدۂ پر آب میں سانپ ‏ ترے دکھلانے کو یہ بند ہیں حباب میں سانپ
یہ عشق افعی گیسو کی دیکھئے تاثیر ‏ کہ رات بھر نظر آتے ہیں مجھ کو خواب میں سانپ

سب کھینچتے ہیں نالۂ گرم اس کے واسطے ‏ اک شمع نے لگائی ہے یہ انجمن میں آگ
نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا ‏ فقط ایک نام نکوئی رہے گا

۱؎ خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۲۹۷ - ص ۳۰۶

صبر آہی جائے گا اے ناصحو — تھک کے خود ہو جائے گا ناچار دل
بھڑکی گلوں سے آتشِ دل ہجرِ یار میں — پھک جائے باغ آگ لگے اس بہار میں
گر نہ ہو حاصل کسی مدعائے دل نہ ہو — آدمی کو ربِ اعلیٰ پر توکل چاہئے
پری و حور ہیں ناجنس کیا لطف آدمیت کا — بشر ہیں ہم بشر سے ہے مزہ اپنی طبیعت کا
خدا نے لذتیں دنیا میں دیں تم بد سمجھتے ہو — نتیجہ زاہدو اچھا نہیں کفرانِ نعمت کا
صنم بھی اس کے مظہر ہیں کریں سجدہ نہ کیوں جوہر — نظر آتا ہے جو کچھ ہے نمونہ اس کی قدرت کا
جگانے صبح بالیں پر وہ بے نقاب آیا — اٹھو بھی صبح ہوئی سر پہ آفتاب آیا
تجھ کو اے شاہِ حسن کیا دیکھا — بخدا سایۂ خدا دیکھا
مجھ تک آئی لبِ شراب اڑ کر — جذبۂ دل کو ساقیا دیکھا
وہی ہوتا ہے جو خدا چاہے — بارہا ہم نے آزما دیکھا

جوہر ایک باکمال سخنور اور استادِ کامل تھے چنانچہ ان کے کلام سے ان کی استادانہ مشق و مہارت اور قادر الکلامی ٹپکتی ہے۔ ان کا کلام گل و بلبل، شمع و پروانہ اور حسنِ محبوب کے خارجی بناؤ سنگار کے ذکر، غیر فطری واقعات کے اظہار اور دورِ ناسخ کی طرزِ غزل گوئی کے اکثر عیوب سے کافی پاک ہے۔ اشعار میں واقعیت و صداقت کے باعث زور و اثر خوب ہوتا ہے۔ تخیلات عموماً فلسفیانہ و تصوفانہ ہوتے ہیں۔ تخیل میں رفعت، مضامین میں جدت اور طرزِ بیان میں دلآویزی ہوتی ہے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود کلام میں سوز و گداز کی جو غزل کا جوہر ہے نمایاں کمی ہے۔

لالہ سری رام جوہر کے کمالات اور شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے

ہیں[1] "تصوف اور وحدانیت کی طرف طبیعت کا خاص رجحان تھا۔ نہایت پرگو اور خوش کلام شاعر تھے۔ آپ کی طبیعت کی آمد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پانچ دیوان آپ کی تصانیف سے شایع ہوئے جن میں سے دو مطبع نولکشور میں اور تین مطبع رفاہ عام سیالکوٹ میں چھپے ہیں۔"

حضرت جگر بریلوی جوہر کے متعلق فرماتے ہیں[2] "آپ کا کلام عروس شاعری کا بے بہا زیور ہے اور بزم ادب کے لئے سرمایۂ زینت ۔۔۔ جوہر تمام عمر اپنے خون جگر سے سینچ سینچ کر چمنستان اردو کو شاداب کرتے رہے۔ ایسے ایسے سدا بہار پودے لگائے اور ایسے ایسے پھول کھلائے جن کی شمیم جانفزا دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ پانچ دیوان میں اپنی جگر کاویوں کا ثمرہ چھوڑے ۔۔۔ واجد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے زمانہ میں اردو شاعری جس مسلک تعشق و تعیش سے عبارت تھی وہ محتاج تشریح نہیں ۔۔۔ اس وقت کیسا ہی پاکیزہ خیال شاعر ہوتا اس ہوا سے بچنا محال تھا اس لئے کہ خاص و عام کا یہی مذاق تھا۔ جوہر اس رنگ سے کلیتاً بچ تو نہ سکے لیکن اس میں اپنی انفرادیت کے ایسے نقوش ثبت کر دیے جو پاکیزگی سے ہمدوش ہیں۔ خواجہ وزیر کے شاگرد ہونے کے لحاظ سے خاندان ناسخ سے منسلک تھے ۔۔۔ ناسخ اسکول کا انداز دیکھتے ہوئے جوہر کے یہاں بھی کاغذی گل بوٹوں کی ہی توقع ہو سکتی تھی مگر ایسا نہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں جذبات کی آنچ بھی دی اور درد و اثر بھی بھرا۔ چونکہ فارسیت دل و دماغ میں بسی ہوئی تھی اس کا جلوہ اردو میں بھی جھلک رہا ہے۔ فارسی

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد دوم صفحہ ۳۱۴، [2] یادرفتگاں از جگر بریلوی صفحہ ۲۲۳، صفحہ ۲۲۴

الفاظ اور ترکیبیں بہت برتتے ہیں مگر اس سلیقے سے جیسے نگیں جڑ دیئے ہوں۔ شعر جگمگا اٹھتا ہے اور اس کی دلکشی کی انتہا نہیں رہتی۔"

۳۔ دیوان دیا کرشن ریحاںؔ لکھنوی

(سال وفات ۱۸۸۵ء)

حالات زندگی[1]

دیوان دیا کرشن ریحاں خلف منشی گنگا سنگھ سریواستو لکھنؤ کے باشندہ تھے۔ یہ ایک باکمال شاعر تھے اور مسلم الثبوت اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مرجی رام موجیؔ شاگرد مصحفی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ریحاں نے اپنے استاد کے کمالات اور فیض و کرم کا اعتراف اکثر اشعار میں کیا ہے۔ مثلاً

موجی سے کر و مشق فن شعر میں حاصل ریحاں کوئی استاد پھر ایسا نہ ملے گا

ریحاں فن شعر میں تھا استاد موجی شاگرد مصحفی کا

ریحاں بڑے رنگین مزاج اور رند مشرب تھے۔ شاہد پرستی ان کے زمانے کا عام رواج تھا۔ چنانچہ اپنی بادہ نوشی کا اعتراف اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ کہتے ہیں:-

عہد شباب میں نہ پئیں مے تو کیا کریں پیری میں ہوگا دھیان حلال و حرام کا

[1] راقم حالات زندگی اور کلام ریحاںؔ کی فراہمی کے لئے منشی بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی کا ممنون ہے۔

سا ہو اگر حصر اسی بات پہ دینداری کا — حشر تک نام نہ لیں ہم کبھی میخواری کا

ریحاں راجہ الفت رائے بہادر بخشی الملک سلطان واجد علی شاہ کے دیوان توشکخانہ (سر رشتہ دار) تھے۔ بعد انتزاع سلطنت پنڈت شیو دین وکیل کے ملازم رہے۔ بڑے نازک مزاج، وضعدار اور خوش تقریر تھے۔ استعداد علمی نہایت معقول تھی۔ ان کا تعلق بڑے باعزت خاندان سے تھا مگر تباہی سلطنت کے بعد آسودگی و فارغ البالی نصیب نہ ہوئی[1]۔

منشی دیبی پرشاد بشاش ریحاں کی شاگردی کے متعلق کہتے ہیں[2]۔ "اول شاگرد رام دیال سخن کے ہوئے تھے پھر لالہ موجی رام صاحب موجی استاد ہی گو کی شاگردی میں شعر گوئی کی تکمیل کی۔ بعد وفات اونکے صحبت رائے جواہر سنگھ جوہر سے رہی حضرت جوہر نے ان کے دیوان کا تاریخی نام "باغ ریحاں" رکھا تھا جو حال ہی میں چھپا ہے۔"

ریحاں ایک قادر الکلام و خوش گو شاعر تھے۔ ان کا دیوان "باغ ریحاں" ان کی وفات کے بعد شائع ہوا تھا۔ اپنے کلام کی شہرت کے باعث ان کو خود اپنے دیوان کی طباعت کی خواہش نہ ہوئی۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ہماری ہرزہ گوئی سے زمانہ ہو چکا واقف — کلام اپنا وہ چھپوائے جو ہو محتاج شہرت کا

ریحاں کا دیوان چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ واجد علی شاہ کے بڑے مداح تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

واجد علی کے عہد میں ریحاں ستم نہیں — آباد حشر تک رہے اس بادشاہ کا گھر
اور محشر تک رہیں ریحاں جہاں میں برقرار — حضرت واجد علی فرمانروائے لکھنؤ

---

[1] خمخانہ جاوید جلد سوم صفحہ ۵۹۳ - ۶۰۲ ، [2] تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۶۹

ریحاںؔ اپنی غزلوں کی شہرت و مقبولیت کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

ریحاں کی جب غزل طرفِ اصفہاں گئی | اردو کو سن کے بھول گئے اپنی فارسی

مصحفی کے شاگردان خواجہ آتش اور منشی موجی رام موجی نے اردو زبان کو بہت صاف کیا۔ ان کے بعد خواجہ آتش کے شاگردان رندؔ، صباؔ، خلیلؔ اور نسیمؔ کے ساتھ ریحاں نے بھی اردو شاعری کو نکھارنے میں خاص طور سے ان کا ہاتھ بٹایا۔

جناب منورؔ لکھنوی فرماتے ہیں "ریحاں کے دیوان سے اشعار کا انتخاب کرتے وقت بہت کم ایسے اشعار ملتے ہیں جنھیں چھوڑنے کو دل تیار ہوتا ہو۔ تمام کلام آمد سے بھرا پڑا ہے۔"

نمونہ کلام

جلوہ تمام رات ہے ماہ تمام کا | جائے گا وقت صبح یہ مہمان شام کا

فضل خدا سے تم بھی سراپا بہار ہو | طاؤس کو دکھاؤ تماشا خرام کا

محبوب کے رخ روشن کو چاند سے زیادہ حسین ثابت کرتے ہیں ؎

کبھی فلک پہ گھٹا اور کبھی بڑھا لیکن | برابر اس رخ روشن کے ماہ ہو نہ سکا

کیا کروں قصد میں یوسف کی خریداری کا | حسن مرغوب نہیں شاہد بازاری کا

اپنی تقدیر میں تھا کاکل خمدار کا عشق | کیا بتاؤں میں سبب دل کی گرفتاری کا

فائدہ حیلۂ بیکار سے کیا لے نرگس | آنکھ میں درد نہیں نام ہے بیماری کا

خدا کی قسم ہوں میں شاکر صنم کا | خلاف اطاعت ہے شکوہ ستم کا

قناعت نے ریحاں کیا بے تعلق | نہ راحت خوشی کی نہ ہے رنج غم کا

تیرے گھبرانے سے کیا اے دل مضطر ہوگا | جو مقدر میں لکھا ہے وہ مقرر ہوگا

دیکھنے میں کبھی بڑھتا ہے کبھی گھٹتا ہے چاند | ماہ کیا عارض جاناں کے برابر ہوگا

کچھ دام کا قصور نہ دانہ کی ہے خطا — صیاد تیرے گھر میں میرا آب و دانہ تھا

مٹی کا بوجھ دیکھتے ہیں ان پہ جا بجا — ہیہات جن سروں پہ کہ تاج شہانہ تھا

گردش زمانہ کی انھیں چکر کھلاتی ہے — ریحاں کبھی زمانہ میں جن کا زمانہ تھا

حشمت نہیں نہ ہو جو حکومت نہیں نہ ہو — تھوڑے دنوں کے واسطے جھگڑا افزوں کیا

قسمت سے زیادہ کبھی حاصل نہیں ہوتا — جو صابر و شاکر ہے وہ سائل نہیں ہوتا

شریک رنج کسی کو نہ جز خدا دیکھا — نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ آشنا دیکھا

نگاہ پھرتی ہے مردم کی مرتبہ پا کر — یہ ماجرا تو ان آنکھوں نے بارہا دیکھا

راحت کا خواب مجھ کو لحد میں ہوا نصیب — مدت کے بعد شکر خدا گھر میں آگیا

رفتہ رفتہ بیٹھتا اٹھتا میں اس در تک گیا — کوس منزل کے کڑے تھے چلتے چلتے تھک گیا

گلے میں ضبط محبت نے روک روک لیا — زبان تک نہ کبھی حرف مدعا آیا

عوض سرور کے پہلے ہی درد سر پایا — لگا کے جام مئے عشق منہ سے بھر پایا

باغباں کس لئے ناراض ہے ریحاں ہم سے — پھول کیا ہے کبھی دھوکے سے نہ پتا توڑا

صبح کے وقت جو خورشید فلک پر نکلا — رند سمجھے کہ یہ جام مئے احمر نکلا

ہر بت ماہ لقا سے مجھے مہجور کیا — دشمن جاں حزیں چرخ بداختر نکلا

آسماں نے کیا کم قدر اسے مثل ہلال — بدر کی طرح کوئی شخص جو بڑھ کر نکلا

نہ ہو ملول گذر جائیں گے یہ دن ریحاں — ہر ایک شخص کے دن ایک بار پھرتے ہیں

ترے دل میں جو لے ریحاں نہیں یہ جوش الفت کا — پھر آنسو بے سبب کیوں آنکھ سے اکثر نکلتے ہیں

برا ہو چاہ کا یاد ان کی صورت آ ہی جاتی ہے — ٹپک پڑتے ہیں آنسو دل میں رقت آ ہی جاتی ہے

زیادہ اس سے بھی کیا شر کرے خدا جانے — بشر کہیں اگر جینے کی مدعا جانے

جاگتے جاگتے دن رات پریشاں ہے دماغ — روگ آنکھوں کو ہوا ہجر میں بیداری کا

چرخ میں آگ لگی آہ شرر افشاں سے — ہر ستارے پہ یقیں ہے مجھے چنگاری کا

اشک ریزی کا ہمارے بھی تماشہ دیکھئے — ابر نیساں کو جو دعویٰ ہے گہرباری کا

✓ ضبط راز عشق رہے گا کب تلک — ایک دن سب کو خبر ہو جائے گی ✓

میں صورت سے تجھ کو بھلا جانتا تھا — برائی بھلا دل کی کیا جانتا تھا

وہی جان کا میری خواہاں ہوا ہے — جسے جان سے میں سوا جانتا تھا

دلچسپ ہے کیا سرائے فانی — بھولی ہمیں یاد اپنے گھر کی

دل لینے کا رنگ اور ہے ڈھنگ اور چلن اور — ہر ایک حسیں پیار کے قابل نہیں ہوتا

خراب و خستہ ہوا مر مٹا تباہ ہوا — بلائے عشق میں جس جس کو مبتلا دیکھا

✓ نہیں نصیب فرشتوں کو عشق کی لذت — بشر کے حصے میں یہ درد لا دوا آیا

دل توڑ کے عاشق کا نہ ہو کفر میں داخل — یہ گھر ہے خدا کا اسے ڈھانا نہیں اچھا

✓ دل میں اپنے جسے پتہ نہ ملا — اس کو کعبہ میں بھی خدا نہ ملا

کثرت میں وحدت الٰہی کے فلسفہ کو بہترین ڈھنگ سے پیش کیا ہے ؎

ہے تار سبحہ صد دانہ کی طرح تو بھی — ملا ہر ایک سے اور سب سے پھر جدا دیکھا

روح اور جسم کے تعلق پر کس خوبی سے روشنی ڈالی ہے ؎

ہائے کیا عقل پہ غفلت کے پڑے ہیں پردے — جسم کو جانتی ہے روح کہ گھر ہے اپنا

حقیقت حیات اور صنعت تضاد

✓ مدعا زیست کا معلوم نہیں — لوگ جینے پہ مرے جاتے ہیں

ریحاں یہی غفلت تجھے برباد کرے گی — کس فکر میں بیٹھا ہے اجل سر پہ کھڑی ہے

کسی سے غرض ہم کو اصلاً نہ تھی — دکھانے کو دنیا میں شامل رہے

قطعہ

کوئی ہمارے تغافل شعار سے کہہ دو — کہ آپ ذرہ نوازی جو مہر وار کریں

تو باوجود تقاضائے مرگ و شدت نزع — ہم اور بھی نفس چند انتظار کریں

ریحاں کا کلام ان کی زندگی اور ماحول کا آئینہ ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے عادات و اطوار اور دنیاوی حالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کا اظہار اپنے اکثر اشعار میں برائے درس و عبرت کیا ہے۔ واردات زندگی حقائق دنیوی اور بے ثباتی ہستی کی بہت صحیح اور عمدہ ترجمانی کی ہے۔ جذبات قلبی اور واردات زندگی کو موثر اور پُرلطف طریقے سے شعر کا جامہ پہنانے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ معاملہ بندی کو خوب نبھایا ہے۔

ریحاں کا رنگ خواجہ آتش کے رنگ سے مماثلت رکھتا ہے۔ ان کے کلام میں بھی وہی شوخی و شگفتگی، صفائی و روانی، روزمرہ و محاورہ بندی اور جدت ادا و ندرت بیان ہے جو ہمیں آتش کے کلام میں ملتا ہے تکلف و تصنع نام کو نہیں۔ آمد سے سارا کلام بھرا پڑا ہے۔

ریحاں نے طبیعت عاشقانہ پائی تھی۔ رنگیں خیال و شیریں مقال شاعر تھے۔ منشی دیبی پرشاد بشاش تحریر فرماتے ہیں[1] "ان کی غزلیں زبان شیریں ہونے کے سبب سے لکھنؤ کی کسبیاں بہت گاتی ہیں اور وہ لوگوں

---

[1] تذکرہ شعرائے ہنود ص۶۹ (مزید کلام ریحاں تذکرہ شعرائے ہنود مرتبہ بشاش میں دیکھیے)

کو بہت دلپسند اور مشہور ہیں"

لالہ سری رام ریحاں کی نسبت تحریر فرماتے ہیں[1] "ریحاں نے بڑے باکمالوں اور مشہور استادوں کی صحبت پائی تھی اور فن شعر کے رموز ودقائق پر پوری طرح عبور تھا۔ طبیعت عاشقانہ پائی تھی۔ معاملہ بندی کا مذاق بہت اچھا تھا۔ کلام بہت پاکیزہ، صاف اور اکثر اشعار اخلاقی مضامین سے مملو ہیں تعجب ہے کہ شیخ ناسخ کی خشک بیانی اور بے رنگ تاثیر سے جو لکھنؤ کی آب گل میں اس زمانے میں سرایت کر چکا تھا کس طرح انھوں نے اپنے آپ کو بچایا۔ کلام میں آورد بہت کم اور بول چال صاف وشستہ ہے۔ اکثر غزلیں ان کی زندگی ہی میں رائج ہوگئی تھیں اور عام وخاص میں اچھی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کا دیوان قابل دید ہے اور اس میں ہر مذاق کے شائق کی تفریح ودلبستگی کا کافی مصالحہ موجود ہے۔ اکثر غزلوں سے ان کی قادر الکلامی اور مشاقی فن کا ثبوت ملتا ہے۔ اپنے وقت کے مشاہیر شعراء میں ان کا شمار تھا"

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد سوم ص۵۹۳۔ ص۶۰۲ (اس تذکرہ میں ریحاں کے تقریباً سو شعر درج ہیں۔)

۴۔ پنڈت رتن ناتھ درسرشار لکھنوی

چکبست تحریر فرماتے ہیں[۱] "اہل کشمیر میں دو صاحب ایسے گزرے ہیں جن کی شہرت کا دامن قیامت کے دامن کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک پنڈت دیاشنکر نسیم جن کے فیض سے چمنستان نظم کو شادابی حاصل ہوئی۔ دوسرے حضرت سرشار جنھوں نے حدیقۂ نثر اردو میں نئی روشیں نکالیں اور جن کی جادو بیانی کا شہرہ آج ہندوستان بھر میں ہے۔"

حضرت سرشار غالباً ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ جب یہ چار سال کے تھے ان کے والد پنڈت بیجناتھ در قضا کر گئے۔ بچپن ہی سے ان کے مزاج میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لکھنؤ میں جس مکان میں یہ رہتے تھے اس کے پڑوس میں اکثر شرفائے اسلام رہتے تھے۔ سرشار ان کے گھروں میں بے تکلف آیا جایا کرتے تھے اور ان کی خاتونوں سے لکھنؤ کی فصیح اور شوخ اردو زبان سیکھی اور بیگمات کی طرز معاشرت سے بہت کچھ آگاہی اس زمانہ میں ہی حاصل کر لی تھی۔

سرشار اول کھیری اسکول میں مدرس ہوئے۔ انھیں ادب سے فطری لگاؤ تھا اس لئے انھوں نے مراسلۂ کشمیر اور اودھ اخبار میں مضامین لکھنا شروع کئے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ہیئت کی ایک کتاب کا سلیس اردو ترجمہ کیا اور

۱۔ مضامین چکبست ص۲۲

شمس الضحیٰ نام رکھا۔ صوبہ کے ڈائرکٹر تعلیم ان کے ترجموں کے بڑے مداح تھے۔ ۱۸۷۶ء میں جب منشی سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" نے "اودھ اخبار" پر حملہ کرنا شروع کیا تو منشی نول کشور کو ان کا جواب دینے کے لئے ایک باکمال مضمون نگار کی ضرورت ہوئی اور سب کی نظر انتخاب حضرت سرشار پر پڑی۔ حضرت سرشار "اودھ پنچ" کے نامہ نگار تھے اور ان کی اچھوتی انشا پردازی پر پنچ کو فخر تھا۔ طرح طرح کے دباؤ پڑنے پر حضرت سرشار نے ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کی ایڈیٹری قبول کر لی اور اودھ پنچ کے نامہ نگاروں کی فہرست سے الگ ہو گئے۔

"فسانہ آزاد" اودھ اخبار میں بالاقساط نکلا اور ۱۸۸۰ء میں علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ فسانہ جب اودھ اخبار میں چھپتا تھا تو اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ دوسرے پرچے کے منتظر رہا کرتے تھے چکبست کا بیان ہے کہ اس کے لکھنے کے لئے کبھی مصنف نے کوئی خاص زحمت گوارا نہ کی۔ کاتب بیٹھا ہوتا تھا اور یہ نوجوان افسانہ نویس کوئی داستان یا داستان کا ٹکڑا قلم برداشتہ گھسیٹ دیتا تھا۔ یہ لکھنے والے کی خوبی اور فسانہ کی خامی دونوں کی دلیل ہے۔ فسانۂ آزاد کے شائع ہوتے ہی سرشار کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ چنانچہ ان کی دوسری تصانیف کا جو اس پایہ کی نہ تھیں بہت پرجوش مقدم ہوا[۱]

'فسانہ آزاد' سے پہلے ہندوستان کی افسانہ نویسی جادو، طلسم، پری، دیو اور خلاف عقل واقعات سے بھری پڑی تھی۔ حضرت سرشار نے مرزا رجب علی

۱۔ تنقیدی اشارے۔ پروفیسر آل احمد سرور ص ۱۲۹

بیگ کے طرزِ تحریر سے بچ کر اپنی جولانیِ طبع کے لیے ایک الگ راستہ نکالا اور ان واقعات کو قلمبند کیا جو انسانی فطرت اور حالاتِ زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کی شہرہ آفاق کتاب 'فسانہ آزاد' بظاہر ایک فرضی قصہ ہے لیکن حقیقت میں قدیم لکھنؤ کے تمدن اور طرزِ معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

منشی نول کشور کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سرشار حیدر آباد تشریف لے گئے، وہاں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد نے ان کی قدر افزائی فرمائی۔ سرشار اسم با مسمیٰ تھے۔ کثرتِ مے نوشی سے قوائے جسمانی و دماغی مضمحل ہوتے گئے اور ان کا کمال بھی روز بروز زوال پذیر ہوتا گیا۔ زندگی کے آخری ایام فارغ البالی کے ساتھ بسر نہ ہو سکے۔ آخر زمانہ میں مہاراجہ کشن پرشاد نے ان کی بے اعتدالیوں سے ناراض ہو کر اپنا دستِ کرم کھینچ لیا تھا۔ آخر ش ۲۱ جنوری ۱۹۰۳ء کو بمقام حیدر آباد انتقال فرمایا۔ کسی نے ان کی تاریخ وفات کہی ہے ؎

سرشار فصیح و نکتہ پرور نہ رہا ۔۔۔ سرمایۂ نازِ اہلِ جوہر نہ رہا
اعجازِ قلم کے جس کے سب قائل تھے ۔۔۔ وہ نثر کا اردو کی پیمبر نہ رہا

سرشار شاعری میں مظفر علی آسیر کے شاگرد تھے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ بیشتر قصیدے، مثنویاں اور قطعات وغیرہ بھی لکھے ہیں۔

نمونۂ کلام[1]

کیا قہر ہے کہ مفت میں بلبل تو قید ہے ۔۔۔ گلچیں جو پھول توڑے اسے کچھ جرمانہ ہو

---

[1] بہارِ گلشنِ کشمیر صفحہ ۴۱۲ - ۴۲۶

اس بلبل اسیر کی حالت پہ روئیے — جو فصل گل میں بند قفس سے رہا نہ ہو
کہتا نہیں ہے مجھ سے کبھی کچھ ادھر کا حال — کمبخت دل انھیں سے کہیں مل گیا نہ ہو

بتوں کے در پہ سب کی جبہ سائی ہوتی جاتی ہے — انھیں کے قبضہ میں ساری خدائی ہوتی جاتی ہے
پھنسا کر زلف میں دل عمر بھر ان کی بلا رکھے — اسیری ہوتی جاتی ہے رہائی ہوتی جاتی ہے

پینے پہ جب آتے ہیں تو پھر بس نہیں کرتے — میخانے میں سنتے نہیں سرشار کسی کی

نصیب جاگیں گے اک روز حضرت سرشار — لپٹ کے سوئے گا وہ گل گلے لگائے ہوئے

سیاہ بخت و سیہ روزگار ہم بھی ہیں — جواب زلف پریشاں یار ہم بھی ہیں

حال سب میری سخت جانی کا — باڑھ کہتی ہے مڑ کے خنجر کی

ہر مرض کی دوا مقرر ہے — مرض عشق لا دوا دیکھا

درد و غم و یاس و حرماں — اک دل ہے ہزار آفت ہیں

قصیدہ

ماہ اکتوبر ۱۸۹۴ء میں کشمیری پنڈتان کی چوتھی سوشل کانفرنس میں حضرت سرشار نے ایک یادگار قصیدہ پڑھا تھا۔ اس قصیدے کے چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس میں انھوں نے اپنے کمال فن اور طبیعت کی شوخی و ظرافت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ اشعار سرشار کی جودت طبع اور گوہر فشانی پر دلالت کرتے ہیں۔

پھلیں گے پھولیں گے گلزار قوم کے اشعار — اٹھا ہمالیہ پربت سے ابر گوہر بار
ادھر بھی پڑ گیا اک دونگڑا اسی مینھ کا — ہے جس سے گلشن قومی پہ آج طرفہ بہار
بنائے مالنوں نے پیارے پیارے ہاتھوں سے — وفور شوق سے گہنے تر کے بندھنوار

یہ دھوم دھام یہ لطف اور جشن کا ساماں — جو دل نے دیکھا تو مجھ سے کہا کہ اے سرشار
یہی ہے وقت تیری طبع آزمائی کا — اٹھا لے خامۂ گوہر فشاں و عنبر بار
نظیر ہی نہیں رکھتا ترا اپنے فن میں کوئی — کریں گے صاحب انصاف اس سے کب انکار
کلام کے ترے مداح سب بڑے چھوٹے — بیان کے تیرے مشتاق سب صغار و کبار
زباں وہ پائی کہ بے نطق سینکڑوں بھی — طبیعت ایسی ملی شوخ جیسے چنچل نار
وہی ہے تو کہ تیرے فیض خوش بیانی سے — نول کشور نے پیدا کیے پچاس ہزار
یقین نہ آئے تو پڑھ لو فسانۂ آزاد — یہ لن ترانی نہیں واقعات ہیں سرکار
سخن کا مثل نہیں ہے قسم ہے قرآں کی — نہیں جواب ترا ہند میں کوئی زنہار
تو نثر کا ہے شہنشاہ نظم کا سلطاں — زمانہ بھر میں ہے مشہور تحفۂ سرشار

"تحفۂ سرشار" ایک معرکتہ الآرا مثنوی ہے۔ اس میں تقریباً تین سو اشعار ہیں۔ سرشار کی یہ مثنوی فصاحت زبان، انتخاب الفاظ و تراکیب، چستی بندش اور روزمرہ و محاورہ بندی کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔ اس کے چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

گھنگھور گھرا ہے آج بادل — میخانے کو کر دے تو بھی جل تھل
برسا دے شراب ناب ساقی — دکھلا دے آفتاب ساقی
فتویٰ قاضی کا کون مانے — لاکھوں میں پیوں کھلے خزانے
رم جھم یہ برس رہا ہے پانی — بے مے ہے حرام زندگانی
وہ جام پلا کر مست کر دے — مضموں سے مرا دماغ بھر دے

سرخوش ہو کر لکھوں کچھ اشعار — در ریز ہو خامۂ گہر بار
ہر چند کئی کلام منظوم — تصنیف سخنوران مخدوم
کیفی، غمخوار، ہجر، حشمت — شائع ہوئے ہیں بصد لطافت
پر بحر سخن سدا ہے باقی — دریا نہیں کار بند ساقی
یارب وہ مرے قلم کو دے زور — ہر سمت سے مرحبا کا ہو شور

سرشار کی غزلوں کا رنگ عاشقانہ اور رندانہ ہوتا تھا۔ ان میں شوخی و شگفتگی کے ساتھ ساتھ سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں کوئی ذاتی تجربہ فلسفہ یا تصوف نہیں ملتا۔ جدت ادا اور مضمون آفرینی بھی حال خال نظر آتی ہے۔ مضامین میں تنوع کا فقدان ہے۔ قصیدوں اور رثیوں میں اپنی جودت طبع کے جوہر ضرور دکھائے ہیں۔

مولوی عبدالشکور صاحب سرشار کی نسبت تحریر فرماتے ہیں "ان کے کلام میں وہ دلآویزی تو نہیں ہے جو ان کی نثر کی کتابوں میں پائی جاتی ہے پھر بھی ان کے اشعار حضرت اسیر لکھنوی کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔"

سرشار کے نمونہ کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے اپنی خاص توجہ افسانہ نگاری و نثر نگاری پر ہی مبذول فرمائی تھی۔

۵۔ شیو پرشاد وہبی لکھنوی

شاعر شیریں مقال منشی شیو پرشاد وہبی ولد رائے سوبھا رام وصفی قوم کائستھ سکسینہ باشندہ لکھنؤ مطبع نول کشور میں اودھ اخبار کے منیجر تھے۔ منشی نول کشور انھیں بہت عزیز سمجھتے تھے۔ وہبی آفتاب الدولہ خواجہ ارشد علی خاں بہادر متخلص بہ قلق کے شاگرد تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

نہیں کچھ ایک دو دن کا ہوں میں شاگرد اے وہبی
قلق سے شاعری میں میں نے کی ہے گفتگو برسوں

کلیات وہبی موسوم بہ "مرقع ارژنگ" اگست ۱۸۸۰ء میں طبع ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں وہبی بقید حیات تھے کیونکہ انھوں نے دیوان عنایت مطبوعہ ۱۸۹۹ء کی مندرجہ ذیل تاریخ کہی ہے۔

دیوان چھپ گیا ہے عنایت کا ان دنوں
جن کو کہ شعر کہنے میں حاصل کمال ہے
وہبی کو سال طبع کا جس دم ہوا خیال
ہاتف نے دی صدا سخن بے مثال ہے

کلیات وہبی مطبع نول کشور میں منجملہ ۲۲۲ صفحات ہیں جن میں ۱۵۲ صفحات تک غزلیں، صفحہ ۱۵۳ سے ۱۷۶ تک مخمس پھر چند تاریخیں، قصائد، سہرے اور رباعیات ہیں۔ صفحہ ۱۹۲ سے صفحہ ۲۱۹ تک وہبی کے وہ مضامین ہیں جنھیں انھوں نے فارسی میں تحریر فرمایا ہے۔

وہبی کی تاریخ پیدائش، سال وفات اور مفصل حالات زندگی پردہ

پڑا ہوا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ایسے باکمال شاعر کا مفصل تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ملتا۔

دہبی کے آغاز کلیات میں ایک نظم "مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات جل جلالہٗ" نہایت پرزور و دل آویز ہے۔ اس کی بندش الفاظ و محاورات، خوبی مضامین و فصاحت زبان اور بلاغت کلام پڑھ کر بے اختیار دل سے صدائے تحسین نکلتی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

تو قادر و غیور و غنی و کریم ہے ۔۔۔ تو مالک و سمیع، بصیر و علیم ہے

تو وارث و حلیم غفور و رحیم ہے ۔۔۔ تو حافظ و حفیظ، عزیز و کلیم ہے

واحد ہے تو قدیر ہے تو کبریا ہے تو

چاہے جو تو گدا کو ابھی بادشاہ کرے ۔۔۔ ذرے کو اوج نیر اعظم عطا کرے

ڈر کو خذف خذف کو دُر بے بہا کرے ۔۔۔ قطرے کو دم میں قلزم بے انتہا کرے

بحر عطا و بخشش و جود و سخا ہے تو

اس مناجات کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کسی ہندو نے اسے تحریر کیا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کی یہ اچھی مثال ہے۔

مخمس بر غزل منشی جواہر سنگھ جوہر کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے ۔۔۔ مکیں ہو گئے بے مکاں کیسے کیسے

ملے خاک میں نوجواں کیسے کیسے ۔۔۔ بدلتا ہے دور جہاں کیسے کیسے

دکھاتا ہے چرخ یہ سماں کیسے کیسے

۱؎ کلیات دہبی مسمی بہ مرقع ارژنگ

متاعِ خرد لوٹ کے لے گیا تو ۔۔۔ نہ تسکین خاطر نہ ہے دل پہ قابو
ذرا دیکھ تو آکے اے طفلِ بدخو ۔۔۔ نکلتے ہی آتے ہیں فرقت میں آنسو

رواں ہیں یہاں کارواں کیسے کیسے

لطافت تغزل کی شان اس غزل میں ملاحظہ ہو ؎

دیکھتے ہیں جب سے ہم رخسار جاناں کی طرف ۔۔۔ رخ نہیں بھولے سے کرتے ماہ تاباں کی طرف
کوئے جاناں ہم سے وحشت میں کبھی چھٹنے کا نہیں ۔۔۔ مثل مجنوں ہم نہ جائیں گے بیاباں کی طرف
جس نے دیکھی میری چشم تر کی گوہر باریاں ۔۔۔ آنکھ اٹھا کر پھر نہ دیکھا ابر نیساں کی طرف
جان لے گی ایک دن وہبی تمھاری چشم یار ۔۔۔ نشتر مژگاں کا رخ ہے اب رگ جاں کی طرف

نہ لائے کچھ زباں پر ہم خموشی نام ہے اس کا ۔۔۔ کیا سینے میں ہم نے اپنے خون آرزو برسوں

منشی دیبی پرشاد وہبی کے کلام کی نسبت رقم طراز ہیں[۱] "کلام ان کا بہت شستہ اور صاف ہے۔ مضامین سے آمد کا جوش پیدا ہے۔ آپ نے طبیعت ایسی شوخ پائی ہے کہ ہر شعر میں نئی بات نکالتے ہیں اور چونچلے سے خالی نہیں ہوتی۔ زبان وہ شیریں کہ سنتے جائیے اور سیری نہ ہو۔ حسن بیان کا یہ عالم کہ مطلب تصویر بن کر سامنے آجائے اور پردہ میں نہ چھپے۔ اونکے ہر کلام میں نیا لطف اور نیا رنگ ہے اور اسی وجہ سے ان کے کلیات کا نام مرقع ارژنگ ہے۔"[۲]

مگر راقم الحروف کی رائے میں حضرت بشاش نے وہبی کے کلام کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ دراصل وہبی کا بیشتر کلام عاشقانہ ہے جس میں حسن وعشق، وصل و ہجر، بہار و خزاں، بلبل و صیاد وغیرہ کا فرسودہ بیان

۱۔ کلیات وہبی مسمی بہ مرقع ارژنگ، ۲۔ آثار الشعرائے ہنود ص۱۶۱

ہے۔ کوئی جدت، نازک خیالی اور بلند پروازی مشکل سے ملتی ہے۔ عموماً جذبات سطحی اور عامیانہ ہیں جن میں اصلیت و واقعیت کی کمی ہے اسی وجہ سے جوش اور تاثیر کی بھی نمایاں کمی ہے۔ ان کے یہاں نہ کوئی تصوف نہ کوئی فلسفہ اور نہ فکر و خیال کی بلندی ہے مگر حسن زبان کے لحاظ سے کلام عمدہ ہے۔ زبان شستہ اور بندشیں پختہ ہیں۔ زبان کی سادگی و صفائی کلام کی شیرینی، شگفتگی و محاورں کی برجستگی بدرجۂ احسن ہے۔ تاثیر کلام، سوز و گداز اور جوش و تڑپ جو روح تغزل ہے ان کے کلام میں مفقود ہے۔ مگر اس زمانہ کی شاعری کا رنگ غالب وہی تھا جو ان کی شاعری کا ہے۔

۶۔ راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ حیدرآبادی

باقیؔ خلف راجہ نرہری پرشاد متوطن و رئیس حیدرآباد دکن، قوم کائستھ سکسینہ، سال ولادت ۱۸۶۴ء۔ شاگرد حضرت عاشقؔ و حضرت فیضؔ حیدرآبادی۔ آپ کے جد اعلیٰ رائے دولت رائے حضرت نواب آصف جاہ نظام الملک کے ہمراہ اورنگ آباد تشریف لائے تاقیام شاہی وہیں رہے۔ پھر حیدرآباد آئے۔ آپ کے والد راجہ نرہری پرشاد سنسکرت کے عالم تھے اور متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ کے مورثان عہدۂ جلیلہ پر ممتاز تھے اور خطابات سے فیضیاب ہوئے تھے۔ آپ صدر سررشتہ داری کے عہدہ پر ممتاز تھے اور فوج کے انصرام میں وہ قابلیت

دکھائی ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کم سنی سے شاعری کا شوق تھا۔ مذاق سخن سلیم رکھتے تھے۔ کلام میں رنگ تصوف کی خوبصورت آمیزش ہے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں قابل داد جدت دکھائی ہے۔ تیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کا اردو دیوان مسمیٰ بہ "بقائے باقی" اگرچہ مختصر ہے لیکن کلام کی خوبیوں کے باعث ممتاز ہے۔ بھاگوت فارسی، کیشو نامہ، کلیات یادگار باقی، قصائد باقی وغیرہ آپ کی تصنیف سے ہیں[1]۔

لالہ سری رام آپ کی نسبت فرماتے ہیں[2]: "باقی سنسکرت اور فارسی سے بخوبی ماہر اور کسی قدر عربی سے بھی بہرہ ور تھے۔ آپ سلطنت آصفیہ کے ایک ممتاز رکن جاگیر دار اور حضور نظام کے سچے خیر خواہ تھے۔ آپ دولت آصفیہ کی فوج کے سررشتہ دار اور دفتر خانساماں کے مہتمم تھے۔ حضور نظام کے مزاج میں آپ کو ایک خاص رسوخ حاصل تھا اور اکثر سفر و حضر میں ان کے ہم رکاب رہا کرتے تھے۔ شاہی تقریبوں اور درباروں کا انتظام بھی آپ ہی کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ آپ کو شعر و سخن سے دلی رغبت تھی۔ فارسی میں خوب کہتے تھے۔ فن سخن کے دلدادہ اور ارباب کمال کے بڑے قدرداں تھے۔ چنانچہ نواب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے ابتدائی قیام میں ان کے بڑے ممد و معاون رہے۔ ۱۸۹۰ء میں آپ کا اردو دیوان موسوم بہ "بقائے باقی" منشی دوارکا پرشاد افق کے اہتمام سے چھپا۔

ڈاکٹر محی الدین زور باقی کے متعلق فرماتے ہیں[3]: "ان کا سارا خاندان مسلمانوں

۱؎ بہار سخن، برق سیتاپوری ص۵۵ ، ۲؎ خمخانۂ جاوید جلد اول ص۵۳۲ ، ص۵۳۳ ، ۳؎ مرقع سخن ڈاکٹر محی الدین زور ص۱۶۵

سے شیر و شکر رہا اور یہ وسیع نظر، بلند مشرب اور مخلص انسان تھے۔ تنگ نظری اور تعصب کی ہوا تک ان کو نہیں چھو سکی مسلمانوں کے مذہب، معاشرت، تمدن اور اوضاع و اطوار سے بہت واقفیت رکھتے تھے اور اپنے کو اسی رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ وہ فارسی اور اردو کے ساتھ ہندی کے بھی بلند پایہ ادیب تھے۔ ان کے ادبی کارنامے ہر طرح قابل قدر اور لائق ستائش ہیں۔"

نمونۂ کلام

آہ سوزاں ہو اگر شعلہ فگن پانی میں
آگ کی طرح سے پیدا ہو جلن پانی میں

محبت میں ہوئے رسوائے عالم
جہاں ہنستا ہے روتے ہیں جہاں ہم

مقام اپنا ہے باقی بے مقامی
مکاں رکھتے نہیں جز لامکاں ہم

تصوف

دریا سے موج موج سے دریا الگ نہیں
ہم سے جدا نہیں ہے خدا اور خدا سے ہم

مست و مجذوب میں نہیں کچھ فرق
مے پرستی خدا پرستی ہے

چشم بلبل سے بنا دو مرے مرقد کا غلاف
جس میں سب جانیں کہ عاشق تھا کسی گل رو کا

تغزل اور مضمون آفرینی

عارض یار نہیں عکس فگن پانی میں
گل شاداب کا پھولا ہے چمن پانی میں

چھوڑنا عشق کا آساں ہے نہ کرنا آساں
کیا قباحت ہے کہ عاشق کو ہیں مشکل دونوں

ماہ نو جھکتا ہے مجرے کے لئے
مہرباں نیچے سے اوپر دیکھئے

کیا آپ ہی عالم میں ہیں شمشیر زن اے واہ
ہر وقت یہ ابرو کا چڑھانا نہیں اچھا

گریباں چاک ہے جو گل نظر آتا ہے گلشن میں ذرا سوچو تو کیا تاثیر ہے بلبل کے شیون میں

پھر چاہ ذقن دکھا رہے ہو پھر ہم کو کنویں جھنکا رہے ہو

مجھ کو جو تم رولا رہے ہو الٹی گنگا بہا رہے ہو

بام پہ یار کا چہرہ دیکھا طور پہ نور کا شعلہ دیکھا

باقی شکایت زمانہ یوں کرتے ہیں۔ طرز بیان داد طلب ہے۔

اک گل میں بھی نہیں بوئے وفا ہے باقی ان دنوں گلشن عالم کی ہوا بدلی ہے

کیا قدر تمہاری کوئی باقی کرے افسوس تم اچھے ہو لیکن یہ زمانہ نہیں اچھا

راقم کو بہ تلاش بسیار "بقائے باقی" دیکھنے کو نہ مل سکا۔ باقی کے حالات زندگی اور نمونہ کلام کی فراہمی کے لئے محض چند تذکروں پر اکتفا کرنا پڑا۔ جو چند اشعار تذکروں میں ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ باقی کا کلام پاکیزہ اور لطیف ہے۔ رنگ تصوف میں اچھے اشعار کہتے تھے۔ ان کے اشعار میں انفرادیت جھلکتی ہے۔ زبان شستہ اور بندشیں پختہ ہیں مگر پھر بھی باقی کے بیشتر اشعار لطف و اثر سے خالی ہوتے ہیں۔

ـــــــــــــــــــ

لہ ہندوؤں میں اردو از رفیق مارہروی ص۲۳۵ - ص۲۴۰

۷۔ رائے بہادر شیو نرائن آرام اکبر آبادی

رائے بہادر شیو نرائن آرام قوم کائستھ ماتھر، کے پر دادا ۱۷۸۴ء میں منتقل سکونت کر کے اجمیر سے آگرہ آئے۔ یہاں وہ اپنی قابلیت سے بنارس کے جلاوطن راجہ چیت سنگھ کے وزیر بن گئے۔ ان کے صاحبزادے رائے اجاگر چند کوتوال شہر تھے۔ آرام کے والد منشی نند لال پہلے آگرہ منصفی میں ناظر تھے۔ اس کے بعد راجہ جوتی پرشاد کی سرکار میں مختار عام مقرر ہوئے۔

منشی شیو نرائن آگرہ میں ۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش اور تربیت ان کے دادا کے چھوٹے بھائی منشی کنھیا لال کے ہاتھوں ہوئی۔ آگرہ کالج سے انگریزی اور فارسی کی تعلیم حاصل کر کے ۱۸۵۶ء میں اسی کالج میں انگریزی کے مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں وہ حکام کی مدد کرتے رہے جس کے صلہ میں انھیں دو مہینہ کی تنخواہ بطور انعام دی گئی۔

۱۸۵۹ء میں کالج کی ملازمت چھوڑ کر آبکاری کے محکمہ میں نوکر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد انکم ٹیکس میں اور پھر منصفی میں جا پہنچے۔ دو سال بعد سو روپیہ ماہانہ پر چنگی کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں ان کے زمانہ میں اس محکمہ کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوا۔

۱۸۷۸ء کے دہلی دربار میں انھیں خلعت ملی اور سند خوشنودی عطا ہوئی ۱۸۸۶ء میں جب ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی منائی گئی تو انھیں رائے بہادر

کے خطاب اور دربار میں کرسی نشینی کے اعزاز سے نوازا گیا۔

آرام نے ایک مطبع مفید الخلائق کے نام سے قائم کیا تھا۔ غالب کی دو کتابیں دستنبو فارسی (۱۸۵۸ء) اور دیوان اردو (۱۸۶۳ء) اسی مطبع سے شائع ہوئیں۔ دو پرچے بھی اسی مطبع سے شائع ہوتے تھے۔ ایک پندرہ روزہ گلدستہ معیار الشعراء اور دوسرا ماہانہ مفید الخلائق۔ ان دونوں کی ادارت کے فرائض بھی آرام ہی کے ذمہ تھے۔ گلدستہ کے لئے غالب بھی کبھی کبھی اپنا کلام بھیجتے رہتے تھے۔ اسی مطبع سے ۱۸۵۸ء میں ایک ماہوار پرچہ رسالہ بغاوت کے عنوان سے شائع ہوتا رہا۔ اس پرچہ کے ایڈیٹر آرام کے دوست ڈاکٹر مکند لال تھے۔

آرام ۱۸۵۸ء میں کمیٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ دو سو روپیہ ماہانہ پنشن مقرر ہوئی لیکن اس کے بعد زیادہ دنوں وہ زندہ نہیں رہے۔ وہ گردے کے مرض میں مبتلا ہو کر ۴ ستمبر ۱۸۹۸ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

(ماخوذ از تلامذۂ غالب میلارام ص۲۱۔ ص۲۴)

آرام کو غالب کے فیض صحبت سے شعر و سخن کی طرف توجہ ہوئی۔ غالب انھیں نہایت عزیز رکھتے تھے۔ اردوئے معلی کے متعدد رقعے اس کے شاہد ہیں۔ آپ ایک خوش فکر و خوش گو شاعر تھے۔ تصوف کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ عشقیہ مضامین سے کم رغبت تھی۔ کلام میں سادگی، نازک خیالی اور متانت پائی جاتی ہے۔ مولف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں کہ باوجود تلاش ایک ہی غزل دستیاب ہو سکی۔ جس پر رنگ غالب کا اثر نمایاں ہے[1]

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد اول ص۱۷۔ ص۱۸

غضب ہے مدعی جو ہو وہی پھر مدعا ٹھہرے
جو اپنا دشمن دل ہو وہی دل کی دوا ٹھہرے

نہ ٹھہرے ناامیدی اس کے دل میں اور کیا ٹھہرے
کہ جس کا بعد مرنے کے حصول مدعا ٹھہرے

وہ چاہیں جس قدر جور و جفا ہم پر کریں لیکن
ہمیں تسلیم لازم ہے کہ پابند رضا ٹھہرے

ادھر آنے کو وہ ہیں اور ادھر وقت سفر آیا
عجب مشکل نہ وہ آئیں نہ دم بھر کو قضا ٹھہرے

یہ دنیا اک سرا ہے اس کو آخر چھوڑ جانا ہے
اگر دو چار دن آکر یہاں ٹھہرے تو کیا ٹھہرے

قیام اپنا ہو اس محنت سرائے دہر میں کیونکر
جہاں آفت ہی آفت ہو وہاں آرام کیا ٹھہرے

۸- دیبی پرشاد بشاش اجمیری

منشی دیبی پرشاد بشاش کی گرانمایہ ادبی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے ہندو شعرار کا سب سے قدیم تذکرہ موسوم بہ تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود لکھا جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں منجملہ ۴۵۰ صفحات ہیں اور اس میں تقریباً ۶۵۰ ہندو شعرار کے مختصر حالات زندگی اور نمونہ کلام دیے گئے ہیں۔ انھوں نے بہت کم شعرار کی نسبت اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ ان کی تنقید عموماً سطحی اور نہایت مختصر ہے مگر قدامت کے لحاظ سے ان کا یہ تذکرہ نہایت گرانقدر سمجھا جاتا ہے۔

منشی دیبی پرشاد قوم کائستھ سکسینہ کے بزرگوں کا وطن بھوپال تھا۔ مگر دو پشت سے بسلسلۂ ملازمت اجمیر میں قیام پذیر تھے۔ ان کے والد منشی نتھن لال بہجت بھی ایک نامور شاعر تھے۔ دیوان بہجت طبع ہو چکا ہے۔ اس میں

تقریباً ۱۷۵ صفحات ہیں۔ منشی نتھن لال ریاست ٹونک کے نواب عبدالکریم خاں کی سرکار میں منشی گری و پیشکاری کے عہدے پر فائز تھے۔

منشی دیبی پرشاد کی ولادت ۱۸۴۷ء میں جے پور میں اپنے نانا حکیم شنکر لال کے یہاں ہوئی تھی۔ سولہ برس کی عمر تک انھوں نے اجمیر میں اپنے والد سے تعلیم حاصل کی، پھر صاحبزادہ نواب عبدالکریم خاں کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ نواب مذکور ان سے بہت خوش رہتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ان کو ریاست جودھ پور میں ملازمت مل گئی۔ یہاں یہ محکمۂ اپیل میں نائب سررشتہ دار تھے۔

بشاش نے تقریباً پچاس کتابیں تصنیف و تالیف کیں جن میں مندرجہ ذیل شائع ہو کر بیحد مقبول ہوئیں۔

۱۔ افسانہ خرد افروز یعنی قصۂ بہرام و بہروز — ایک دلچسپ اور سودمند قصہ تحصیل علم کے فوائد میں ہے۔

۲۔ لطائف ہندی — اس میں ۷۰۰ کے قریب عمدہ لطیفے درج ہیں۔

۳۔ تاریخ میواڑ۔

۴۔ خواب راجستھان — ایک تاریخی کتاب ہے۔

۵۔ گلدستۂ اخلاق۔

۶۔ تاریخ تزک ہندی — یہ ایک مختصر تاریخ مہابھارت سے ۱۸۶۷ء تک کی ہے۔

۷۔ گلدستۂ ادب — اس کتاب پر سو روپیہ گورنمنٹ ممالک مغربی سے انعام ملا۔

۸۔ تعلیم النساء۔ اس کتاب پر گورنمنٹ ممالک مغربی سے سو روپیہ انعام ملا۔

ان کے علاوہ مختلف ریاستوں کی تواریخ کے متعلق تقریباً بائیس کتابیں لکھی تھیں جن میں بعض ناتمام و غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ ۱۸۸۵ء تک ان کا دیوان مرتب نہ ہو سکا تھا۔

۱۸۶۵ء میں ریاست ٹونک کے رئیس صاحبزادہ محمد خاں اجمیر آئے اور بشاش کو اپنے ساتھ لے گئے۔ شعر گوئی کی طرف یوں تو بشاش کو شوق پہلے ہی سے تھا مگر یہاں آکر آقا کی فرمائش سے طرح پر غزلیں کہہ کر مشاعروں میں شرکت کرنا پڑتا تھا جس سے مشق سخن کافی بڑھ گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ریاست کی طرف ہندوؤں پر جو سخت مذہبی قیود لگے تھے ان سے تنگ آکر یہ ملازمت چھوڑ کر اجمیر چلے آئے۔ پھر اپنے چھوٹے بھائی بہاری لال کے ذریعہ ریاست جودھ پور میں محکمۂ اپیل میں نائب سررشتہ مقرر ہوئے۔ شروع میں یہ کچھ دنوں تک حریق تخلص فرماتے تھے۔ ان کی کتاب "تذکرہ شعرائے ہنود" سے ان کے چند اشعار منتخب کر کے یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

نمونۂ کلام

کون ایسا ہے جو تیرے جاں نثاروں میں نہیں بات جو تجھ میں ہے گل وہ ہزاروں میں نہیں

دہن غنچہ ہے، نرگس چشم ہے، رخ گل ہے خط ریحاں
ترا نظارہ کیا کم باغ سے اے رشک بستاں ہے

ترے گیسوئے پیچاں کا جو رہتا تھا مجھے سودا

تو بعد از مرگ پھیلا قبر پر بھی عشق پیچاں ہے

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں — بحر غم کے حباب ہیں دونوں

یہ چشم جام شراب ہیں دونوں — ان سے عالم خراب ہیں دونوں

آتش ہجر سے حریق اب تو — جگر و دل کباب ہیں دونوں

برا نہ جانے تو تقویٰ مآب کیا جانے — نہ پی ہو جس نے وہ قدر شراب کیا جانے

دکھائیں آپ نے تن تن کے چھاتیاں اوس کو — وگرنہ اتنا ابھرنا حباب کیا جانے

ذرا آیا خواب میں تو جس کے اس کا خواب ہی کیا — نہ سویا ساتھ تو جس کے وہ خواب کیا جانے

بغل میں جس کے نہ ہو ایک چاند سا معشوق — وہ لطف سیر شب ماہتاب کیا جانے

جسے نصیب نہ ہو لذت وصال صنم — بھلا وہ لذت عہد شباب کیا جانے

دانستہ چھیڑ کرتے ہیں زلف دوتا سے ہم — آفت کو مول لیتے ہیں کالی بلا سے ہم

بگڑا یہ شب کو وہ کہ مری جاں پہ آبنی — ہارے منا منا کے بت بے وفا سے ہم

چونک پڑتے ہیں خیال زلف میں اس طرح ہم — جیسے اٹھتا ہے کوئی خواب پریشاں دیکھ کر

باغ میں خوں روئے غنچے تجھ کو خنداں دیکھ کر — ہوش بلبل کے اڑے مجھ کو غزل خواں دیکھ کر

کیا جلایا ہے ہم کو ہجر کی شب — شمع تھی یا کہ داغ تھا دل کا

شمع روتی تھی لوٹتے تھے ہم — تیرے بن تھا یہ حال محفل کا

ہر بزم میں ہے ذکر تیری جلوہ گری کا — لیتا نہیں اب نام کوئی حور و پری کا

بعد مدت اس نے بلوایا تو ہارے — پانو پھولے طاقت رفتار کے

رخ ہے تمھارا بدر کا بجلی کی ہے کمر — اور مانگ کہکشاں کی ہے ابرو ہلال کی

تشبیہ اس سے دیتے ہیں ابروئے یار کو　　اب تو کمان خوب چڑھی ہے ہلال کی
زلف سیہ کو چھوتے ہی اندھیر ہو گیا　　ثابت ہوئی ہے مجھ یہ خطا بال بال کی
کب ہے شفق یہ وقت سحر آسمان پر　　آتش لگی ہوئی ہے تمہارے جلال کی

بشاش کے کلام میں نہ کوئی فلسفہ ہے نہ تصوف، نہ جذبات کی پاکیزگی ہے، نہ علوئے تخیل، زندگی پر نہ کوئی تنقیدی نظر ہے اور نہ حیات و کائنات کا مشاہدہ و مطالعہ۔ مگر پھر بھی تغزل کے لحاظ سے ان کا کلام لطافت و نزاکت اور شوخی و شگفتگی سے پر ہے۔ مضمون آفرینی اور بلند پروازی، جدت اور واقعیت ان کے کلام میں نہ سہی مگر روانی و صفائی، تشبیہ و استعارہ اور روزمرہ و محاورے کا لطف کافی ملتا ہے۔ بشاش رعایت لفظی کے دلدادہ تھے حالانکہ ان کے کلام میں رنگ ناسخ کی جھلک ہے مگر اسے ہم خشک اور بے کیف شاعری نہیں کہہ سکتے۔ وہ ایک زندہ دل آدمی تھے۔ ہنسنا ہنسانا اور تفریح طبع ان کی شاعری کا مقصد تھا اس وجہ سے ان کی شاعری میں سوز و گداز کی بھی کمی ہے۔ الفاظ کے انتخاب، بندش کی چستی اور زبان کی صفائی کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ بشاش فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے عالم تھے جس سے زبان کا لطف ان کے کلام میں خوب ملتا ہے۔[۱]

۱۔ بشاش کے مزید حالات زندگی اور نمونۂ کلام تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۔ صفحہ ۲ ملاحظہ ہوں۔

۹۔ لالہ مادھورام جوہر فرخ آبادی

لالہ مادھورام جوہر خلف الرشید لالہ جواہر مل ساہو کا خاندان فرخ آباد میں بہت ممتاز اور باوقار سمجھا جاتا تھا۔ ان کا سارا کنبہ شعر وسخن سے طبعی مناسبت رکھتا تھا۔ جوہر کے والد جواہر مل بھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ جوہر کے دو صاحبزادے تھے ایک شیو پرشاد جوہری اور دوسرے رام پرشاد گوہر۔ ان کا شمار بھی فرخ آباد کے استادوں میں تھا۔ منشی شیو پرشاد جوہری نے اپنے والد کا دیوان ان کی وفات کے بارہ سال بعد ۱۳۲۰ھ میں طبع کرایا تھا

آبائی تمول اور فضیلت علمی کے ساتھ جوہر شعر بھی خوب کہتے تھے۔ عروض و قافیہ سے بخوبی ماہر تھے۔ منیر شکوہ آبادی کے تلامذہ میں فرد تھے اور خود بھی استادانہ قابلیت رکھتے تھے۔ شعراء کے بڑے قدردان اور محسن تھے۔ چنانچہ منیر شکوہ آبادی ان ہی کی وجہ سے اکثر فرخ آباد میں رہے۔ جوہر کبھی کبھی بغرض سیر وسیاحت دہلی لکھنؤ اور اکبر آباد وغیرہ گئے اور مہینوں وہاں قیام کیا۔

بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت میں جوہر مختار شاہی کے معزز عہدے پر فائز تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں محبان وطن کی حمایت کرنے کے انتقام میں انگریزوں نے حضرت جوہر کی جائداد ضبط کر لی۔ انھوں نے ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا[1]

---

[1] خمخانہ جاوید۔ جلد دوم ص ۲۹۷

جوہر کی نسبت حضرت جگر بریلوی یادرفتگاں[1] میں لکھتے ہیں "سخن سنجی وسخن گستری میں اپنے وقت کے مسلم استاد تھے۔ اہل ہنر اور اہل سخن کے بڑے قدر دان تھے۔ منیر ان کی وجہ سے اکثر مدتوں فرخ آباد میں قیام کرتے۔ شب و روز شعر و سخن کے چرچے اور جلسے رہتے۔ کبھی جوہر خود دہلی لکھنؤ اور اکبر آباد میں جو شاعری کے گہوارے تھے جا کر مہینوں قیام کرتے۔ اہل کمال سے صحبتیں گرم رہتیں۔ سخنوری وسخن فہمی کی داد دیتے۔ جوہر شمع کمال کے پروانے تھے اور دن رات اسی کے عشق میں زندگی کاٹتے تھے۔"

جوہر نے اپنے دیوان میں اپنے استاد منیر سے والہانہ عشق وعقیدت کا اظہار کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جوہر مجھے ہے عشق جناب منیر سے　　　کس طرح وصف خوبیٔ استاد کیجئے

حضرت جوہر کے متعدد مصرعے اور اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ان کا کہنے والا کون شاعر ہے۔ ایسے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر　　　اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا　　　تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

یوں تو منھ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو　　　جب میں جانوں کہ میرے بعد مرا دھیان رہے

دوست دو چار نکلتے ہیں کہیں لاکھوں میں　　　جتنے ہوتے ہیں سوا اتنے ہی کم ہوتے ہیں

کیا بتاؤں کس طرح دل آ گیا　　　کیا کہوں کیونکر محبت ہو گئی

---

[1] یادرفتگاں از جگر بریلوی ص ۲۱۶ - ص ۲۳۶

غیروں سے تو فرصت تمھیں دن رات نہیں ہے
ہاں میرے لیے وقت ملاقات نہیں ہے

دیگر اشعار

پھانس کر دل کو دیا کرتی ہے جھٹکے لاکھوں
زلف پیچاں کو تری یاد ہیں لٹکے لاکھوں

وصل بھی شعلہ رخوں کا نہیں جینے دیتا
جلتے ہیں شمع سے پروانے لپٹ کر لاکھوں

تجھ سا کوئی جہان میں نازک بدن کہاں
یہ پنکھڑی سے ہونٹ یہ گل سا بدن کہاں

جوش و خروش ساتھ جوانی کے چل دیئے
وہ موسم بہار وہ دیوانہ پن کہاں

ذرہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں
اے آسمان میں بھی کبھی آفتاب تھا

جس کو ہوا یہ عارضہ وہ جان سے گیا
دیکھے ہیں ہم نے عشق کے بیمار سیکڑوں

یہ جوڑا کھولنا بھی پیچ سے خالی نہیں ان کا
الجھ جاتا ہے دل جب بال شانوں پر بکھرتے ہیں

مہ نو ابروئے پُر خم، نگہہ برگشتہ
ہم نے ٹیڑھا جسے دیکھا اسے خنجر جانا

تصور زلف کا ہے اور میں ہوں
بلا کا سامنا ہے اور میں ہوں

جن نگاہوں سے لیا ہے دل شیدا میرا
ڈھونڈھتا ہے انھیں تیروں کو کلیجا میرا

واہ اے ابر کرم واہ اے دریا دل
ہر طرف آپ برستے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

دل بچے شہر حسن میں کیوں کر
لوٹ ہوتی ہے ڈاکے پڑتے ہیں

نامہ بر نا امید آتا ہے
ہائے کیا سست پانوں پڑتے ہیں

آتشِ گل سے مناسب ہے حذر اے بلبل
ہاتھ رکھتا ہے کوئی جان کے انگاروں پر

تجربات دنیوی

بے وفا ذات حسینوں کی ہے اے حضرت عشق
دل کو دینا تو ذرا سوچ سمجھ کر دینا

دو ہی دن میں تو تو بیگانوں سے بدتر ہو گیا
اب میں تیرا اے دلِ نا آشنا کوئی نہیں

اپنے مطلب کی محبت رہ گئی ہے آج کل
کیا زمانہ ہے کسی کا اے خدا کوئی نہیں

چنگ ورباب ومطرب وساقی وجام مے
سب عیش ہیچ تھا جو تو اے جانِ جانہ تھا

درد وسوز

تجھے تو دیکھ کے ہوتا ہے رنج اے جوہر
بتا تو عشق میں کس کے یہ تیرا حال ہوا

اشک قابو میں نہیں راز چھپاؤں کیوں کر
دشمنی مجھ سے مرے دیدۂ تر رکھتے ہیں

رشک پرواز کریں کیوں نہ اسیرانِ قفس
ہمصفیرانِ چمن بازو و پر رکھتے ہیں

دربدر خاک بسر پھرتے ہیں مارے مارے
خانہ برباد محبت کہیں گھر رکھتے ہیں

حقائق

قرآنِ رُخ کے چھونے کی جو آرزو کریں
پہلے وہ آب دیدۂ تر سے وضو کریں

منہ تک بھری ہے شیشۂ دل میں شرابِ عشق
رنگت چھپائیں اس کی کہ پوشیدہ بو کریں

اپنی خودی مٹائیں تو پائیں رہِ وصال
کھوئیں جو آپ کو وہ تیری جستجو کریں

پیرِ مغاں تو مست ہے اپنے ہی حال میں
کس سے سوال شیشہ و جام و سبو کریں

خصوصیات کلام جوہر

حضرت جوہر کو شعر و شاعری سے طبعی مناسبت تھی جس سے ان کے کلام میں تصنع اور آورد کے بجائے آمد کا زور رہتا ہے۔ ان کے تخیلات اکثر حقیقی جذبات اور ذاتی تجربات پر مبنی ہوتے ہیں جس سے تاثیر کلام بڑھ جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے کلام میں کہیں کہیں درد و سوز اور تصوف کی جھلک بھی ملتی ہے مگر ان کی طرز خاص معاملہ گوئی ہے۔ عشقیہ مضامین کو لطافت اور رنگینی کے ساتھ سادہ اور سلیس زبان

بیں ادا کرنے میں جوہر کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کی استادانہ قابلیت اور مشق و مہارت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے متعدد اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں۔

لالہ سری رام مصنف خمخانہ جاوید جوہر کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں[1]

"اشعار عجیب کیف آمیز ہوتے ہیں جن کے پڑھنے سے قارئین اور سامعین دونوں کو لطف حاصل ہوتا ہے اور دونوں کے دلوں پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ ان کے کلام میں دلچسپی اور دل کشی ہونے کے علاوہ ہر شعر ناخن بدل ہے۔ ان کی طرز خاص معاملہ گوئی ہے اور جدت سے خالی نہیں۔ زبان بہت صاف، شستہ اور بے تکلف لکھتے ہیں۔ بہرحال ان کے مستند ہونے میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔"

جگر بریلوی جوہر کے کلام کی نسبت لکھتے ہیں[2] "کلام میں صرف غزلیات کا کچھ انتخاب نظر سے گذرا۔ بڑا عمدہ اور مزیدار کلام ہے۔ مضامین کے لحاظ سے تو وہی شانہ و آئینہ، رقیب و رقابت، طعن و تشنیع، بوسہ و دشنام، نامہ و پیام، ہجر و وصال کے اذکار و معاملات ہیں لیکن اس صفائی، شوخی اور خوبصورتی سے نظم ہوئے ہیں کہ طبیعت پھڑک اٹھتی ہے۔"

---

[1] خمخانہ جاوید۔ جلد دوم ص ۲۹۷ - [2] یادرفتگاں از جگر بریلوی ص ۲۱۶، ص ۲۲۳

۱۰- دیبی پرشاد سحر بدایونی

منشی دیبی پرشاد سحر کے بزرگوں کا وطن بانگرمئو (علاقہ لکھنؤ) تھا۔ ان کے جدامجد منشی حکومت رائے نے بسلسلہ ملازمت محکمہ عدالت مال بدایوں میں آکر بود و باش اختیار کی۔ ان کے پدر بزرگوار منشی چنی لال اخگر بھی اچھے شاعر تھے۔ آزاد وضع اور سادہ چال رکھتے تھے۔ یہ قوم کایستھ سریواستو سے تھے۔ سحر ۲۴ر دسمبر ۱۸۴۰ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی۔ فن شعر میں اپنے والد ماجد سے استفادہ کیا۔ بدایوں میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز تھے۔

سحر نے متعدد رسالے مثلاً معیار البلاغت، معیار الاملا، خلاصۃ المنطق، ارژنگ چین، محیط المساحت اور مراۃ العلوم وغیرہ لکھے ہیں۔ ان کا دیوان اول موسوم بہ "سحر سامری" ۱۸۶۵ء میں اور دیوان دوم موسوم بہ "طلسمات سحر" ۱۸۹۴ء میں طبع ہوا۔ سحر اپنے زمانہ کے بڑے مرتبہ کے شاعر تھے[۱]

لالہ سری رام، سحر بدایونی کے متعلق لکھتے ہیں: "شباب کے ہنستے کھیلتے دن دہلی اور لکھنؤ میں گذرے۔ کشیدہ قامت، سانولا رنگ اور چیچک رو تھے۔ مزاج نفیس اور عطریات کے شوقین تھے۔ عادات اور اخلاق کے لحاظ سے

---

[۱] ماخوذ از دیوان سحر اور تذکرہ بہار سخن مرتبہ برق سیتاپوری ص ۱۹۳

[۲] خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۱۱۸ - ص ۱۲۵

شریف تھے۔ لالہ رام لال راحت اور منشی گیندن لال گوہر بدایونی کے یارانِ صادق میں تھے۔ نہایت علم دوست اور کلام کے حسن و قبح کے پرکھنے میں اپنے احباب سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔ خوشنویسی میں یگانہ اور زود گوئی میں مشہور زمانہ تھے۔ آپ نے پنشن لینے کے بعد بھی علمی زندگی اور درس و تدریس کا شغل جاری رکھا، افسوس کہ آپ کے انتقال کے بعد آپ کا کتب خانہ برباد ہو گیا اور نایاب قلمی کتابیں پنساریوں کی ردی میں شامل ہو کر کوڑیوں کے مول فروخت ہوئیں۔ آپ کے کلام معارف نظام میں تصوف اور حقائق کے نکات موجود ہیں۔ صنائع بدائع کے برتنے میں روزمرہ، سادگی، بے ساختہ پن کو زیر نگاہ رکھتے تھے۔ عاشقانہ شعر خوب کہا ہے۔ جو داسوخت عالم جوانی کے لکھے ہوئے ہیں ان میں دلی واردات کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔"

منشی دیبی پرشاد سحر فن شاعری کے مسلم الثبوت استاد اور صاحب تلامذہ تھے۔ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے اور بڑے نکتہ سنج و فصیح البیان تھے۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔

ان کا دیوان سحر جب طبع ہوا تو بدایوں کے متعدد شعراء نے اس کی طباعت کی تاریخیں کہیں۔ سب نے اس دیوان کی بے حد تعریف کی۔ اس کی تعریف میں منشی فاخر حسین بدایونی نے لکھا ہے ؎

کیا لکھے کوئی وصف شعروں کا پری مجوب ہیں خدا کی قسم

جو کہ ہیں نکتہ ور بدایوں کے سخت مجوب ہیں خدا کی قسم

گوہر بدایونی فرماتے ہیں ؎

کیفِ سخن سے مست ہوں میں جھوم جھوم کر | دیوانِ سحرؔ سامنے رکھا ہے چوم کر

سحرؔ اپنے کلام کی مقبولیت کی نسبت خود فرماتے ہیں ؎

پسندیدہ نہ ہوا ے سحرؔ کیوں سب کو کلام اپنا
رہے ہم مدتوں دہلی میں چھ ناں لکھنؤ برسوں

انتخاب کلام سحرؔ بدایونی

مندرجہ ذیل زبان زد خلایق شعر سحرؔ بدایونی ہی کا ہے ؎

دل شگفتہ ہوا کی سیرِ چمن شاد رہے | باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

اسی غزل کا ایک دوسرا شعر یہ ہے ؎

مر گئے عشق میں کامل جو تھے قیس و فرہاد | ہائے دنیا میں نہ اس فن کے اُستاد رہے

ضرب المثل

چل نہ وہ چال جو اپنے بھی پرائے ہو جائیں | لطف و احسان سے بیگانہ کو بھی کر اپنا

ندرتِ تشبیہہ و جدّتِ ادا

مقابل ابر ہو کیونکر ہمارے دیدۂ تر سے | کہ وہ برسے فقط برسات میں یہ سال بھر برسے
پہرہ ہے حسنِ گنج پہ مارِ سیاہ کا | عارض پہ اس کے گیسوئے پر پیچ و خم نہیں
چاند میں دھبا ہے اور خورشید کی رنگت ہے زرد | کس سے دوں تشبیہہ پھر میں یار کے رخسار کو
زیرِ گیسو جو در گوش تمہارا چمکا | مجھ کو دھوکا ہوا بدلی میں ستارا چمکا
آسماں پر ہے ستاروں کی ضیا کا دعویٰ | اے صنم تو بھی دُرِ گوش خدارا چمکا

---

(۱) ماخوذ از دیوان "طامات سحر"

جو التہاب مری آہ شعلہ بار میں ہے
نہ برق میں ہے نہ شعلہ میں نہ شرار میں ہے

جدا ہوں یار سے میں عالم شباب میں حیف
فراق بلبل و گل موسم بہار میں ہے

مل گیا مفت عدن اور بدخشاں مجھ کو
یاد رہتے ہیں کسی کے لب و دنداں مجھ کو

نہیں برقع سے ہے نور رخ تاباں روشن
نظر آتا ہے چراغ تہہ داماں مجھ کو

تغزل

جب وہ انداز سے گلشن میں خراماں ہونگے
سرو شمشاد خجالت سے پشیماں ہونگے

حور و غلماں نہ اگر صورت انساں ہونگے
جا کے فردوس میں ہم سخت پشیماں ہونگے

جتنے حسیں ہیں سب کو یہ کہتا ہیں ہی لوں
عاجز ہوں ہاتھ سے دل خانہ خراب کے

ترس حال زار پر اے ہمنشیں کھائیں گے کیا
جب بلائے سے نہ آئے وہ تو خود آئیں گے کیا

قصۂ غم گر سنائیں بھی تو پھل پائیں گے کیا
ہم کہے جائیں گے سمجھے وہ کہے جائیں گے کیا

شیخ صاحب خالی باتیں آپ کی ہم کیا سنیں
وصل جاناں کی کوئی تدبیر بتلائیں گے کیا

ہمنشیں دیتا ہے کیوں ترغیب سیر بوستاں
دل ہی کس کے پاس ہے واں جا کے بہلائیں گے کیا

جب نقاب اسکے چہرے سے سرکا
نہ رہا ہوش پاؤں اور سر کا

آب زہرہ ہوا سمندر کا
دیکھ کر حال دیدۂ تر کا

وقت نظارہ دیدۂ حیراں
بن گیا خال روئے انور کا

نہیں ملے سحر اس زمانے میں
قدرداں کوئی اہل جوہر کا

حقائق

زاہدا عشق مزاجی ہے حقیقی کی دلیل
دیکھ کر روئے صنم مجھ کو خدا یاد آیا

خود فراموش رہا عشق بت کافر میں
کبھی بھولے سے نہ بندے کو خدا یاد آیا

مجازی

دیکھ سکتی ہے انھیں چشم تصور ہر جا
مری آنکھوں سے کہاں جا کے وہ پنہاں ہونگے

تم بھی نہ ملے کچھ نہ ہوئی طاعت حق بھی
رکھا مجھے تم نے نہ یہاں کا نہ وہاں کا

ہے ہر صنم کے جلوے سے نور خدا عیاں
کتنے خدا ہیں بہر خدا کچھ نہ پوچھیے

متفرق

حسن انسان سے نہیں بڑھ کے کبھی حور کا حسن
ہم نہیں آئیں گے زاہد ترے بہکانے میں

ناصح میں ترک عشق بتاں تو ابھی کروں
پر دل نہیں خدا کی قسم اختیار میں

ساقی نہ دیر کر یہ خدا ساز بات ہے
ہے لطف آفتاب شب ماہتاب میں

رباعیات

فانی ہے جہاں کی شادمانی اے سحر
ہے نقش بر آب زندگانی اے سحر

ذات باری کو ہے فقط ایک بقا
باقی جو کچھ ہے سب ہے فانی اے سحر

وہ لطف و نشاط زندگانی نہ رہا
وہ مجمع و شغل شعر خوانی نہ رہا

کیا روئیے اگلی صحبتوں کو اے سحر
افسوس وہ عالم جوانی نہ رہا

قطعہ

میں نے ان سے یہ کہا مرتے ہیں اب تو ہجر میں
دشمن جاں عشق اے جانی تمھارا ہوگیا

دل تڑپتا ہے جدا سینہ جدا ہے بے قرار
چین پڑتا ہی نہیں کیا جانے کیا ہوگیا

مجھ کو یوں کہتا ہے کوئی اب پھنکا جاتا ہے یہ
کوئی کہتا ہے یہ کوئی دم میں ٹھنڈا ہوگیا

کوئی کہتا ہے اسے آسیب کا ہے کچھ خلل
کوئی کہتا ہے پری کا اس کو سایا ہوگیا

کوئی کہتا ہے کہ اس کو صرع کا ہے عارضہ
کوئی نبضیں دیکھ کے کہتا ہے سکتا ہوگیا

کوئی کہتا ہے کہ ہے ہیجان صفرا کا اسے
کوئی کہتا ہے مقرر اس کو سودا ہوگیا

میری جاں افسوس رحم اس پر بھی کچھ تجکو نہیں — کیسا دل لوہے کا پتھر کا کلیجا ہو گیا
مار کر وہ قہقہہ بولے ابھی روتے ہو کیا — دل لگانا آپ کے نزدیک ٹھٹھا ہو گیا

مثنوی

انتخاب از "نامہ کہ در مفارقت محبوبے رقم پذیرفت"

اے گلستانِ محبوبی — سروِ آزاد گلشنِ خوبی
اے سراپا جمال و مایہ ناز — راحتِ جان عاشقِ جانباز
رشکِ شاہدانِ زہرہ جبیں — رشکِ عذرا و غیرتِ شیریں
جب سے تجھ سے جدا ہوا ہوں میں — اک مصیبت میں مبتلا ہوں میں
یاد رہتی ہے ہر گھڑی تیری — صورت آنکھوں میں ہے کھڑی تیری
کام کوئی کیا نہیں جاتا — شغل کوئی بھی خوش نہیں آتا
تن یہاں ہے تو جاں ہے تیرے پاس — کہیے اب کیا ہے زندگی کی آس
یاد ہے تیری رات دن مجھ کو — جان دو بھر ہے تیرے بن مجھ کو
دھیان میں ہیں جو تیرے زلف کے بال — زندگی ہو گئی ہے مجھ کو وبال
گل جو صورت مجھے دکھاتے ہیں — تیرے رخسار یاد آتے ہیں
کبھی روتا ہوں مثلِ ابرِ مطیر — کبھی حیراں ہوں صورتِ تصویر
نہیں معلوم تو نے اے گل رو — کر دیا ہائے مجھ پہ کیا جادو

تنقید و تبصرہ

سحر فن شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ جملہ اصنافِ سخن پر قادر

تھے۔ ان کا کلام عموماً عاشقانہ جذبات سے مملو ہے، جس میں حسن وعشق کے بہترین مرقعے ملتے ہیں۔ جذبات قلبیہ اور وارداتِ عشقیہ کو انھوں نے نہایت خوبی اور جدتِ ادا کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ حسن بیان کے ساتھ لطافت زبان اور نادر تشبیہات واستعارات کے استعمال کا انھوں نے بڑا لحاظ رکھا ہے جس سے ان کے کلام کی دلچسپی اور دل آویزی بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کے کلام میں سنجیدہ مضامین اور فلسفہ کا فقدان نظر آتا ہے۔ ہاں کہیں کہیں تصوف اور معرفت کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔

سحر اپنے ماحول کے زیرِ اثر کسی قدر رعایت لفظی کے دلدادہ تھے مگر غزل کے پرانے عیوب گل وبلبل، صیاد وقفس، شمع وپروانہ، معشوق کی کج ادائی و بے مہری وغیرہ سے ان کا کلام بڑی حد تک پاک ہے۔ حالانکہ سحر، حالی اور آزاد کے زمانہ کے شاعر تھے مگر غالباً ان تک طرزِ جدید کی شاعری کی لہر پہنچ نہ سکی تھی۔ وہ فن شاعری میں رنگِ غالب اور طرزِ آتش کے پیرو معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی اکثر مشہور غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور مومن وامانت کی غزلوں پر خمسے لکھے ہیں۔

۱۱۔ بنواری لال شعلہ علی گڈھی

(۱۸۴۷ء - ۱۹۰۳ء)

بنواری لال شعلہ قوم کایستھ بھٹناگر اس دور کے سب سے بڑے اور مایہ ناز ہندو شاعر گذرے ہیں۔ یہ اپنے والد منشی موتی لال کے چوتھے اور سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ان کا تمام خاندان علم دوست اور اہل تصنیف تھا۔ جھار میں ان کی آبائی جائداد تھی۔ ان کے والد منشی موتی لال بسلسلہ ملازمت ناظر عدالت ججی سہارنپور چلے آئے تھے۔

شعلہ ۲۵ جولائی ۱۸۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ تھوڑے عرصہ بعد ان کے والد کی وفات کے باعث خاندان منتشر ہو گیا جس سے فکر خانہ داری ان کے سر پر آئی اور ان کی تعلیم ایک معمولی دیسی مکتب کے بعد ختم ہو گئی۔ ان کا فضل و کمال ان کی فطری ذکاوت و طباعی پر دلالت کرتا ہے۔ عروض سے بہت واقف نہ تھے چنانچہ خود بھی اعتراف کرتے ہیں ؎

نہ عروضی ہوں نہ ہوں واقفِ ارکانِ سخن
فاعلاتن نہ مجھے یاد نہ بابِ تفعیل

فن شعر میں مرزا تفتہ تلمیذ مرزا غالب اور منشی بال مکند بیصبر سے تلمذ تھا۔ مگر ان سے کلام پر زیادہ اصلاح لینے کا موقع نہ ملا۔ ان کے ایک بھائی منشی کرپا کشن لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ انھوں نے مذہب اسلام قبول کیا تھا۔ باوجود اختلاف

---

(۱) ماخوذ از "کلیات شعلہ" مرتبہ منشی کرشن گوپال درمابی۔ اے رئیس علی گڈھ

مذہب شعلہ کا رشتہ ان سے کافی مضبوط تھا۔ شعلہ اکثر ان کے باعث لکھنؤ گئے اور وہاں انیس و دبیر کی صحبتوں سے بھی فیضیاب ہوئے۔ اسی وجہ سے ان کی نظموں میں انیس و دبیر کے مراثی کے محاسن کی جھلک پائی جاتی ہے۔

شعلہ کی شادی اوائل عمر میں راجہ ہرنرائن سنگھ رئیس ہاپوڑ ضلع میرٹھ کی لڑکی کے ساتھ ہوئی۔ ۱۸۷۳ء میں وہ بندوبست علی گڈھ میں ملازم ہو گئے۔ چونکہ سرکاری ملازمت میں شاعری کے لئے دماغی فراغت حاصل نہیں ہوتی تھی اس لئے انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور علی گڈھ میں وکالت شروع کی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد علی گڈھ کے نامور وکلا میں شمار کئے جانے لگے۔

شعلہ کو فن شاعری میں ملکہ تامہ حاصل تھا اور کثیر التلامذہ تھے۔ علی گڈھ میں ایک بزم مشاعرہ ہر ماہ منعقد ہوتی تھی جس کے میر انجمن منشی چھوٹے لال قیس تھے۔ ان سے شعلہ کی معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔

شعلہ کو مے نوشی کی عادت تھی۔ بغیر شراب پیے کوئی نظم نہیں لکھتے تھے۔ جب وہ نظم لکھنے بیٹھتے تو شراب، پیالہ اور حقہ سامنے رکھتے تھے۔ مگر کبھی کسی شخص نے ان کو حالتِ نشہ میں نہیں دیکھا۔ شراب کی تعریف میں بہت سے اشعار لکھے ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں ؎

شرابِ ناب کا کب جیتے جی تک رنگ چھٹتا ہے ۔۔۔ یہ وہ دھبہ ہے جو شعلہ دھلے گا حوضِ کوثر میں

زاہدوں ہی کو مبارک رہے یہ فاقہ کشی ۔۔۔ ساقیا دیکھ نہ جائے ماہِ رمضاں خالی

ساقیا طرزِ تکلف در گستاخی معاف ۔۔۔ ایک سے ہوتا ہے کیا دو چار دے ساغر مجھے

شعلہ کو نظم نگاری میں کمال حاصل تھا۔ ان کی نظموں میں وہی زور و اثر ہوتا

ہے جو ہم انیس کے مراثی میں پاتے ہیں۔ ان کو اپنی پہلی بیوی کے ساتھ بےحد عشق تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک عاشق صادق کی طرح اپنی محبوبہ بیوی کا سراپا بعنوان "مرقع ناز سراپائے شوخ طناز" رقم فرمایا تھا۔ اس میں وہی زور و شور، اثر و تاثیر، دل کشی و رعنائی، فصاحت و بلاغت، شوخی و نزاکت، ادائے بیان و لطافت زبان اور جدت تشبیہہ و ندرت استعارہ موجود ہے جو انیس کے بہترین مرثیوں میں ہوتا ہے۔ چند متفرق بند ملاحظہ ہوں۔

اے فتنۂ قیامت برپا سنور کے اٹھ
اے شورِ حشر سر پہ مرے ہاتھ دھر کے اٹھ
اے شاہدِ خیال سراپا نکھر کے اٹھ
اے چشمِ شوق دامنِ نظارہ بھر کے اٹھ
گل چینو بیٹھے بیٹھے کے چن لو چمن کے پھول
بلبل کے منھ سے جھڑتے ہیں شاخِ سخن کے پھول

قامت ہے وہ کہ جس سے قیامت بنیں ہزار
لیتا ہے حشر جس کے قدم جھک کے بار بار
طوبائے خلد بھی دمِ گلگشت ہے نثار
پیادہ جلو میں سرو ہے شمشاد چوبدار
اس قد کی اس اٹھان پہ صدقہ اتار کے
قمری کو ذبح کیجئے سر پر سے وار کے

بالوں کے بیچ میں رہِ ظلمات مانگ ہے
یا شب میں کہکشاں کی کرامات مانگ ہے
کیوں مانگ کو دلوں کی یہ دن رات مانگ ہے
بن بن کے اور بگڑے ہے کیا بات مانگ ہے
افشاں بھرا جو مانگ میں پُر نور ہو گئی
دو ٹکڑے بیچ سے شبِ دیجور ہو گئی

کہتا ہے خامہ وصف ہوں چوٹی کے کیا رقم
مجھ سے نکل سکیں گے دکھاوے کے پیچ و خم

جوڑا گوندھا ہوا ہے کہ گھٹتا ہے میرا دم　　لپٹا ہوا ہے سانپ کا جوڑا مگر بہم

صورت بلا کی ہے تو نشانی ہے قہر کی

ظالم کی گانٹھ گانٹھ میں پڑیا ہے زہر کی

رخسارے ہیں کہ چاند کے ٹکڑے نقاب میں　　یا آفتاب حشر ہیں دو اک سحاب میں

دیکھے کسی چمن نے نہ یہ پھول خواب میں　　جلوے ہیں نورِ حق کے زلفِ آب تاب میں

بلبل کرے نظارہ تو گل سے بگاڑ ہو

موسیٰ جو دیکھے طور کا جانا پہاڑ ہو

آنکھیں وہ فتنہ زا ہیں غضب سحر سامری　　مستی ہیں چور چور نشہ میں بھری بھری

ابرو ہیں دونوں آنکھوں پہ شمشیر حیدری　　اک چال کی ہے تیز تو اک منھ کی کرکری

یا معرکہ میں بادۂ گلگوں پیئے ہوئے

دو مست لڑنے آئے ہیں خنجر لئے ہوئے

مژگاں نے کر دیا تہ و بالا جہان کو　　رخنے کئے ہیں دل میں تو بیندھا ہے جان کو

یا خاک میں ملایا ہے نشتر کی شان کو　　سرمہ نے اور تیز کیا آن بان کو

دنبالہ کب ہے آنکھ میں اس خوش جمال کے

پتہ ہے سبز گھاس کا منھ میں غزال کے

شانوں کی شان وہ کہ دکھائیں خدا کی شان　　بازو وہ گورے گورے نکل جائے جن پہ جان

نازک ہے وہ کلائی کہ ممکن نہیں بیان　　دکھنے لگے جو عاشقِ شیدا کو آئے دھیان

پنجہ ہے آفتاب تو ناخن ہلال ہے

دونوں ہیں ایک ہاتھ میں کیسا کمال ہے

ابھرے ہیں بحرِ حسن میں دو نور کے حباب | یا مست نے الٹ کے دھرے ساغرِ شراب
اٹھا سمٹ کے سارے بدن کا یہاں شباب | ایک ایک کا جواب ہے دونوں ہیں لاجواب

نازک بدن کو جالی کی محرم پسند ہے
سونے کی چڑیا چاندی کے پنجرے میں بند ہے

۱۸۷۶ء میں شعلہ کی اس پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس جانکاہ واقعہ پر انھوں نے ایک پُر درد نوحہ لکھا تھا۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں:۔

دنیا سے نوجوان یہ کون اٹھ گیا ہے آج | پیر فلک کھڑا ہوا سر پیٹتا ہے آج
پیک اجل بھی شاملِ اہلِ عزا ہے آج | میدان کربلا مری ماتم سرا ہے آج

اک نازنیں کی لاش پہ غم کا ہجوم ہے
محشر کا شورِ نالۂ پیہم کا دھوم ہے

اک نوجوان کے مرگ میں ماتم نشیں ہوں میں | ایسا ہوں اب جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں
پامالِ دردِ یاس و غم نازنیں ہوں میں | یا محوِ انتظارِ دمِ واپسیں ہوں میں

اے مرگ انتظار کہاں تک شتاب آ
اے موت انتشار کہاں تک شتاب آ

شعلہ کی ماں نے ضد کر کے دوسری شادی کرا دی۔ دوسری بیوی سے بھی وہ از حد محبت کرتے تھے۔ اس نے بھی ۱۸ سال کے بعد ۱۸۹۷ء میں داغ مفارقت دیا۔ اس بیوی کا بھی انھوں نے ایک جاں گداز نوحہ لکھا تھا۔ اس کے تین متفرق بند ملاحظہ ہوں:۔

دامانِ قیامت مرے ہاتھوں میں لپٹ جا | او چرخ ستم گر مرے نالوں سے الٹ جا

اے جان حزیں جسم سے آنکھوں میں سمٹ جا	اے عمر اگر باقی ہے کچھ بیچ سے کٹ جا

اک نزع کا فوٹو ہے جو سینہ میں دھرا ہے

کس کا دمِ آخر مری آنکھوں میں بھرا ہے

وہ حشر دو بالا وہ قیامت ہمہ تن ناز	وہ دلبر دلدار وہ دلسوز وہ دمساز

غم خوار وفادار وہ ہمدرد و ہمراز	میں عاشق دلریش تو وہ عاشقِ جانباز

معشوق تھے پر عشق کے کچھ ڈھنگ جدا تھے

میں ان پہ جو قربان تھا وہ مجھ پہ فدا تھے

بیتاب تھے کیا عشق و محبت کی ہوس میں	قابو میں اگر میں تھا تو وہ تھے مرے بس میں

اک دن نہ تفرقہ ہوا اٹھارہ برس میں	مدت سے یہ دو بلبلیں تھیں ایک قفس میں

آباد کیا گلشنِ فردوس کو کس نے

میرے لئے چھوڑا مرے افسوس کو کس نے

یہ طویل نوحہ رقت و درد سے بھرا ہے۔ اس اہلیہ ثانی کی یادگار میں شعلہ نے ایک مندر تعمیر کرایا جو شری گو پیشور ناتھ کے نام سے مشہور ہے۔

شعلہ کے سبھی بچوں نے بچپن ہی میں انتقال کیا۔ صرف ایک لڑکی زندہ تھی جو کرشن گوپال ورما باشندہ علی گڈھ کو منسوب تھی۔ اس شدید رنج کا اظہار شعلہ نے مثنوی "بزم برندابن" میں یوں کیا ہے:۔

الگ ہوں دور ہوں سب سے جدا ہوں	عجب بیکس ہوں بے برگ و نوا ہوں

نہ کوئی چھوڑ جانے کی نشانی	نہ کوئی یادگارِ زندگانی

۱۸۵۵ء میں علی گڈھ میں کائستھ سبھا قائم ہوئی۔ اس وقت سے شعلہ

برابر قومی کاموں میں شریک رہے۔ اس کے علاوہ وہ بھارت دھرم مہا منڈل کے سالانہ جلسوں میں نظمیں پڑھتے تھے۔ آخری زمانہ میں شعلہ کی طبیعت نے مذہبی رنگ اختیار کیا۔ ۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔ لاولدی ہمیشہ سوہانِ روح رہی۔ مسدس بندرابن میں کہا ہے ؎

نے قوت بازو نہ کوئی لختِ جگر ہے	غربت زدہ ایسا ہوں کہیں گھر ہے نہ در ہے

شعلہ کے زمانہ حیات ہی میں ان کے کلام کی خوب قدر ہوئی۔ ان کا دیوان "ارمغانِ شعلہ" ولایت بھیجا گیا۔ "بزم برندابن" بھی ہندوستان اور بیرون ممالک میں کثرت سے فروخت ہوئی۔

کلیاتِ شعلہ

کلیاتِ شعلہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعلہ کی شاعری کا بہت بڑا حصہ مذہبی شاعری ہے جس میں "بزم برندابن" اور "مسدس راماین" دو نہایت دل آویز نظمیں ہیں۔ اول بشکل مثنوی اور دوم بہ صنفِ مسدس تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد چند وہ زوردار نظمیں ہیں جو سناتن دھرم کی سبھاؤں کی تقریب میں لکھی گئی ہیں۔ نو قومی نظمیں ہیں جو اکثر کائستھ کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے موقع پر لکھی گئی ہیں۔ دو نوحے اور ایک سراپا ان کی دونوں بیویوں کے متعلق ہیں۔ چند نوحے بھی ہیں۔ چند نہایت پُر شکوہ اور زوردار قصیدے بھی ہیں۔ ان کی غزلوں کا دیوان ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ دو کتابیں موسومہ "ارمغانِ شعلہ" اور "کلیاتِ شعلہ" ان سے یادگار ہیں۔

ان کی نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعلہ کو اپنے مذہب سے سچا عشق تھا اور وہ کرشن جی کے بڑے بھگت تھے۔ ویدک دھرم پر بھی فدا تھے۔ کائستھ قوم کے بارہ بھائیوں میں رشتہ اتحاد و شفقت قائم کرنے و نیز سماجی اصلاح کے لئے انھوں نے اپنی قومی کے ذریعہ نعرے بلند کئے۔

شعلہ نے "برج رج" اور "بزم برندابن" نظموں میں کرشن جی کے پریم اور بھگتی کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار نہایت دلچسپ اور سحر آمیز طریقے سے کیا ہے۔

شعلہ کی نظمیں

شعلہ کی نظمیں لطافت زبان، ندرت بیان اور دل کش تشبیہات و نادر استعارات کے استعمال کی وجہ سے نہایت دل چسپ اور موثر ہوتی ہیں۔

برج رج یعنی خط برج کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:-

اٹھا ہے یہیں آ کے نقاب رخِ توحید — ہر وقت نظر آتا ہے یاں جلوہ جاوید
چھپتا نہیں ہے شام کو بھی برج کا خورشید — ایک ماہ میں یاں تین نکلتے ہیں مہ عید

آتی ہے ہنسی ذروں کو تاروں کی جھلک پر
یہ وہ ہے زمیں پانوں نہ رکھے جو فلک پر

وہ صاف زمیں ہے کہ جو میلی ہو نظر سے — جاروب کشی ہوتی ہے جبریل کے پر سے
ہر مندر مرصع دُر و یاقوت و گہر سے — خورشید مگس راں ہے شعاؤں کے چنور سے

وہ جھوم ہے یہ جس پہ فلک جھوم رہا ہے
نیلم کا ہے اک چھتر کہ جو گھوم رہا ہے

مسدس بتقریب جلسہ کائستھ کانفرنس بریلی کا ایک بند ملاحظہ ہو:-

دل ایک روح ایک بدن ایک جان ایک　　خوں ایک گوشت ایک رگ و استخوان ایک
ہر اک کا اک خیال اور ہر اک کا بیان ایک　　بائیس لاکھ منھ میں ہے گویا زبان ایک
بھائی کے بدلے دولت کونین خاک ہے
دنیا میں ساری قوتِ بازو کی دھاک ہے

قصائد

شعلہ نے تین شاندار قصیدے بھی کہے ہیں۔ ہر قصیدے میں تقریباً سو شعر ہوں گے۔ ایک قصیدہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

قوم کی تیزی رفتار ہے کتنی دیکھی　　جس طرح چلتی ہے دب دبکے کوئی نبض علیل
یاں وہ ہے نیند کہ محشر میں بھی اٹھنا کیا　　کان میں صور کو پھونکا ہی کرے اسرافیل

شاعرانہ تعلی

وہ سخنور ہوں سخن کی جو ستائش چاہوں　　چیر کر گور نکل آئے ابھی روحِ قتیل
میرے اشعار سے ہے بزم سخن کی رونق　　رونقِ حسن کمالات کو مجھ سے تکمیل
حافظہ میں مرے ہر سورۂ قرآں ازبر　　جائزے میں مرے توریت و زبور و انجیل
طبع عالی کو جو آتا ہے دمِ فکر عرق　　پنکھا جھلنے کے لئے ہلتے ہیں بالِ جبریل

راماین شعلہ

شعلہ کی راماین بھی اپنے طرز میں لاجواب ہے۔ ہر سین میں تلسی داس

کی رامائن کا پورا پورا نقشہ اتار کر رکھ دیا ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:-

ایما یہاں پہ ڈھونڈھے سے ملتا نہیں نشاں ہاں بھگت تلسی داس ہی کچھ کر گئے بیاں
رام اور لکھن کے ساتھ سیا جی تھیں یوں رواں جس طرح برمھ و جیو کے مایا ہو درمیاں

سو بھا یمان بیچ میں یوں جانکی بنی
جیسے ہو را ماندی تلک میں شتری بنی

یا تھی بہم وہاں مہ و خورشید کی ضیا یا بیچ عکس و حسن کے آئینہ کی صفا
یا رنگ و گل میں جیسے بسی بوئے پُرفضا یا دو لبوں میں جیسے تبسم ہو خوش نما

یوں ساتھ جانکی تھیں مہ و خور کے بیچ میں
جیسے ہو پریم بھگت اور ایشور کے بیچ میں

شعلہ کی مثنوی نگاری

اس کا ذکر دسویں باب میں کیا گیا ہے۔

شعلہ کی غزل گوئی

میں جبہ سا ہوں اس در عالی مقام کا کعبہ جہاں جواب نہ پائے سلام کا
اے شعلہ کہہ دو بلبل خلدِ بریں سے اب گلدستہ باندھ لے میرے رنگیں کلام کا
کثرت حجاب دیدہ عارف کبھی نہیں ذروں میں ایک مہر کا جلوہ عیاں رہا
میں وہ گناہگار ہوں پہونچا جو دیر میں رحمت لپٹ کے کہنے لگی تو کہاں رہا

(۱) منتخب از دیوان شعلہ موسوم بہ ارمغان شعلہ

اے شعلہ کیا طبیعت نازک پہ زور دوں
قدر سخن رہی نہ کوئی قدرداں رہا

پھینک دوں نوچ کے گل پھول سے رخسار کے
توڑ دو عقد ثریا کو تیرے ہاروں پر
تشنۂ شربت دیدار پہ کیوں تیز ہوئے
آگ برساتے ہو پانی کے طلبگاروں پر
مہوشوں کو مرے گھر سے ہے کچھ ایسی نفرت
چاندنی تک نہیں پڑتی میری دیواروں پر
اچھی صورت کی طرف شعلہ نہ دیکھا کیجے
آنکھیں کھو بیٹھو گے اک دن انھیں نظاروں پر

دیکھ دو ٹکڑے ہوا جاتا ہے ہالہ ماہ کا
ہاتھ یوں انگڑائی لے کر لے مہ کامل نہ چھوڑ
آگیا غش دیکھتے ہی دیکھتے زہرہ جبیں
مجھ سے یوں آنکھیں ملا کے جادوئے بابل نہ چھوڑ

ضبط فغاں سے آگئی ہونٹوں پہ جاں تلک
دیکھو گے میرے صبر کی طاقت کہاں تلک
ڈھونڈھو گے پھر بھی مشق ستم کے لئے مجھے
دشمن جفا سہے گا تمھاری کہاں تلک

کیوں بے پئے شراب کی خود رفتگی سی ہے
دل میں ہے کس کا جلوۂ مستانہ آج کل
قرباں ہوئے ہیں اک گل آتش مزاج پر
دل بن رہا ہے بلبل و پروانہ آج کل

ہزاروں کروٹیں بدلیں نہ آیا دل ہی قابو میں
خدا نے کوٹ کر بھر دی ہے بجلی کوئی پہلو میں
خیال خال و یاد کعبۂ ابرو میں جاں نکلی
مرے لاشہ پہ جھگڑا ہے مسلماں اور ہندو میں

کیا میرا بس ہے ضبط جو سوز جگر نہ ہو
او سرد مہر آگ مری بات پر نہ ہو
شعلہ بغیر عشق تو جینا محال ہے
کس کام کا جگر ہے جو درد جگر نہ ہو

کرکے پامال کہاں جاتا ہے جانے والے
او مری خاک کو دامن سے بچانے والے
کیا ہی ساماں ہیں اک عمر دو روزہ کے لئے
کچھ مرے جاتے ہیں جینے پہ زمانے والے

مریض عشق کو کیوں فکر ہو شفا کے لئے
یہ درد وہ ہے جو ملتا نہیں دوا کے لئے
کھسک کے کعبہ نہ آجائے آستاں کے قریب
سمٹ رہی ہے جبیں تیری جبہ سا کے لئے

اسی کو فکر ہماری بھی منعمو ہو گی | جو روز بھیجتا ہے کاسۂ گدا کے لئے
دل سے وحشت کی آرزو نہ گئی | زلف خود سر کی سر سے بو نہ گئی
اور حسرت بڑھی وصال کے بعد | مل کے بھی تیری جستجو نہ گئی
شکر کو شکوہ جفا سمجھے | کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے
اس تڑپنے کا مدعا سمجھے | دل بد خو تجھے خدا سمجھے
کر دئے اک جہان کے بت خود بیں | اے سکندر تجھے خدا سمجھے

جدت بیان و ندرت استعارہ ملاحظہ ہو

قد دلجو سرو ہے روئے منور آفتاب | آگیا ہے کیا سوا نیزے کے اوپر آفتاب
حسن روز افزوں سے ہے ہر ایک دلبر آفتاب | آسماں پر ایک ہے اور یاں ہیں گھر گھر آفتاب

رباعی

اے شعلہ نہ غم نہ شادمانی ہو گی | پیری ہو گی نہ نوجوانی ہو گی
کیا آج اور کے فسانے سنتا | کل تیری ہی زندگی کہانی ہو گی

خصوصیات کلام شعلہ

شعلہ جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کے ایک باکمال شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ ان کی نظمیں نہایت روح افزا اور دل کش ہوتی ہیں مگر زیادہ تر غزلیں لطافت اور تاثیر سے خالی ہیں۔ ان کی غزلیات کا دیوان

موسومہ "ارمغان شعلہ" ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ سارا کلام لفظی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ زبان نہایت فصیح اور سادہ وسلیس ہے۔ محاورات اور روزمرہ کا استعمال بھی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کلام میں روانی و ترنم بھی خوب ہے مگر ان سب کے ہوتے ہوئے بھی ان کی زیادہ غزلیں اور اشعار تاثیر، سوز وگداز اور شعریت سے محروم ہیں، مضامین اکثر سطحی اور لغویات سے مملو ہوتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے عام مذاق کے زیر اثر گل وبلبل، شمع و پروانہ، وصل وہجر، درد وغم، زلف وشانہ اور رقیب وعدو کا راگ ہر جگہ بغیر کسی جدت اور لطافت کے گایا ہے۔ پھر بھی کافی اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں مضمون آفرینی، بلند پروازی، نازک خیالی، جدت ادا اور تاثیر ولطافت پائی جاتی ہے۔

شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ اکثر اپنے عہد کی اجتماعی ذہنیت سے اثر پذیر ہو کر اپنی انفرادی ذہنیت کو کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ شعلہ کی شاعری پر بھی اس زمانہ کی لکھنوی شاعری کا بڑا اثر پڑا۔ وہ متعدد بار علی گڑھ سے لکھنؤ آئے اور یہاں اقامت گزیں ہو کر آتش وناسخ، انیس و دبیر کے کلام سے متاثر ہوئے جس سے ہم ان کی نظموں میں انیس کے مراثی کا درد واثر، صفائی و روانی اور فصاحت وبلاغت پاتے ہیں مگر ان کی غزلوں میں عموماً ناسخ کے رنگ کی جھلک دیکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں رعایت لفظی، کلام کی پختگی۔ الفاظ کی نشست، زبان کی شیرینی، بیان کی صفائی اور محاورہ و روزمرہ کا عمدہ استعمال وغیرہ کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہیں مگر معنوی حیثیت سے بہت کم اشعار دلچسپ اور پر اثر ملتے ہیں۔ شعلہ اگر ایک طرف لکھنوی شاعری سے اثر پذیر ہوئے تھے تو

دوسری طرف داغ دہلوی کی شاعری سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر غزلوں میں داغ کے کلام کی خوبو، شوخی وندرت، معاملہ گوئی اور صفائی وروانی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں تفلسف، تصوف، ذاتی محسوسات اور دنیاوی تجربات کی جھلک بہت کم ہے۔ پھر بھی بحیثیت مجموعی ان کے ایک قادر الکلام شاعر ہونے میں شبہ نہیں ہے۔

خصوصیات دورِ جدید (طبقہ اول)

شاہی درباروں سے الگ ہو جانے کا اس دور میں اردو شاعری پر ایک خوشگوار اثر پڑا۔ اب محبوبۂ شاعری کو خارجی بناؤ سنگار کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ وہ اپنا غیر فطری جامہ اتار کر صداقت کا سادہ لباس زیب بدن کر کے مجلس عام میں جلوہ گر ہوئی۔ لکھنؤ کی شاعری پر نوابان اودھ کے ذوق وشوق اور طرز زندگی کا جو برا اثر پڑا تھا وہ اب رفتہ رفتہ دور ہونے لگا۔ جس سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شعراء کا کلام خارجی محاسن سے مملو ہونے کے بجائے پاکیزہ جذباتی اور واقعاتی ہوتا گیا۔

رام بابو سکسینہ فرماتے ہیں[۱] "غزلوں میں بھی بہت بڑا انقلاب ہوا۔ اب پرانے فرسودہ مضامین، زلف وکاکل، کنگھی چوٹی، مسی کاجل وغیرہ معیوب سمجھے

---

[۱] تاریخ ادب اردو ص ۲۰۱

جانے لگے۔ اب جذبات انسانی اور کیفیات قلبیہ کا من وعن اظہار اور بے ثباتی دنیا کا نہایت پُر اثر الفاظ میں بیان کیا جانے لگا؛

اردو شعراء اب فضول مبالغہ، تناسب لفظی، دور از کار تشبیہات اور فرسودہ ورسمی روایات سے نفرت کرنے لگے۔ غزل میں اب وہ جذبات انسانی، واقعات زندگی اور بے ثباتی دنیا وغیرہ کے ساتھ فلسفہ وحقائق کا اظہار نہایت سادہ و بے تکلف طریقے سے کرنے لگے۔

مگر ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی بقول رام بابو سکسینہ اردو شاعری نے بحیثیت شاعری کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں[1] "اس زمانہ کے شعراء کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے۔ وہ قدما کے تتبع تھے۔ غزلیں، رباعیاں قصیدے اور قطعات اس زمانہ میں اکثر کہے گئے۔ امیر مینائی کا کلام ناسخ کے زمانہ کی اکثر بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ داغ کے یہاں طباعی، بے ساختگی اور روزمرہ بہت ہے مگر متانت اور بلندیٔ مضامین کم ہے۔ جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں مگر وہ عروض کے استاد تھے اور صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور قدما کے پیرو تھے۔"

---

[1] تاریخ ادب اردو ص ۲۹، ص ۳۰

ہندو شعراء کی ادبی خدمات

غزل گوئی

اس صنف میں متعدد ہندو شعراء نے شہرت حاصل کی مگر ان میں منشی بنواری لال شعلہ علی گڈھی، رائے جواہر سنگھ جوہر لکھنوی، منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی، منشی شیو پرشاد وہبی لکھنوی اور لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی کی خدمات بہت قابل قدر ہیں۔ ان شعراء کا کلام فضول مبالغہ، تناسب لفظی، پرانے فرسودہ مضامین اور رسمی روایات سے پاک ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں واقعات زندگی اور جذباتِ قلبیہ کے ساتھ بے ثباتیٔ دنیا اور فلسفہ وحقائق کا اظہار مدنظر رکھا ہے۔

مذہبی عنصر کی تکمیل

منشی بنواری لال شعلہ علی گڈھی، منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی، منشی گور سہائے بلتجی کاکوروی نے اس عہد میں اردو شاعری میں ہندوؤں کے مذہبی عنصر کی تکمیل کر کے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

شعلہ کی شاعری کا جزوِ کثیر مذہبی شاعری ہے جس میں مثنوی برج چھب اور مسدس رامائن دو نہایت موثر اور سحر آمیز نظمیں ہیں۔

اس دور میں منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی نے بھی شاعری کے میدان میں وہی راستہ اختیار کیا جو ان کے قبل منشی جگناتھ خوشتر لکھنوی اختیار کر چکے تھے۔ فرحت نے بھی ہندوؤں کی متعدد مذہبی کتابوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے اردو ادب میں مذہبی عنصر کی تکمیل کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔ ۱۸۶۶ء میں راماین منظوم کہہ کر شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ پریم ساگر منظوم، تیسو پران منظوم، گنیش پُران منظوم، رام پران منظوم، گوری منگل، پدم پران، شکت چالیسی، وشنو سہسر نام وغیرہ ان کی مذہبی تصانیف سے ہیں۔ فرحت نے شاعری میں استادی کا مرتبہ حاصل کیا، اور کثیر التلامذہ تھے۔

منشی گور سہائے ملتجی نے "سداماں چرتر" نام کی ایک شہرہ آفاق مثنوی لکھی۔ یہ کتاب وہ گلستانِ تصوف ہے جس کی ہر روش پہ اردو، فارسی اور بھاشا کے پھول کھلے ہیں۔

رزمیہ شاعری

اس عہد کے شاعر منشی طوطارام شایاں لکھنوی رزمیہ نظم لکھنے میں اچھا ملکہ رکھتے تھے۔ انھوں نے "مہابھارت اردو منظوم" تصنیف کر کے اردو ادب میں ایک زبردست رزمیہ نظم کا اضافہ کیا۔ "مہابھارت منظوم" ۳۰۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تقریباً دس ہزار اشعار ہیں۔ زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ روزمرہ ومحاورہ کا استعمال بہت خوب کیا ہے۔ اسکے علاوہ انھوں نے قصہ امیر حمزہ منظوم معروف بہ طلسم شایاں، الف لیلہ منظوم اور تاریخ طلسم

ہند وغیرہ تصنیف کی ہیں۔

تذکرہ نویسی

اس دور کے شاعر منشی دیبی پرشاد بشاش اجمیری کی گراں قدر ادبی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے ہندو شعراء کا سب سے قدیم تذکرہ موسومہ "تذکرہ آثار الشعرائے ہنود" لکھا جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے تقریباً پچاس کتابیں اور تصنیف و تالیف کیں۔

افسانہ نگاری

اسی دور میں پنڈت رتن ناتھ در سرشار نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "فسانۂ آزاد" تصنیف کی۔ اردو کا سب سے پہلا فسانہ یہی ہے جس پر ناول نگاری اور ڈرامہ نویسی کی بنیاد قائم ہوئی۔ سرشار اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے۔ اپنی جادو بیانی اور سحر نگاری کے باعث یہ دنیائے افسانہ نگاری میں آفتاب بن کر چمکے۔ جام سرشار، سیر کہسار اور کامنی وغیرہ ان کے دیگر افسانے بھی خوب ہیں۔

متفرق ادبی خدمات

منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی فن شاعری کے استاد اور صاحب تلامذہ تھے۔ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ انھوں نے متعدد مفید کتب مثلاً خلاصۃ المنطق، معیار البلاغت، معیار الاملا، نظم پروین، ارژنگ

چیں اور مراۃ العلوم وغیرہ تصنیف کرکے اردو ادب کی خدمت کی ہے۔

اسی دور میں دہلی کے منشی منسارام ناتواں اور ان کے فرزند درگا پرشاد نادر اور منشی کیول رام ہوشیار نے اپنی تصنیفات کثیرہ سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔ ناتواں نے ساٹھ ستر کتابیں فارسی، اردو اور ہندی نظم و نثر میں لکھیں جن میں دسم اسکند بھاگوت، سنگاسن بتیسی منظوم، بہارستان، نگارستان (گلستاں اور بوستاں کے جواب میں) اور دو سو غزلوں کا ایک دیوان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ منشی درگا پرشاد نادر نے تقریباً پچاس کتابیں تصنیف کیں جن میں سے دکن کے شاعروں کا تذکرہ "گلدستۂ نادر الافکار" شاعرات کے دو تذکرے موسوم بہ چمن انداز اور گلشن ناز، مطلع العروض، مطلع البلاغت اور نسب نامہ خاندان تیموریہ زیادہ مشہور ہیں۔ منشی کیول رام ہوشیار نے ہر علم و فن میں تقریباً اسی کتابیں تصنیف کیں جس سے ان کی علمی استعداد ثابت ہوتی ہے۔

دور جدید طبقہ اول کے باقی ماندہ ہندو شعرا کی فہرست

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۱	آشفتہ	امرناتھ ہالو دہلوی	۱۸۳۲ء - ۱۸۵۵ء - بہار گلشن کشمیر ملاحظہ ہو۔
۲	آشوب	رائے بہادر ماسٹر پیارے لال دہلوی	۱۸۳۸ء - ۱۹۱۰ء خمخانہ جاوید جلد اول ملاحظہ ہو۔
۳	خورم	گلاب رائے مجو دہلوی	بہار گلشن کشمیر ملاحظہ ہو۔
۴	شفق	دولت رام گلفروش دہلوی	بڑے خوش گو شاعر تھے۔ بہار سخن ملاحظہ ہو۔

کیفیت	نام	تخلص	نمبر شمار
شاگرد غالب - تذکرہ بہارِ سخن	لالہ پیارے دہلوی	ظہیر	۵
متعدد کتابوں کے مالک تھے۔ بہارِ گلشنِ کشمیر ملاحظہ ہو۔	پنڈت کنہیا لال دہلوی	عاشق	۶
تذکرہ بہارِ سخن ملاحظہ ہو۔	بنارسی داس دہلوی	غمگین	۷
فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ بہارِ گلشنِ کشمیر دیکھیے۔	پنڈت بھوانی شنکر دہلوی	مفتوں	۸
شاگرد غالب۔ کتاب تلامذہ غالب از مالک رام دیکھیے۔	پنڈت شیو رام جی دہلوی	مونس	۹
بہارِ گلشنِ کشمیر دیکھیے۔	پنڈت موہن لال کوپہ دہلوی	موہن	۱۰
مصنف تصانیف کثیرہ تھے۔ بہارِ سخن ملاحظہ ہو۔	نسا رام دہلوی	ناتواں	۱۱
تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف تھے۔ بہارِ سخن	درگا پرشاد دہلوی	نادر	۱۲
تقریباً اسّی کتابوں کے مصنف تھے۔ تلامذہ غالب بھی	کیول رام دہلوی	ہوشیار	۱۳
	شعرائے لکھنؤ		
بہارِ گلشنِ کشمیر جلد دوم ملاحظہ ہو۔	دیا شنکر کوچک	انور	۱۴
ایضاً	درگا پرشاد مشران	بیخود	۱۵
جلد چہارم الف لیلہ منظوم کے مصنف تھے۔ اردو اور فارسی کے استاد تھے۔	شادی لال	چمن	۱۶
تذکرہ بہارِ سخن دیکھیے۔	خوش وقت رائے	خوشوقت	۱۷

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۱۸	خیالی	خیالی رام سکینہ محلہ نوبستہ	۱۷۹۴ء - ۱۸۲۸ء - اچھے شاعر تھے - زمانہ جنوری ۱۹۲۶ء ملاحظہ ہو۔
۱۹	زار	دھنپت رائے	تذکرہ بہار سخن مرتبہ برق سیتاپوری ملاحظہ ہو۔
۲۰	سخن	رام دیال	اچھے شاعر تھے - بہار سخن دیکھئے۔
۲۱	سلیم	گوری شنکر	وفات ۱۸۵۹ء - شاگرد آتش لکھنوی - بہار سخن ملاحظہ ہو۔
۲۲	شایاں	طوطا رام	رزمیہ نظم لکھنے میں اچھا ملکہ رکھتے تھے۔ نادر شاعر تھے۔ متعدد کتب منظوم کئے ہیں۔ جن میں مہابھارت اردو منظوم مشہور رہے۔ بہار سخن۔
۲۳	شائق	فتح چند	شاگرد ناسخ۔ خوش فکر شاعر تھے - بہار سخن
۲۴	شفق	لالتا پرشاد	شاگرد فرحت۔ خوش فکر و تیز طبع شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں مشہور تھے۔ قصہ بہار دانش کو بہار شفق کے نام سے نظم کیا ہے۔ وفات ۱۹۰۰ء۔
۲۵	شگفتہ	خیراتی لال	۱۸۰۸ء - ۱۸۹۶ء - فن سخن کے استاد تھے۔ ان کا دیوان "دفتر شگرف" طبع ہو چکا ہے۔ بہار سخن۔

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۲۶	عنایت	کنور عنایت سنگھ	ان کا دیوان ۱۸۹۹ء میں طبع ہوا۔ بڑے خوش گو شاعر تھے۔ بہار سخن۔
۲۷	فرحت	شنکر دیال	فن سخن کے استاد اور کثیر التلامذہ تھے۔ ہندوؤں کے مذہبی کتب کا ترجمہ کیا جن میں رامائن منظوم بہت مشہور رہے۔ مفصل حالات دسویں باب میں ملاحظہ ہوں۔
۲۸	عاصی	مہادیو پرشاد	خوش گو شاعر تھے۔ بہار سخن ملاحظہ ہو۔
۲۹	فضا	گوبند پرشاد	شاگرد مینڈو لال زار۔ اچھے شاعر تھے۔ بہار سخن۔
۳۰	فگار	دیاشنکر نکو	شاگرد آتش۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بہار گلشن کشمیر
۳۱	مقبول	جے سکھ رائے	شاگرد زار۔ صاحب دیوان تھے۔ بہار سخن
۳۲	بخشی	نوندرائے	وفات ۱۸۸۵ء۔ شاگرد زار کئی کتابوں کے مصنف تھے۔
۳۳	یاس	سری کرشن کول	نسیم لکھنوی کے خانہ دار بھائی تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ بہار گلشن کشمیر ملاحظہ ہو۔
		شعرائے دیگر مقامات	
۳۴	اوج	گنگا پرشاد بریلوی	جگر بریلوی کے نانا تھے۔ شاگرد آتش لکھنوی اچھے شاعر تھے۔ یاد رفتگاں ملاحظہ ہو۔

کیفیت	نام	تخلص	نمبر شمار
شاگرد امیر مینائی۔ صاحب تلامذہ تھے۔ ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ آپ کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو۔ شرمندۂ گناہ کا اعزاز دیکھئے آغوش میں لئے ہوئے رحمت خدا کی ہے	حکیم مکھن لال بریلوی	شوق	۳۵
۱۸۴۶ء-۱۹۱۲ء اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی میں شاعری کرتے تھے۔ متعدد کتب کے مصنف تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ بہار سخن	دیوان کرشن گوپال۔ وزیر آباد۔ پنجاب	شیدا	۳۶
رئیس اعظم عظیم آباد پٹنہ۔ اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بہار سخن۔	کنور سکھراج بہادر عظیم آبادی	رحمتی	۳۷
بہار سخن دیکھئے۔	درگا پرشاد گیاوی	ستم	۳۸
سررشتہ دار افواج نظام حیدر آباد دکن بہار سخن۔	راجہ شری پرشاد حیدر آبادی	احقر	۳۹
بہار سخن۔	دوارکا پرشاد حیدر آبادی	ذکار	۴۰
ایضاً	راجہ چھنو لال حیدر آبادی	زیب	۴۱
وفات ۱۹۰۹ء۔ صاحب دیوان تھے۔ بہار سخن۔	رائے ٹھاکر پرشاد حیدر آبادی	نظم	۴۲
اچھے شاعر تھے۔ بہار سخن۔	لالہ بہاری لال فرخ آبادی	آفریں	۴۳
علم و فضل میں کمال حاصل تھا۔ مذہبی کتب کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔	منشی اندرمن مراد آبادی	ـــ	۴۴

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۴۵	اہل	جانکی بی بی۔ الہ آبادی	خوش فکر شاعرہ تھیں۔ تذکرہ ہندو شعرا مؤلفہ بشاش دیکھیے۔
۴۶	بیتاب	کشن نراین بنارسی	وفات ۱۸۸۵ء۔ مہاراجہ نیپال مقیم بنارس کے مختار تھے۔ خوش فکر شاعر تھے۔ بہار سخن۔
۴۷	ثاقب	مہاراجہ گوپال سنگھ سندیلوی	رئیس اعظم سندیلہ ضلع ہردوئی۔ واجد علی شاہ کے مصاحب خاص تھے۔ ۱۸۹۰ء میں وفات پائی۔ بہار سخن۔
۴۸	حسن	جگن کشور فیروز آبادی	۱۸۶۴ء۔۱۸۹۸ء۔ آگرہ میں وکالت کرتے تھے۔ بڑے خوشگو شاعر تھے۔ اچھے نظم نگار بھی تھے مگر گمنام ہوئے ہیں۔
۴۹	خادم	پنڈت ہردے نراین بھان اکبر آبادی	خوشگو شاعر تھے۔ بہار گلشن کشمیر۔
۵۰	راجہ	مہاراجہ سر دگبجے سنگھ والئ ریاست بلرام پور	شاگرد رائے جواہر سنگھ جوہر لکھنوی۔ علم و فن کے قدر دان تھے۔ خوشگو اور صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں۔
۵۱	راحت	بھگونت رائے کاکوروی	وفات ۱۸۴۵ء۔ پرگو شاعر تھے۔ مثنوی نگار تھے۔
۵۲	راضی	دیوان جانی بہاری لال اکبر آبادی	تلامذہ غالب۔ از میلارام ص ۱۱۰ ملاحظہ ہو۔

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۵۳	ربط	دیبی پرشاد مرادآبادی	اچھے شاعر تھے بہارِ سخن۔
۵۴	سیماب	بنسی دھر سکندر آبادی	بہارِ سخن۔
۵۵	شریف	منشی دنانک پرشاد بنارسی	بہارِ سخن ملاحظہ ہو۔
۵۶	صابر	پنڈت بشمبھر ناتھ سپرو فیض آبادی	پنڈت تربھون ناتھ ہجر کے والد تھے۔ بہار گلشنِ کشمیر۔
۵۷	ضبط	کنھیالال مرادآبادی	خوش فکر شاعر تھے۔ بہارِ سخن۔
۵۸	طپش	ادماں شنکر فرخ آبادی	وفات ۱۹۰۸ء۔ اچھے شاعر تھے۔ بہارِ سخن
۵۹	گوہر	موتی لال ککو۔ بدایونی	اچھے شاعر تھے۔ بہارِ گلشنِ کشمیر۔
۶۰	گوہر	منشی گیندن لال بدایونی	کلکٹری بدایوں میں سررشتہ دار تھے۔ نامور شاعر تھے۔ وفات ۱۹۱۰ء۔ بہارِ سخن۔
۶۱	ماہر	پنڈت رتن لال مجو شاہجہاں آبادی	بہارِ گلشنِ کشمیر ملاحظہ ہو۔
۶۲	مضطر	کنھیالال ہاکسر گوالیاری	پُرگو شاعر تھے۔ بہارِ گلشنِ کشمیر۔
۶۳	مفتوں	لچھمی نراین مشران رئیس فرخ آباد	خوش گو شاعر تھے۔ ایضاً
۶۴	ملتجی	گورسہائے کاکوروی	مثنوی سدا ماچرتر کے مشہور مصنف ہیں۔ دسواں باب ملاحظہ ہو۔
۶۵	منتظر	دیوان شیو ناتھ کول	۱۸۳۰ء - ۱۹۰۰ء - ریاست جموں و کشمیر

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
			میں مختلف عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور تھے۔ اردو وفارسی میں شعر کہتے تھے۔ بہار گلشن کشمیر۔
۶۶	نشاط	ہرگو بند سہائے اکبر آبادی	غالب کے محبان میں تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ دیوان نشاط ۱۸۷۶ء میں مطبع نولکشور سے طبع ہوا۔
۶۷	وصل	بھگوان پرشاد مرزا پوری	مرزا پور میں وکیل تھے۔ ۱۸۵۰ء-۱۹۱۲ء بہار سخن۔
۶۸	وقار	راجہ کشن کمار مراد آبادی	بڑے مشاق اور رنگین طبع شاعر تھے۔ دیوان وقار طبع ہو چکا ہے۔ تذکرہ شعرائے ہنود مؤلفہ بشاش ملاحظہ ہو۔
۶۹	ہجر	پنڈت تربھون ناتھ سپرو فیض آبادی	۱۸۵۳ء-۱۸۹۷ء۔ خوشگو شاعر تھے۔ مضامین چکبست ص۱۹-۲۲۵ ملاحظہ ہو

نواں باب

دورِ جدید (طبقہ دوم)

نظم نگاری کا دور

تقریباً ۱۸۹۰ء سے ۱۹۳۰ء تک

سیاسی انقلاب کا اثر

انقلاب زمانہ کا اثر جس طرح ہر شے پر پڑتا ہے اسی طرح کسی زبان کا ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، کیونکہ ہر قوم کا ادب اس کی طرز معاشرت کا آئینہ ہوتا ہے۔ ہر زمانہ میں کسی قوم کی سماجی ثقافتی اور قومی زندگی کا اثر لا محالہ اس کے ادب پر پڑتا ہے۔ دہلی کی تباہی، الحاق صوبہ اودھ اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہنگاموں کا بہت بڑا اثر یہاں کے لوگوں کی طرز معاشرت اور زندگی پر پڑا۔ اب عیش و عشرت کی محفلیں درہم برہم ہو گئیں۔ لوگ خواب غفلت سے چونک کر عملی دنیا میں مشغول ہو گئے۔ اردو نظم ان انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی کے آغاز میں قومی رہنمایان اور سیاسی لیڈران کی تحریک آزادی اور حب وطن کا بھی اردو شعرا ر

پر انقلابی اثر پڑا۔ انھوں نے اب ایسی نظمیں لکھنا شروع کیں جن میں حب وطن اور قوم کی اصلاح و ترقی کا جوش کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

انگریزی تعلیم کا اثر

انگریزی تعلیم اور انگریزی ادب کی واقفیت نے اردو نظم و نثر کی اصلاح اور ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ انگریزی ادب اپنی نیچرل، سماجی، قومی، سیاسی اور تاریخی نظموں و نیز ڈراموں اور ناولوں کے بیش بہا خزانہ کے لئے عالم گیر شہرت رکھتا ہے۔ انگریزی تعلیم کا اردو ادب پر وہی انقلابی اثر پڑا جو انقلاب فرانس اور رومینٹک تحریک کا اٹھارہویں صدی کے آخر میں انگریزی ادب پر پڑا۔

جب اردو شعراء (خصوصاً آزاد اور حالی وغیرہ) نے یہ معلوم کیا کہ کس طرح انگلینڈ کے شعراء اپنی نظموں سے جو اُن کی سماجی اور قومی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے، اپنے وطن والوں کے دل میں حب وطن آزادی اور ترقی و اصلاح کا جوش پیدا کر دیتے ہیں تو انھوں نے بھی اپنی نا امید اور مصیبت زدہ قوم کی حوصلہ افزائی اور ترقی و اصلاح کے لئے اپنے شبدیز شاعری کا باگ سماجی، قومی، وطنی اور نیچرل نظم نگاری کی طرف موڑا۔ انھوں نے بھی اپنی نظم کو حب وطن اور قومی اصلاح کا محرک بنایا۔ ہندوستان کی گذشتہ عظمت کی یاد تازہ کر کے اور اس کی موجودہ زار و خستہ حالت پر افسوس ظاہر کر کے انھوں نے قوم کو غیرت دلائی اور اسے ترقی و اصلاح کے لئے کمر بستہ کیا۔

مولانا آزاد (۱۸۳۲ء-۱۹۱۰ء) کی خدمات

جدید اردو شاعری کے بانی اور نظم نگاری کے محرک مولانا آزاد تھے۔ اُردو ادب پر ان کے احسانات بےحد ہیں۔ انھوں نے مئی ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ایک ادبی انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے قائم کی۔ کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب اس انجمن کے سرپرست تھے۔ اس انجمن کے مشاعروں میں غزل کے لئے کوئی طرح دینے کے بجائے کسی نظم کا عنوان یا موضوع دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی انجمن کے مشاعروں میں پڑھنے کے لیے آزاد نے مثنوی شب قدر، مثنوی حب وطن، مثنوی ابر کرم، صبح امید اور گنج قناعت وغیرہ نظمیں لکھیں اور اس طرح نظم نگاری کو فروغ دیا۔

مولانا حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) کی خدمات

آزاد کے ساتھ حالی کو بھی اردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا چاہیے۔ حالی جب لاہور میں گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم تھے۔ ان کو سررشتہ تعلیم کی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تصحیح کا کام سپرد ہوا تھا۔ چونکہ اس کام میں انھیں انگریزی ادب سے بھی واقفیت حاصل ہوگئی اس لئے ان کی طبیعت پر مغربی خیالات کا کافی اثر پڑا۔ جس سے اردو شاعری کی پستی کا احساس اور اس کی اصلاح و ترقی کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوا۔

حالی اگرچہ انجمنِ پنجاب کے بانیوں میں نہ تھے مگر انھوں نے اس کی مجلسوں

کی شرکت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ انھوں نے اس انجمن کے مشاعروں میں پڑھنے کے لئے برکھات، نشاط امید، مناظرہ رحم وانصاف اور حب وطن وغیرہ نظمیں لکھی تھیں جو بہت مقبول ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ ان کی مشہور نظمیں چپ کی داد، مناجات بیوہ، شکوۂ ہند، مدوجزر اسلام معروف بہ مسدس حالی وغیرہ ہیں۔

حالی کا مرتبہ بھی اردو شاعری میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ سب سے پہلے ان ہی نے جدید رنگ کی غزلیں کہیں اور نظم نگاری میں مسدس کی اہمیت ثابت کی۔ انھوں نے طرز قدیم پر جس میں تکلف وتصنع اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں ضرب کاری لگائی۔[1]

اسمٰعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء-۱۹۱۷ء) کی خدمات

یہ شاعر اور نثار دونوں تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ اردو ریڈریں ہیں جو انھوں نے طلبار کے لئے لکھی تھیں۔ انھوں نے بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نہایت دلچسپ نظمیں بھی لکھیں۔ اور سیاسی، اخلاقی، سماجی اور نیچرل وغیرہ ہر قسم کی نظمیں کہیں جو بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔[2]

سرور جہان آبادی (۱۸۷۳ء-۱۹۱۰ء) کی خدمات

منشی درگا سہائے سرور کو بھی اردو شاعری کے طرز جدید کا ایک رکن رکین

---

[1]، [2] تاریخ ادب اردو - رام بابو سکسینہ ص۱۷۱، ص۲۲۵

سمجھنا چاہیے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جنھوں نے رنگ جدید کی طرف سب سے پہلے رہنمائی کی۔[1]

اس نئے ماحول کے زیر اثر آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، نظم طباطبائی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال وغیرہ ایسے عظیم المرتبت مسلم شعراء کے دوش بدوش ہندو طبقہ سے منشی درگا سہائے سرور، منشی سورج نرائن مہر، پنڈت برج نرائن چکبست، چودھری جگت موہن لال رواں اور بابو مہاراج بہادر برق وغیرہ وہ باکمال شعراء اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے اپنی قومی، سماجی، مذہبی، اخلاقی اور نیچرل نظموں کے ذریعہ اردو ادب میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور لوگوں کے قلب مردہ میں ایک تازہ روح پھونکی۔

اس دور میں بجائے غزل کے نظم نگاری کو فروغ ہوا۔ اگلے صفحات پر اس دور کے ۶ ممتاز ہندو نظم نگار شعراء کی ادبی خدمات پیش کی جا رہی ہیں۔

---

[1] تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ ص ۴۲۵

دورِ جدید طبقہ دوم کے ممتاز ہندو شعراء

۱۔ سورج نراین مہر دہلوی

سورج نراین مہر منشی کانجی مل کایستھ ماتھر کے فرزند اور محلہ روشن پورہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ماہرِ ویدانت فاضل اجل اور شاعر باکمال تھے۔ فارسی، سنسکرت، انگریزی اور اردو میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی تمام عمر علمی مشاغل، ادبی خدمات اور تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ بسلسلۂ ملازمت ان کا تعلق سررشتۂ تعلیم پنجاب سے تھا اور انسپکٹر مدارس کے عہدہ جلیلہ پر ممتاز تھے۔ ٹکسٹ بک کمیٹی صوبہ پنجاب کے ممبر تھے۔ اسکول کے طلبا کی ریڈروں کے لئے بچوں کی متعدد نظمیں لکھیں جو نہایت مقبول ہوئیں۔ انھوں نے سنسکرت زبان کی قدیم کتابوں کا نظم و نثر اردو میں ترجمہ کیا۔ جن میں چہل درویش، کھٹ درشن، یوگ درشن، علمی ویدانت، آئینہ بیراگ اور روحانی کہانیاں وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ رسالہ سادھو بھی برسوں ان کے زیر ادارت نکلتا رہا۔ مہر نے ویدانت کے پیچیدہ مسائل اور دقیق نکات کو نہایت سبق آموز طریقے پر اردو نظم و نثر میں بیان کئے ہیں اور ایسا موثر اور عام فہم پیرایۂ بیان اختیار کیا کہ اس سے

عام وخاص کو بہت روحانی فائدہ حاصل ہوا۔

پچیس سال تک ملازمت کرنے کے بعد مہر نے پنشن لی اور گوشہ نشینی اختیار کی۔ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ دو دیوان موسوم بہ کلام مہر جلد اول وجلد ثانی یادگار چھوڑا۔ سنہ ١٩٣٠ء میں بمقام لاہور انتقال فرمایا۔ ان کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو سکی۔ مگر اندازاً ١٨٦٣ء ہے۔

آپ کا مجموعہ نظم موسوم بہ کلام مہر لمبی تختی کے ٤٣٢ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں قصائد، غزلیات، ترکیب بند، مخمسات، مسدسات، مسبعات، مثمنات، مثنویات، قطعات، رباعیات، عارفانہ، صوفیانہ اور اخلاقی نظمیں، بچوں کی نظمیں اور انگریزی نظموں کے بھی منظوم ترجمے وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔

مہر غزلیں بہت کم کہتے تھے اس لئے غزلیات کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے۔ کلام مہر میں بھی غزلیں صفحہ ٦١ سے صفحہ ٩٦ تک درج ہیں جن میں کل تقریباً پچاس غزلیں شامل ہیں۔ مہر کی ایک دوسری قابل قدر تصنیف رامائن مہر ہے جس میں انھوں نے رامائن کو نظم کیا ہے۔ یہ کتاب ٢٦٠ صفحات پر مشتمل ہے۔

انتخاب کلام مہر دہلوی

حقائق ومعارف

مہر کی حقانی وعارفانہ نظموں میں توحید واجب الوجود، آرزوئے دیدار، تو ہی تو ہے، مجذوب کی بڑ، ہمہ اوست اور حمد الٰہی وغیرہ نہایت روح پرور نظمیں ہیں۔ توحید واجب الوجود ١٢٥ اشعار کا ایک قصیدہ ہے جو ذاتِ مطلق

کی توحید میں لکھا گیا ہے۔ یہ دلکش روحانی نظم مسائل تصوف سے لبریز ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جس طرح شاہی محل میں کاخ عالی شان ہو
اس میں ہو آئینہ خانہ روح پرور دل فزا

سقف پر اور سطح پر دیوار و در پر ہر طرف
راس و چپ پائیں و بالا ہو زا شیشہ جڑا

واں ہو مصروف خود آرائی کوئی زیبا نگار
جس طرف دیکھے نہ دیکھے دوسرا اپنے سوا

آئینہ خانہ ہے عالم تو ہے وہ زیبا نگار
تو ہی تو ہے ہر طرف کوئی نہیں ہے دوسرا

یا کہ جیسے برف خانے کا ہو میدانِ وسیع
صحنکیں اس میں رکھی ہوں انمیں ہو پانی بھرا

پرتو مہرِ منور جلوہ افگن ہو وہاں
ایک سورج کی جگہ ہوں لاکھ سورج رونما

تو ہے وہ مہر منور اور یہ عالم ہے آب
ہر طرف جلوہ ترا ہے ہر طرف جلوہ ترا

آرزوئے دیدار کے عنوان سے مہر نے جو حقائق نظم لکھی ہے وہ لطافت تغزل سے سرشار اور نہایت موثر ہے۔

حجاب کیوں مجھ سے اتنا ظالم ستم ہے تیرا خیال کیا ہے
ہوا نہ عاشق جب اس کا عالم تو حسن کیا ہے جمال کیا ہے

کرے کہاں تک کوئی صبوری سہے کہاں تک کوئی غیوری
کبھی ہمیں بھی تو ہو حضوری حضور ہم سے ملال کیا ہے

ترے تصور کو آفریں ہے کہ میرا ہر وقت ہم نشیں ہے
خیال یہ بھی مجھے نہیں ہے کہ روز و شب ماہ و سال کیا ہے

مجھے ترا ذکر ورد لب ہے نہ چین دل میں نہ خواب شب ہے
تجھے بھی کچھ رنج اور تعب ہے کہ میرے شیدا کا حال کیا ہے

گیا میں تیرے لئے جہاں سے جہاں ہے کیا چیز بلکہ جاں سے
نہ پوچھا تو نے مگر زباں سے کہ مجھ سے تیرا سوال کیا ہے
کبھی نہ رخ سے نقاب اوٹھایا کبھی نہ منھ سے سخن سنایا
کریں گے کیا یاد ہم خدایا کہ دید کیا ہے مقال کیا ہے

مہر کی نظم تو ہی تو ہے میں پندرہ بند بشکل مخمس لکھے گئے ہیں۔ اس روح پرور اور نہایت دلکش نظم میں مسئلہ وحدت وجود کو یعنی ہر شے میں خدا کا جلوہ موجود ہے۔ شاعر نے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہر اک گل میں بُو ہو کے تو ہی بسا ہے — صدا ہائے بلبل میں تیری نوا ہے
چمن فیض قدرت سے تیرے ہرا ہے — بہار گلستاں میں جلوہ ترا ہے
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

گھٹا تو ہی اوٹھتا ہے گھنگھور ہو کر — چھپا تو ہی ہے بحر میں شور ہو کر
نہاں تو ہی طوفان میں زور ہو کر — عیاں تو ہی موجوں میں جھکجھور ہو کر
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

مہ و خور میں تیری ضیا ہے درخشاں — ستاروں میں تیری جھلک ہے نمایاں
حرارت سے تیری ہے آتش فروزاں — ترے نور سے ذرہ ذرہ ہے تاباں
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

معرفت کا انتہائی درجہ وہ ہے جب عارف اپنی ذات کو محبوب حقیقی سے واصل سمجھ کر اپنے کو ذات معبود محسوس کرتا ہے جیسے کہ شری کرشن بھگوان، منصور حلاج اور شمس تبریز نے کیا ہے۔ اسی منزل پر پہنچنے کے لئے تمام مدارج

سابقہ زینے ہیں۔ حضرت قہر بھی بہت بڑے صوفی تھے۔ چنانچہ عرفان کے اسی جذبے کے تحت انھوں نے اپنی نظم "مجذوب کی بڑ" لکھی تھی۔ اس روحانی نظم میں تیرہ بند پر مشتمل مخمس ہیں۔ محض دو بند ملاحظہ ہوں ؎

جو کہے یہ تو خدا سے ہے جدا | یوں سمجھ وہ بک رہا ہے بیہدہ
یا اولی الابصار یا اہل ہدیٰ | ہے نگین دل پہ میرے تو کھدا
من خدایم من خدایم من خدا

میں تعین سے نہایت دور ہوں | نور ہوں میں نور ہوں میں نور ہوں
آپ موسیٰ آپ کوہ طور ہوں | خود انا الحق اور خود منصور ہوں
من خدایم من خدایم من خدا

نظم "ہمہ اوست" سترہ بندوں کی ایک عمدہ مسدس ہے۔ اس نظم میں بھی قہر نے فلسفہ وحدت وجود پر روشنی ڈالی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں ؎

ضیا مہر درخشاں ہے تیرا نور مجھے | صفائے ماہ رخ یار کا ظہور مجھے
ہر اک ستارۂ روشن ہے چشم حور مجھے | ہر اک ذرۂ تاباں ہے کوہ طور مجھے
بس ایک برق تجلی جھلک دکھاتی ہے
جہاں جہاں کہ جہاں میں نگاہ جاتی ہے

ترا ہی شور ہے بادل میں رعد ہو کے عیاں | ترا ہی زور ہے طوفان و باد میں پنہاں
جھڑی ہے تیری ہی رحمت کی بارش و باراں | چمک میں برق کی تیرا ہی نور ہے تاباں
صدائے رعد کہ برق جہاں کی چشمک ہے
نگاہ حق سے تری جلوہ گاہ بے شک ہے

"حمد الٰہی" بھی ایک نہایت روح پرور نظم بشکل مسدس ہے اس میں بارہ بند ہیں۔ دو بند ملاحظہ ہوں ؎

برسات کا ہے موسم جگنو چمک رہے ہیں
تاروں کے آسماں پر ہیرے دمک رہے ہیں
کلیاں چٹک رہی ہیں گلشن مہک رہے ہیں
کوئل کی ہیں صدائیں بلبل چہک رہے ہیں
سب میں ہے نور تیرا سب میں ضیا ہے تیری
سب کی زباں پہ یارب حمد و ثنا ہے تیری

تو نے زمیں بنائی تو نے زماں بنایا
خود لامکاں ہو کر تو نے مکاں بنایا
تو نے ہی چاند سورج اور آسماں بنایا
ان پر ہی حصر کیا ہے سارا جہاں بنایا
سب میں ہے نور تیرا سب میں ضیا ہے تیری
سب کی زباں پہ یارب حمد و ثنا ہے تیری

پند و اخلاق

حقایق و معارف کے بعد قہر کی بیشتر نظموں کا موضوع پند و اخلاق ہے۔ اس قسم کی نظموں میں بہترین نظمیں فکر فردا، زن کامل، مرد کامل، سپاس نعمت، تنبیہہ مدہوشاں، محب خلق و محب خدا، سطح پرستی، صحبت نیکاں، نیرنگی خیال، تین دوست اور تدبیر و تقدیر وغیرہ ہیں۔

قہر کی نظم "تنبیہہ مدہوشاں" بیس بندوں کی ایک ترکیب بند ہے اور ہر ایک بند میں تقریباً بارہ بارہ شعر ہیں۔ اس نظم میں انسان کی غفلت اور دنیا پرستی کو دور کرنے کے لئے ایک بہترین نصیحت کی گئی ہے۔ ایک بند کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مآل کار کو سوچا ہے تو نے اے بشر کچھ بھی ‎ ‎ ‎ تجھے دنیا و ما فیہا کی ہے غافل خبر کچھ بھی
گھٹاتا عمر کو ہے ہر نفس جو آتا جاتا ہے ‎ ‎ ‎ سمجھ اس رمز کو بہرہ خرد سے ہے اگر کچھ بھی
کہاں بڑھتی ہے تیری عمر الٹی روز گھٹتی ہے ‎ ‎ ‎ رکھ اس نکتے کو نظروں میں جو رکھتا ہے نظر کچھ بھی
نہیں ہے وقت جیسی بیش قیمت چیز دنیا میں ‎ ‎ ‎ نہیں ہے قدر اس کی تجھ کو اے غافل مگر کچھ بھی
وہ ہوتے ہیں پشیماں جو اسے برباد کرتے ہیں ‎ ‎ ‎ نہ بھول اس کو جو رکھتا ہے سر نفع و ضرر کچھ بھی
جہاں گزرا ہے اور جو چیز ہے اس میں وہ گزرا ہے ‎ ‎ ‎ کیا اس فکر نے لیکن نہ تیرے دل میں گھر کچھ بھی
جہاں کی بے ثباتی تجربے میں روز آتی ہے ‎ ‎ ‎ مگر ہوتا نہیں تیری طبیعت پر اثر کچھ بھی

تمہر نے قومی اور وطنی نظمیں کم لکھی ہیں۔ ایسی نظموں میں دربار مہارانی لکشمی تقریباً دو سو اشعار کی ایک طولانی نظم ہے۔ اس نظم میں اہل ہند کو ہندوستان کی گذشتہ عظمت کی یاد دلا کر انھیں ترقی کے راستہ پر گامزن ہونے کی تمہر تلقین کرتے ہیں۔ ایک بند کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

علم تھا بحر تو اس بحر کے گوہر تھے تم ‎ ‎ ‎ فن جو دریا تھا تو دریا کے شناور تھے تم
صنعتیں دیکھ کے کرتا تھا زمانہ عش عش ‎ ‎ ‎ کیسے صناع تھے تم کیسے ہنرور تھے تم
روم و یونان میں جاتے تھے تمھارے کپڑے ‎ ‎ ‎ چار اطراف کے صناعوں سے بہتر تھے تم
دہر میں سنگتراشی میں تھے تم ضرب مثل ‎ ‎ ‎ دھات کے کام میں سب قوموں سے برتر تھے تم
چار اطراف میں تھے شہر تمھارے مشہور ‎ ‎ ‎ دولت و مال میں سب قوموں کے افسر تھے تم
تھی تجارت جو تمھاری تو تمھاری حرفت ‎ ‎ ‎ صاحب مال تھے تم صاحب جوہر تھے تم
تم سے سیکھا ہے ہر اک قوم نے فن اور ہنر ‎ ‎ ‎ جگت استاد کوئی تھا تو مقرر تھے تم

"حب وطن" کے نام سے تمہر نے ایک اچھی نظم لکھی ہے جس میں آٹھ بند

ہیں۔ اس کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

ہے ہم کو جان و دل سے اپنا وطن پیارا اچھا وہ دن ہے اسکی خدمت میں جو گذارا
کہتے ہیں ہم وطن کو آنکھوں کا اپنی تارا وہ جان ہے ہماری ایمان ہے ہمارا

اے تہر یہ سخن ہے دنیا میں سب نے مانا
اپنے وطن سے بہتر کوئی نہیں ٹھکانا

تہر کی ادبی نظموں میں کنج تنہائی کے مزے، خوف مرگ اور صریر قلم دلچسپ نظمیں ہیں۔ اور ان کی مثنویوں میں بیراگ، بازار طلسم، سیر سراب، ظہور ذات پاک، تازیانہ ہوس وغیرہ بہترین اخلاقی اور حقانی نظمیں ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

تصوف و معرفت

زبان خامہ پر مضمون ہے توحید یزداں کا ہمارا مطلع دیواں ہے مطلع نور عرفاں کا
خلوص طبع پیدا کر کہ یہ ہے جز و ایماں کا نہ ایماں گبر کا حصہ نہ ورثہ ہے مسلماں کا
نتیجہ غافلو یہ ہے تمھارے سہو و نسیاں کا کہ نوری ہو کے پہنا جامۂ خاکی ہے انساں کا
فلک جس طرح تر ہوتا نہیں ابر بہاراں سے دل صافی پہ آسکتا نہیں ہے داغ عصیاں کا
خیال آتا تو ہے تجھ کو ہمارا اس بہانے سے گلہ بیداد گر کس کو ستم ہائے فراواں کا
نظر میں عارفوں کو ماسوا آئینہ خانہ ہے ملا کثرت میں مجھ کو راستہ توحید یزداں کا
پہلو میں تو جو لے دل خانہ خراب تھا سیماب کی طرح سے مجھے اضطراب تھا
تیری نگاہ مست کی اللہ رے شوخیاں صوفی بھی بادہ کش کی طرح سے خراب تھا
دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے فراق دوست کیسا تمھارے ہجر میں جاں پر عذاب تھا

جب تک تھی آنکھ بند جدائی بھی تھی لیے
جس وقت چشم وا ہوئی دریا حباب تھا

کھو کر قرار حضرت دل کیوں ہو مضطرب
یہ تو کتاب عشق کا پہلا ہی باب تھا

کہتے ہیں جس کو بند علایق وہی تو مہر
اس شوخ بے حجاب کا بندِ نقاب تھا

بس پوچھ ہم نشیں نہ مزا انتظار کا
جا بیٹھنا وہ ہائے سرِ رہگذار کا

کیفیتیں جدا ہیں وصال و فراق کی
عالم ہے اس میں نور کا اور اس میں نار کا

یوں تو اس دنیا میں ہے بہتر سے بہتر کا جواب
تو ہے یکتا نہیں تیرا برابر کا جواب

تم بہار حسن ہے نام خدا ہو گلستاں
قد تمھارا سرو ہے عارض گل تر کا جواب

تم جہاں بیٹھے وہاں بس چاندنی سی کھل گئی
ہے رخ روشن تمھارا ماہ انور کا جواب

وہ تغافل کیش ہیں اور ہم ہیں مستغنی مزاج
حسن کو دیتا ہے عشق اپنا برابر کا جواب

تاب نظارہ تجھے ہو دل شیدا کیوں کر
دو بدو مہر سے ہو دیدۂ بینا کیوں کر

ذرہ ذرہ ہے ترے نور سے معمور یہاں
دیکھنے تجھ کو گیا طور پہ موسیٰ کیوں کر

ایک ہی جام مئے عشق سے بیہوش ہیں ہم
خم کے خم پیتے ہیں مے نوش خدایا کیوں کر

شوق نظارہ مجھے اور وہ بت پردہ نشیں
میں ہوں حیران کہ حل ہو گا یہ عقدہ کیوں کر

حسن کا خاصہ ہے جلوہ فروشی اے مہر
پھر پسند آیا ہے اس شوخ کو پردہ کیوں کر

درِ جاناں سے نہ لے جائے خدا اور کہیں
ہم نہیں جائیں گے اس در کے سوا اور کہیں

گھر سے نکلے تو تھے کعبے کا ارادہ کر کے
شوق کمبخت مگر لے ہی گیا اور کہیں

بے ٹھکانوں کا ٹھکانا ہے ترے کوچے میں
نہ گئے اور نہ جائیں یہ گدا اور کہیں

طغیان اشک یوں مرے چشم پُر آب میں
دریا میں ہے حباب کہ دریا حباب میں

ہم اور کوئے غیر پے جستجوئے دوست
غیرت کا بھی خیال نہیں اضطراب میں

عشق مجاز حسن حقیقی کو چھوڑ کر　ڈوبے کبھی آپ مہر تو موجِ سراب میں

طاعت پہ اپنی شمع عبث تجھ کو ناز ہے　غرہ نہ کر کہ ذات خدا بے نیاز ہے
پہنچے ہیں ہم پیالہ و شیشے سے تا سبو　سچ کہتے ہیں کہ حرص کا دامن دراز ہے
تو ناز نیں ہے اس لئے زیور ہے تیرا ناز　میں خاکسار ہوں مجھے زیبا نیاز ہے

رباعیات مہر

مہر کے مجموعہ کلام میں تقریباً چار سو رباعیات بھی شامل ہیں جن کے موضوع پند و اخلاق یا حقایق و معارف وغیرہ ہیں۔

فکر مکان

کیسے کیسے مکاں ہیں عالی شاں　کیسے کیسے جمع ہیں ساز و ساماں
شاید اے مہر ہے مکینوں کو یقیں　چلنا نہیں رہنا ہے ہمیشہ ہی یہاں
دنیا کے سرا میں پانچ دن کا ہے قیام　سودائے عمارت ہے سودائے خام
کیا سر پہ مکاں اوٹھا کے لے جائے گا　جب آئے گا اے مہر اجل کا پیغام

شہرت و عزت

شہرت کی ہوس کمال نادانی ہے　کس کی رہی یاد کس کی رہ جانی ہے
دنیا میں رہے گا نام اللہ کا بس　باقی جو شے ہے مہر وہ فانی ہے

جو نام کا یاں قیام بتلاتا ہے　یہ یاد رہے وہ غلطی کھاتا ہے
چلتا رہتا ہے کچھ دنوں تک بے شک　پھر نام کا بھی نشان مٹ جاتا ہے

احباب و اقارب

جب تک کہ ہے زردار ترے یار ہیں سب
جب تک نہ پڑے وقت وفادار ہیں سب
جب وقت پڑے گا دیکھ لیجو غافل
سمجھا تھا جنھیں یار وہ عیار ہیں سب

احباب کو کترا کے نکلتے دیکھا
آنکھیں ہم چشموں کو بدلتے دیکھا
اے مہر خدا کسی کو مفلس نہ کرے
مفلس سے ہر ایک کو بچ کے چلتے دیکھا

جو کہتا ہے اولاد سے چلتا ہے نام
اس کو میری طرف سے دو یہ پیغام
کئی پشت کے نام چل رہے ہیں تیرے
گر چار بتا دے تو کروں سات سلام

اعمال نیک

آغوش لحد میں ایک دن سونا ہے
اس وقت پچھتائے تو کیا ہونا ہے
ہے مزرعۂ آخرت یہ دنیا اے مہر
بولے اس وقت جو یہاں بونا ہے

افکار دنیا

یکسو دل بے قرار دم بھر نہ ہوا
افکار سے خالی نہ ہوا پر نہ ہوا
اے گردش دہر ترے چکر میں
آرام سے بیٹھنا میسر نہ ہوا

خصوصیات کلام مہر

جدید نظم نگاری کو رواج دینے کا سہرا آزاد اور حالی کے سر ہے مگر ہندوؤں میں سب سے پہلے منشی سورج نراین مہر نے نظم نگاری کی طرف اپنی خاص توجہ دی۔

منشی سورج نراین مہر اردو کے ایک مایہ ناز شاعر ہیں۔ ان کا کلام ایک

گنجینۂ معرفت ہے ۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ کسی شاعر کے تخیلات اور جذبات سے اس کی شخصیت اور کردار کا پتہ چلتا ہے تو وہ منشی سورج نراین مہر دہلوی پر پوری طرح صادق ہوتی ہے ۔ مہر کا پاکیزہ اور روحانی کلام ان کی بے لوث صوفیانہ زندگی کا آئینہ ہے ۔ مہر ایک صوفی باصفا تھے اور مسئلہ وحدت وجود کے معتقد تھے ۔ ان کے تمام کلام میں خواہ نظمیں ہوں یا غزلیں یا رباعیات ان کے صوفیانہ تخیلات اور عارفانہ محسوسات کی جھلک بخوبی نمایاں ہے ۔ ان کی شاعری بلاشبہ ان کی حیات کی سچی تنقید ہے ۔

مہر نے ہندوؤں کی تمام مذہبی کتاب راماین، مہابھارت، گیتا، اپنشد اور ویدانت وغیرہ کا بغور مطالعہ کیا تھا جس سے ان کی زندگی بیحد متاثر ہوئی تھی ۔ ان کی شاعری کا نصب العین مذاہب کی تنگ نظری اور لاطائل قیود سے اوپر اٹھ کر انسان کے دل میں محبوب حقیقی کا عشق پیدا کرنا اور اس کے اخلاق و کردار کو بلند کرنا ہے ۔ چنانچہ مہر خود تحریر فرماتے ہیں[1] " راقم آثم کے مطالعہ میں چونکہ سنسکرت اور انگریزی کتب زیادہ رہی ہیں اس باعث سے نظم میں بھی ان ہی زبانوں کا مذاق طبیعت پر حاوی اور مستولی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میری زبان پر سنسکرت کی تشبیہات، استعارات اور تمثیلات بھی چڑھی ہوئی ہیں کیونکہ برسوں ویدانت کی کتب نظم و نثر اسی زبان میں پڑھتا رہا ہوں ۔ ناممکن تھا کہ نظموں میں یہ اپنا رنگ نہ دکھائیں ۔ ۔ ۔ ۔ کلام کا زیادہ تر حصہ حقانی یعنی ویدانت اور تصوف کی شاعری ہے ۔ "

---

[1] دیباچہ کلام مہر صلا، صلا، صہ۱۸

مہر جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ انھوں نے صوفیانہ اور عارفانہ غزلوں اور رباعیات کے علاوہ اپنی روحانی نظمیں، قصیدہ، ترکیب بند، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن اور مثنوی وغیرہ جملہ اصناف سخن میں لکھی ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام میں چار قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ حقانی، اخلاقی و نیچرل، بچوں کی نظمیں اور انگریزی نظموں کے ترجمے۔ مہر کی اخلاقی اور نیچرل نظموں میں بھی ان کے مذاق سنسکرت و انگریزی کا رنگ اور تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے اس لحاظ سے ان کا شمار بھی حقانی نظموں میں کیا جاسکتا ہے۔ غرض کہ اگر حقایق و معارف کا لطف اٹھانا ہو تو کلامِ مہر کا مطالعہ کیا جائے۔

مہر کا کلام سنسکرت ادب کے پاکیزہ اور لطیف خیالات و جذبات سے لبریز ہے۔ جو مہر معانی، سبق آموز نکات، شستہ روزمرہ اور سلاست و روانی کو وہ تکلف و تصنع پر ہمیشہ ترجیح دیتے تھے۔ مہر کا بیشتر کلام پند و نصائح سے پُر ہے۔ اگر مہر کو اردو زبان کا سعدی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

بچوں کی نظمیں لکھنے کی طرف ہمارے اردو شعرا نے بہت کم توجہ دی ہے۔ جب کہ انگریزی ادب میں اس قسم کی نظمیں بکثرت ملتی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ ہند نے مختلف صوبہ جات میں طرز جدید کی درسی کتب تیار کرنے کے لئے کمیٹیاں مقرر کی تھیں۔ صوبہ پنجاب میں مہر بھی اس کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ ریڈروں کی نثر جب مرتب ہو چکی تو نظموں کی تلاش ہوئی۔ لیکن جس طرح کی نظمیں کمیٹی چاہتی تھی دستیاب نہ ہو سکیں۔ آخر مہر نے کمر ہمت باندھی اور انگریزی ریڈروں کی تقلید میں نظمیں لکھیں[1]۔ جن شعرا نے بچوں کے لئے سب سے پہلے نظمیں لکھیں ان میں

---

[1] دیباچہ کلام مہر صکلا

مولوی اسمٰعیلؒ کے بعد مہر دہلوی ہی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

کلام مہر میں بچوں کی ۴۲ نظمیں درج ہیں جن میں کام، باہر کی سیر، بہادر بنو، دیر نہ لگاؤ، ہمت نہ ہارنا، ماں باپ کی خدمت، کام کرو، کھیل، اچھا لڑکا، اچھی لڑکی، صحبت کا اثر، باغ کی سیر، ماں کی نصیحت، میری کتابیں وغیرہ مفید اور دلچسپ نظمیں ہیں۔ مہر کی بچوں کی نظمیں اردو زبان میں ان کا مابہ الامتیاز اضافہ ہیں۔ بچوں کے اخلاق اور کردار کی اصلاح و تربیت کے لئے مہر کی نظموں کو بچوں کی ریڈروں میں ضرور داخل کرنا چاہیے۔

کرنیل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب اردو کے ماہر اور قدرداں تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی سے ۱۸۹۲ء میں مہر نے مشہور انگریزی نظموں کے ترجمے اردو میں کئے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی بیس دلچسپ نظمیں کلام مہر میں درج ہیں۔

مہر غزلیں شاذ و نادر ہی لکھتے تھے۔ ان کے مجموعہ کلام میں بمشکل تمام پچاس غزلیں شامل ہیں۔ ان کی کچھ غزلیں ۱۸۸۲ء سے پہلے کی ہیں جب کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اور دہلی و لاہور کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ مہر کی غزلیں بھی ان کے باقی کلام کا ہم رنگ ہیں۔ تغزل کے رنگ میں تمام تر عارفانہ و صوفیانہ تخیلات اور جذبات کو کامیابی کے ساتھ ہر شعر میں ادا کرنا مہر ہی کا حصہ ہے۔ اردو زبان میں بجز خواجہ درد کے یہ خصوصیت کسی اور شاعر میں نہیں پائی جاتی۔ مہر نے اپنی تمام غزلیں عارفانہ اور صوفیانہ مسائل اور مضامین پر لکھی ہیں مگر انھوں نے ہر شعر میں تغزل کی نزاکت و لطافت کوٹ کوٹ

کر بھر دی ہیں۔ ان کی غزلیں پاکیزہ تخیلات اور روحانی جذبات سے لبریز ہیں۔ وہ اردو غزلوں کے تمام نقائص اور فرسودہ مضامین سے یک لخت پاک ہیں۔

درگا سہائے سرور جہان آبادی

منشی درگا سہائے سرور قوم کالیستھ سکسینہ کے پدر بزرگوار کا نام حکیم پیارے لال تھا۔ سرور دسمبر ۱۸۷۳ء میں قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ قصبہ جہان آباد کے قدیم رئیس و زمیندار تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم جہان آباد کے تحصیلی اسکول میں ہوئی۔ وہیں سے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ابتدا ہی سے سرور اپنی ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے اپنی جماعت میں ممتاز رہے۔ مڈل پاس کرنے کے بعد انھوں نے مولوی سید کرامت حسین بہار سے فارسی پڑھی۔ شعر و سخن کا شوق بھی اسی وقت سے پیدا ہوا، چنانچہ ابتدا میں انھوں نے بہار سے اصلاح سخن بھی لی۔ لکھنے پڑھنے سے جس قدر وقت بچتا تھا شعر گوئی اور شعرا کا کلام دیکھنے میں صرف کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ایک پوسٹ ماسٹر صاحب سے انگریزی پڑھ کر دو سال میں انگریزی مڈل کا بھی امتحان پاس کیا۔ ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا بھی مشغلہ جاری تھا۔ ابتدا میں وحشت تخلص اختیار کرتے تھے۔

مولف خمخانہ جاوید تحریر فرماتے ہیں "کچھ عرصہ تک آپ ایک رئیس زادہ کے اتالیق رہے۔ پھر دو تین سال تک رسالہ زمانہ کے دفتر میں مامور رہے۔ شاعری کے علاوہ آپ کو فن طب میں بھی دخل تھا مگر بدقسمتی سے ہمیشہ پریشان روزگار رہے۔ اور سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بیش بہا کلام کو کوڑیوں کے مول فروخت کیا۔ ہندوستان کے جادو مقال شاعر کالیداس کی نظموں کو اردو لباس پہنا کر ایسے لوگوں سے منسوب کیا جو اس کی باریک بینی، نازک خیالی اور لطافت سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔"

سرور کو اردو اور فارسی زبانوں پر دستگاہ کامل حاصل تھی۔ انگریزی میں بھی اتنی لیاقت رکھتے تھے کہ انگریزی نظموں کو بخوبی سمجھ لیتے تھے اور لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ علمی لیاقت کے ساتھ ان کی معلومات اور تجربات کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ انھیں وجوہات سے وہ جدید اردو شاعری کے ایک کامیاب شاعر ثابت ہوئے۔

عین عالم شباب میں اہلیہ اور اکلوتے فرزند کی وفات سے دنیا سے سرور کا دل سرد ہو گیا۔ اس رنج و غم سے ان کی صحت خراب ہو گئی اور غم ان کی طبیعت کا جزو اعظم بن گیا، اسی وقت سے انھوں نے مے نوشی بھی اختیار کی۔ چنانچہ اکثر فرمایا کرتے تھے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے (غالب)

لیکن آخر میں اس کثرت سے پینے لگے تھے کہ کئی روز تک مست و بیہوش

رہتے تھے۔ رام بابو سکسینہ تحریر فرماتے ہیں[1] "سرور صاحب نہایت آزاد مزاج اور رند مشرب واقع ہوئے تھے۔ فکر فردا سے ہمیشہ آزاد رہتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ مصیبت و عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر یہ حسرت و مصیبت ان کے شاعرانہ ذوق کو کبھی دھیما نہ کر سکی۔ ان کو نمائش اور ظاہرداری کا شوق نہ تھا... سرور کا اکثر کلام ضایع ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر قابل افسوس بات یہ ہے کہ اکثر لوگوں نے ان کا کلام ہتھیا لیا۔ کبھی معاوضہ کے ساتھ اور کبھی معاوضہ بھی ہضم کر گئے۔... سرور کو شعر گوئی میں کمال حاصل تھا۔ وہ ہمیشہ شاعرانہ خیالات میں غرق رہتے تھے اور نہایت زود گو اور بے تکلف کہنے والے تھے۔ حالانکہ انھوں نے جملہ اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے مگر مسدس ان کو بہت محبوب تھا اور اس میں وہ بہت زور طبیعت دکھاتے تھے۔"

۱۸۹۹ء سے سرور کا کلام ادیب، مخزن اور زمانہ وغیرہ رسالوں میں شایع ہو کر مقبول عام ہونے لگا۔ ان کی بدیہہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ بحالت بیماری جب ان کو شراب مانگنے پر پانی دیا گیا تو ہنس کر فرمایا ؎

بجائے مے دیا پانی کا ایک گلاس مجھے   سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے

سرور ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو محض ۳۷ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کلام کا مجموعہ "جام سرور" اور "خمخانۂ سرور" کے نام سے طبع ہوا۔ اپنے کلام کی عظمت کا سرور کو خوب احساس تھا۔ چنانچہ خود کہا ہے ؎

---

[1] تاریخ ادب اردو صفحہ ۴۳۶، ۴۳۸

نقش باطل ہو نہیں سکتا کبھی نام سرورؔ
دہر میں جب تک رہے کی گردش جام سرورؔ

سرور کی نظم نگاری

سرورؔ نے قومی، ملکی، نیچرل، اخلاقی اور تاریخی و مذہبی وغیرہ ہر قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ رام بابو سکسینہ سرورؔ کے متعلق لکھتے ہیں[۱]: "ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت جذبات نگاری اور درد و اثر ہے۔ اس رنگ میں وہ اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مثل استاد الشعراء میر تقی میرؔ کے سرورؔ کے مزاج میں حزن و یاس اور رنج و الم کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اسی وجہ سے مثل میرؔ کے ان کا کلام بھی جذبات نگاری کا ایک مرقع ہوتا تھا۔ ان کی اس قسم کی نظمیں دیوار کہن، حسرت شباب، اندوہ غربت، مرغان قفس، یاد طفلی، بلبل کا فسانہ، حسرت دیدار، ماتم آرزو اور بیوہ وغیرہ ہیں۔"

نظم "بیوہ" میں ایک بیوہ کے جذبات رنج و غم کو سرورؔ نے نہایت رقت آمیز ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

وہ دکھیا ہوں نہیں درد نہاں کا راز داں کوئی
وہ بیکس ہوں نہیں سنتا ہے میری داستاں کوئی

بنایا ہے سراپا داغ حسرت سوز حرماں نے
پنہاں ہے آہ پھولوں کی نہ مجھ کو بدھیاں کوئی

تقاضا لذت ذوق خلش کا ہے شب غم میں
جگر میں آہ رکھ دے چیر کر نوک سناں کوئی

زمانہ ہو رہا ہے آہ جب تاریک نظروں سے
سنوارے بام پر کیا گیسوئے عنبر فشاں کوئی

نظم "سیتا جی کی گریہ و زاری" کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

---

[۱] تاریخ ادب اردو ص۴۲۷، ص۴۲۸

ہمراہ اپنے بن کو مجھے ساتھ لے چلو
دیکھا تمھارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو
نازک ہے میرا شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا
چھوٹا تمھارا ساتھ تو جی چھوٹ جائے گا
مانا کہ دشت میں غم و آلام ہے بہت
بن باسیوں کو دکھ سحر و شام ہے بہت
ایذا اگرچہ آبلہ پائی کی ہے کڑی
دوزخ سے بڑھ کے آگ جدائی کی ہے کڑی
یہ آگ وہ ہے جو دل مضطر کو پھونک کر
بجھتی ہے آرزو کے بھرے گھر کو پھونک کر
سوامی جو تم ہو ساتھ تو کیسا الم کدہ
خس پوش جھونپڑا مجھے ہوگا صنم کدہ
صورت تمھاری دیکھ کے غم بھول جاؤنگی
صحرا کے سارے رنج و الم بھول جاؤں گی

سرور کے کلام کی دوسری خصوصیت حب الوطنی ہے۔ چکبست کی طرح سرور کے دل میں بھی ملک اور قوم کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کی اس قسم کی نظمیں خاک وطن، عروس وطن، حسرت وطن، یاد وطن اور مادر ہند وغیرہ ہیں۔ ان تمام نظموں سے سرور کے حب وطن کے متعلق سچے جوش و عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

نظم "خاک وطن" میں سرور نے وطن کی گزشتہ کھوئی ہوئی عظمت کو یاد کرکے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے نو نو شعر کے قطعات کہے ہیں۔ آخری قطعہ ملاحظہ ہو ؎

آہ! او خاک وطن! اے دردمند بیقرار
آہ! اے شوریدہ قسمت اے پریشاں روزگار
اڑ رہا تھا پرچم شوکت ترا افلاک پر
سرنگوں ہے تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر
تیری شہرت کے نگیں خاک عدم میں ہیں نہاں
اب نہ وہ تخت مرصع ہے نہ تاج زرفشاں
جھلملا کے بجھ گئے سب تیرے ایواں کے چراغ
ہیں جگر کے داغ اب تیری شبستاں کے چراغ
اڑ گیا نور سحر تاریکیٔ غم چھا گئی
نیر اقبال ڈوبا شام ماتم چھا گئی

اڑ گئی بوئے وفا حب وطن جاتی رہی
چھا گیا رنگ خزاں شانِ چمن جاتی رہی

اب کہاں ایثار نفس اور اب وہ جاں بازی کہاں
حسرتیں خوں گشتہ ہیں کچھ دل کی بستی میں نہاں

پھر بھی اے خاک وطن اف رے وفاداری تری
چار سو ہے دہر میں نہر کرم جاری تری

تیرے جنگل اب بھی ہیں خاک وطن مہماں نواز
تیرے پتلے میں ہے قدرت کی ادائے جاں نواز

سرور نے متعدد نیچرل نظمیں لکھی ہیں جو بیحد دل آویز ہیں۔ انھوں نے فطرت نگاری میں تغزل کا رنگ دے کر اپنی نیچرل نظموں کی دلکشی کو بہت زیادہ بڑھا دی ہے۔

" جمنا " کے عنوان پر سرور نے پانچ صفحے کی ایک بہت دل آویز طولانی نظم لکھی ہے۔ بخوف طوالت اس نظم کے چند متفرق شعر ملاحظہ ہوں ؎

دھیمی دھیمی بہنے والی ایک نہر دلنشیں
آبجو چھوٹی سی اک نازک خرام و نازنیں

تشنگیٔ شوق گنگا میں مٹانے کے لئے
جارہی ہے اپنی ہستی کو مٹانے کے لئے

یہ وہ جمنا ہے کہ دلکش جس کا ہے انداز حسن
دیکھتے ہیں آہ عاشق جس کا خواب ناز حسن

یہ وہ جمنا ہے جہاں لے کے خلوت کے مزے
لوٹے ہیں عشاق نے برسوں محبت کے مزے

چاہنے والوں نے لپٹا کر حسینوں کے لئے
ہیں لب ساحل پہ بوسے نازنینوں کے لئے

یہ وہ جمنا ہے کہ رادھا سی حسیں نے مدتوں
برج کی ایک پاک دامن نازنیں نے مدتوں

بنسی والے کی جدائی میں اڑا کر سر پہ خاک
اپنے اشکوں سے کیا ہے دامن ساحل کو پاک

یہ وہ جمنا ہے جہاں اک بانوے پردہ نشیں
آگرہ میں محو آسائش ہے جو زیر زمیں

رخ سے آہستہ اٹھا کر چادر آب رواں
دیکھتی تھی مسکرا کر منظر آب رواں

"بیر بہوٹی" پر سرورؔ نے ایک بڑی دلکش اور لطافت آمیز نظم لکھی ہے۔
تشبیہات و استعارات کی ندرت اور لطافت و نیز رنگ تغزل نے نظم میں جان
ڈال دی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آہ لے ننھے سے کیڑے نازشِ صحرا ہے تو
شعلۂ زارِ حسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو

کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا
سرخ ڈورا ہے کسی چشمِ فسوں پرداز کا

گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویرِ حسن
خونِ عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیرِ حسن

جلوۂ گل ہے فضائے وادیٔ پرخار میں
سرخ تکمہ ہے قبائے سبزہ کہسار میں

محضرِ خونِ شہیداں ہے ترا داماں سرخ
یا ہے خونِ کشتگانِ عشق کا عنوان سرخ

سبزۂ کہسار نے یہ لعل اگلا ہے کوئی
چن رہی ہے پھول یا دوشیزۂ رعنا کوئی

"ماریاسمین" اور "گنگاجی" سرورؔ کی دیگر دل آویز نیچرل نظمیں ہیں۔
سرورؔ نے چند اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں مگر کلام کی لطافت و رعنائی کو
کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ پند و نصیحت کی باتوں سے نظم میں کہیں پھیکا پن
نہیں پیدا ہوا۔ زنِ خوشخو، بے ثباتیٔ دنیا، بلبل و پروانہ اور ادائے شرم وغیرہ
اسی قسم کی عمدہ نظمیں ہیں۔
نظم "بلبل و پروانہ" میں سرورؔ نے بوالہوسی اور سچی محبت کا فرق نہایت
لطیف اور موثر انداز سے پیش کیا ہے۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

گوارا ہے ترا شوق شمع پر تجھ کو
مجھے یہ ڈر ہے نہ ہو نہ کہیں ضرر تجھ کو

فروغ شعلہ کہاں اور فروغ حسن کہاں
ہزار حیف کہ اتنی نہیں خبر تجھ کو

تڑپ تڑپ کے جو بے اختیار گرتا ہے
نہیں ہے آگ کے شعلہ سے آہ ڈر تجھ کو

یہ ننھے ننھے پر و بال یہ ستم کی تپش — ملا ہے آہ قیامت کا کیا جگر تجھ کو
قریب شمع کے آکر جو تھرتھراتا ہے — نہیں ہے جان کے جانے کا غم مگر تجھ کو
ملے گی خاک بھی ڈھونڈھے نہ تیری محفل میں — صبا اڑائے پھرے گی دم سحر تجھ کو
سمجھ نہ شمع کو دلسوز عافیت دشمن — جلا کے آہ رہے گی یہ مشت پر تجھ کو

نہیں ہے تو ابھی سوز و گداز کے قابل
نہیں ہے عشق کی عرض و نیاز کے قابل

تپش یہ بزم میں فانوس پر نہیں اچھی — کہ لاگ آگ کی او بے خبر نہیں اچھی
کڑی ہے آنچ محبت کی شمع محفل سے — لگاوٹیں ارے تفتہ جگر نہیں اچھی
تڑپ تڑپ کے نہ دیوانہ وار شمع پہ گر — تپش یہ شوق کی او مشت پر نہیں اچھی
لڑا نہ شمع سے آنکھیں کہ ہے عدو تیری — تری نگاہ محبت اثر نہیں اچھی
یہ پر سمیٹ کے فانوس پہ ترا گرنا — یہ بے خودی ارے شوریدہ سر نہیں اچھی

چمن میں چل کہ دکھاؤں بہار شاہد گل
نظر فریب ہیں نقش و نگار شاہد گل

میں بوالہوس نہیں سمجھا ہے تو نے کیا مجھ کو — پسند شاہد گل کی نہیں ادا مجھ کو
جنوں نہیں کہ ہو سودائے گل چمن میں مجھے — سمجھ نہ اپنی طرح آہ بے وفا مجھ کو
دل گداختہ لے کر ازل سے آیا ہوں — بنایا بزم نے ہے سوز آشنا مجھ کو
ڈروں جو آگ کے شعلے سے بوالہوس میں نہیں — فنا کے سوز محبت میں ہے بقا مجھ کو
چلے وہ بزم میں چپ چاپ اور میں نہ جلوں — بعید عشق سے ہے ہو غم فنا مجھ کو
تری نگاہ میں جاں سوز ہے جو اے بلبل — وہ آہ! آگ کا شعلہ ہے جانفزا مجھ کو

کھلا ہے تجھ پہ ابھی آہ! رازِ عشق کہاں
تو بوالہوس ہے تجھے امتیازِ عشق کہاں

پدمنی، پدمنی کی حیا، نور جہاں کا مزار، نل دمینتی ہستی، حسرت دیدار وغیرہ سرور کی وہ تاریخی نظمیں ہیں جن میں صداقت و سوز و گداز اور جوش و تڑپ پائی جاتی ہے۔ سیتاجی کی گریہ وزاری مہاراجہ دسرتھ کی بیقراری، جمنا، گنگا وغیرہ نہایت اعلیٰ پایہ کی وہ نظمیں ہیں جن میں سچے جذبات اور درد واثر کی جیتی جاگتی دل آویز مصوری کی گئی ہے۔

اہمیت اور خصوصیات کلام سرور

جدید اردو نظم نگاری کو رواج دینے کا سہرا آزاد اور حالی کے سر ہے لیکن ہندوؤں میں جس شخص نے اسے سب سے پہلے منتہائے عروج تک پہنچایا وہ شاعر باکمال منشی درگا سہائے سرور ہیں۔ رام بابو سکسینہ سرور کی نسبت تحریر فرماتے ہیں[1] "منشی درگا سہائے سرور کو بھی اردو شاعری کے طرز جدید کا ایک رکن رکین سمجھنا چاہیے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جنھوں نے رنگ جدید کی طرف سب سے پہلے رہنمائی کی۔ انھوں نے اپنی جدت طرازی اور معجز بیانی سے اردو شاعری کے قالب مردہ میں ایک نئی روح پھونکنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔"

سرور ایک فطری شاعر تھے۔ قدرت نے شعر و شاعری کا ملکہ ان کی سرشت میں ودیعت کیا تھا۔ شعر و شاعری ہی ان کی زندگی کا خاص مشغلہ تھا۔ یہ کہنا کہ

---

[1] تاریخ ادب اردو ص ۴۲۵

سرور کو فنافی الشعر کا درجہ حاصل تھا بیجا نہ ہوگا۔ صرف ۳۰ سال کی قلیل عمر میں انھوں نے شعر و شاعری کی جو گرانقدر خدمت کی ہے وہ نہایت قابلِ ستائش ہے۔ ان کی جوانا مرگ سے اردو شاعری کو بہت بڑا نقصان پہنچا۔ اگر کچھ دنوں حیات اور وفا کرتی تو خدا جانے شاعری میں وہ کیا کیا اعجاز دکھاتے۔

سرور کا کلام تقریباً تمام اصناف سخن میں موجود ہے۔ انھوں نے غزل، مثنوی، مخمس، مسدس، رباعی اور قصیدہ وغیرہ سب کچھ کہا ہے اور ہر صنف میں ان کا کلام حسن زبان اور لطافت بیان سے مالا مال ہے۔ زبان پر انھیں اس قدر قدرت حاصل تھی کہ باوجودیکہ ہر زمین اور بحر میں انھوں نے مختلف موضوعات پر اشعار کہے ہیں لیکن کہیں زبان کی صفائی و شستگی اور روانی و وضاحت میں کچھ فرق نہیں آنے پایا۔ جدت ادا اور معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلند پروازیاں سرور کے کلام میں بہتایت سے پائی جاتی ہیں لیکن کسی جگہ بعید اور دور از کار تشبیہات کے استعمال سے حقیقت کا خون نہیں کیا ہے۔ واقعہ نگاری جو انگریزی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے سرور کے کلام میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

سرور نے روزمرہ کے واقعات زندگی اور گوناگوں جذبات و مسائل کے پیش کرنے میں اصلیت اور صداقت سے کام لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تاثیر و لطافت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انھوں نے نیچرل نظموں میں تغزل کا رنگ دے کر ان کی لطافت اور رعنائی میں بیحد اضافہ کیا ہے۔ اپنی نادر فطرت نگاری، رنگین مزاجی، معجز بیانی اور وسیع معلومات و تجربات دنیوی کی بدولت

سرورؔ نے اپنی تمام نظموں میں بیحد دلکشی اور دل آویزی پیدا کی۔

سرورؔ کو اپنے ملک اور ملک کی ہر شے سے محبت تھی۔ چنانچہ ان کی حب الوطنی کی جھلک ان کی متعدد نظموں میں صاف نظر آتی ہے۔ اسی جذبہ کے تحت ملکی اور قومی نظموں کے علاوہ انھوں نے اپنی دیگر قسم کی نیچرل اور تاریخی و مذہبی نظموں کے لئے ایسے موضوع انتخاب کئے جن کا تعلق ہندوستان سے ہے نہ کہ غیر ممالک سے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین سرورؔ کے کلام کی نسبت تحریر فرماتے ہیں[1] "ان کے یہاں امتیازی خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ محض ایران و عرب ہی کے دریا و جانور وغیرہ کو جذبات انگیزی کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ ہندوستان کی چیزوں کو سامان صد بہار خیال کر کے کلام میں نہایت ممتاز جگہ دی ہے۔ بلبل، قمری، دجلہ، فرات، لیلیٰ و شیریں کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کی کوئل، بھونرا، ہنس، سارس، مرغابی، گنگا، جمنا، دمن اور پدمنی کو جگہ دی ہے۔ گویا سودیسی پیداوار کو بدیسی مال کے پہلو بہ پہلو سجا دیا"

چونکہ سرورؔ کو اپنی زندگی میں رنج والم اور مصیبت اور عسرت کا بھی سامنا کرنا پڑا اس لئے رنگین مزاجی اور رندی و سرمستی کے باوجود بھی ان کے دل میں حزن و یاس کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اسی وجہ سے ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت حزنیہ جذبات کا اظہار اور درد و اثر ہے چنانچہ ان کی متعدد نظمیں حزنیہ اور المیہ جذبات نگاری کے درد انگیز مرقعے ہیں۔

اردو شاعری کے دامن تخیل کو وسیع کرنے کے لئے سرورؔ نے ایک قابلِ قدر

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو صـ ۱۴۱

خدمت انجام دی ہے۔ اس کے لئے انھوں نے مشہور انگریزی نظموں کو اردو نظم کا دلکش جامہ پہنا کر ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا۔ اس سے اردو شاعری میں بھی تخیل کی بلند پروازیوں کی نئی نئی راہیں اور رفعتیں پیدا ہونے میں بڑی مدد ملی۔ سرور کے کلام کا تقریباً ایک تہائی حصہ غیر زبانوں کی نظموں کا ترجمہ ہے۔

مولانا حسرت موہانی سرور کی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں: "سرور جہان آبادی اردو زبان کے ایک ایسے بلند پایہ شاعر تھے جن کی لاجواب نظمیں اردو رسالوں کی زیبائش ہوا کرتی تھیں۔ ہماری نظر سے ان کی کوئی نظم ایسی نہیں گزری جس کے پڑھنے کے بعد دل سے بے اختیار تحسین و آفریں کی صدا بلند نہ ہوئی ہو۔ نسیم لکھنوی کی مرگ بے ہنگام کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہوگا جس کا ماتم دنیائے ادب کے ہر گوشہ میں ہوگا۔ اگر سرور کی زندگی وفا کرتی تو خدا جانے ان کی شاعری کا مرتبہ کہاں سے کہاں پہونچ جاتا۔ اس قلیل مدت میں جو کچھ وہ کر گئے وہ بقائے دوام کی سند حاصل کرنے کو کافی ہے۔"[۱]

---

[۱] سرور کے مزید حالات زندگی و نمونہ کلام کے لئے یادرفتگاں مولفہ جگر بریلوی صفحات النہایت ۳۶ ملاحظہ ہوں۔

۴۔ پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی

چکبست لکھنوی کا شمار اردو ادب کی چندان مقتدر اور عظیم المرتبت ہستیوں میں ہوتا ہے جن کے کارنامے سدا افق شاعری پر آفتاب و ماہتاب کی طرح جلوہ فگن رہیں گے۔

چکبست کے پدر گرامی کا نام اودت نراین چکبست تھا۔ بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے۔ چکبست ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے مگر چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں تعلیم پائی اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی۔ اس پیشہ میں انھیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی اور ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ میں رائے بریلی گئے تھے۔ عدالت میں بحث کی اور سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کے لئے اسٹیشن پر آئے۔ ریل پر بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہوگئی۔ ہمراہیوں نے یہ حالت دیکھ کر ریل سے اتار کر ویٹنگ روم میں لٹا دیا۔ ڈاکٹر آئے، علاج ہوا مگر سب بے سود۔ ۷ بجے شام کو اسٹیشن پر ہی انتقال کیا اور ان کے بڑے بھائی رائے صاحب پنڈت مہاراج نراین چکبست ایگزیکیٹو آفیسر لکھنؤ یونیورسٹی گیارہ بجے رات کو لاش موٹر میں رکھ کر لکھنؤ لائے۔

کاظم حسین محشر لکھنوی نے ان کے ہی ایک مصرع سے تاریخ وفات نکالی ہے

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
۱۳۴۴ھ

چکبست نے شاعری نو برس کی عمر میں شروع کی اور بہت جلد سخن گوئی میں وہ مشاقی اور زبان میں وہ صفائی پیدا کر لی تھی کہ ان کے مسدسوں کو دیکھ کر انیس کے کلام کا سراسر دھوکا ہوتا ہے۔ سولہ سال کی ہی عمر میں انھوں نے "جلوۂ صبح" اور "مرقع عبرت" ایسی بلند پایہ نظمیں لکھ کر اپنی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت پیش کیا۔ ان کا مجموعہ کلام "صبح وطن" کے نام سے ان کی وفات کے سال ۱۹۲۶ء میں طبع ہوا۔ اس میں ۳۶ نظمیں، تقریباً ۴۰ غزلیں، چند رباعیاں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ کل جلد ۱۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

"صبح وطن" چکبست کی وہ زندۂ جاوید اور مایۂ ناز تصنیف ہے جو اردو شاعری کے لئے باعث صد فخر اور اس کے خزانہ کے لئے رشک گوہر ہے۔

چکبست نہ صرف ایک گرانقدر شاعر تھے بلکہ وہ ایک فاضل نثر نگار اور موقر ادیب و نقاد بھی تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں ان کے مضامین کا مجموعہ مضامین چکبست کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کتاب ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا ہر علمی و ادبی مضمون چکبست کی تبحر علمی اور فاضلانہ قابلیت کی دلیل ہے۔ اس کے ادبی و تنقیدی مضامین بہ لحاظ فصاحت زبان، اسلوب بیان، سنجیدگی مضامین اور تنقیدی نکات نہایت گرانقدر اور دلچسپ ہیں۔

چکبست کا کلام ان کے ادبی، اخلاقی اور سماجی مضامین کشمیر درپن، خدنگ نظر، ادیب اور زمانہ میں شائع ہوتے تھے اور وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔

۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں "یوم چکبست" قیصر باغ بارہ دری میں

زیر صدارت رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو نہایت کامیابی کے ساتھ منایا گیا۔ کلام چکبست کے متعلق ملک کے نامور فضلار اور علمار نے اپنے قابل قدر مقالے پڑھے۔ تمام مشہور شعرا نے چکبست کے اس مصرع طرح پر "فلک تنگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا" اپنی غزلیں مشاعرہ میں پڑھیں۔ مگر چکبست کی غزل کے جلانے وہ ماند معلوم ہوئیں۔ اس تقریب میں پڑھے گئے مقالوں اور غزلوں کو یکجا کرکے پنڈت آنند نرائن ملا نے "یاد چکبست" کے عنوان سے انھیں ایک کتاب کی شکل میں شائع کی ہے۔ چکبست کی علمی و ادبی قابلیت اور ان کی شاعری کے متعلق یہ ایک نہایت قابل قدر کتاب ہے۔

چکبست کی زندگی میں یوں تو سیکڑوں واقعات ایسے ہوئے جن سے ان کی علمی قابلیت اور جودت طبع کی آزمائش کا موقع ملا ہوگا لیکن جو معرکہ آرائیاں "مثنوی گلزار نسیم" کے مباحثہ کے متعلق ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھیں وہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک پر لطف اور یادگار سرگذشت ہے۔ یہ تاریخی واقعہ کتاب "مباحثہ گلزار نسیم معروف بہ معرکۂ چکبست و شرر" میں بالتفصیل درج ہے۔ چکبست کی عمر اس وقت محض بائیس سال کی تھی اور طالب علمی کا زمانہ تھا مگر مولانا عبدالحلیم شرر ایسے جید عالم اور مشہور افسانہ نگار کے اعتراضات بابت مثنوی گلزار نسیم کے جوابات جس قابلیت و خوبی اور مذاق سلیم کے ساتھ انھوں نے دیئے اس کی مثال ملنا مشکل ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اہل کمال نے چکبست کا ساتھ دیا اور ان کو حق بجانب ٹھہرایا۔

"مثنوی گلزار نسیم" کا دیباچہ جس نے ادبی دنیا میں ایک حشر برپا کر

دیا تھا چکبست کی مضمون نگاری کی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے اور اس میں فن تنقید کی گرانقدر شان نمایاں ہے۔ مرزا محمد شفیع اپنی یادگار کتاب "مباحثۂ گلزار نسیم" میں فرماتے ہیں "انصاف ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ جناب چکبست کے قلم سے جو مضامین شررؔ کے اعتراضات کے جواب میں شائع ہوئے ہیں ان میں پوری شان تنقید قایم ہے۔ انھوں نے اپنے مخالفین کی شان میں ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کیا جو مذاق سلیم کے پایہ سے گرا ہو"

چکبست کی زندگی اور ان کے خیالات و عقاید پر پنڈت بشن نراین در کا بہت اثر پڑا تھا۔ چکبست کی وطن پرستی، صدق دلی اور پاک نفسی کا ہر شخص معتقد تھا۔ علمی قابلیت اور قومی ہمدردی کے علاوہ ان کے ذاتی صفات ایسے تھے جو ملنے والوں پر جادو کا اثر رکھتے تھے۔

"صبح وطن" کے حصہ اول میں ملکی اور قومی عنوانات پر نو نظمیں ہیں جن میں خاک ہند، وطن کا راگ، مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیام وفا، اور قوم کے سورماؤں کی الوداع مشہور نظمیں ہیں۔

چکبست کے دل میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وطن کی عظمت، محبت اور اس کی ترقی و اصلاح کا ان کو جس قدر خیال تھا اس کی جھلک ان کی مشہور نظم "خاک ہند" میں پائی جاتی ہے۔ حسن زبان، اسلوب بیان اور بلندی تخیل کے لحاظ سے یہ ایک نہایت اعلیٰ پایہ کی نظم ہے۔ اس نظم میں چکبست نے جو تشبیہات و استعارات استعمال کئے ہیں وہ ایران و عرب سے نہیں بلکہ صرف ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ چند متفرق بند ملاحظہ ہوں ؎

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سُور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے　　بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے　　اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

نظم "وطن کا راگ" میں جوش و تڑپ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وطن کی آزادی (ہوم رول) حاصل کرنے کے لئے چکبست کی جد و جہد اور ان کی جاں نثاری کے جذبات کے بیباکانہ اظہار کا یہ نظم ایک دل آویز مرقع ہے۔ چند متفرق بند ملاحظہ ہوں ؎

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے　　وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے　　مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے — خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے — یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

زبان کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز — ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز — چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

۱۹۱۷ء میں مسز بسنٹ کی نظر بندی کے زمانہ میں چکبست نے ایک پر جوش اور پر سوز نظم لکھی تھی جس کا عنوان ہے "مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیام وفا"، چند منتخب بند ملاحظہ ہوں ؎

ہند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے — جیسے برسوں کا مریض اٹھتا ہے بیماری سے
قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے — چاندنی پھیل گئی حسن وفاداری سے

تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے نور ہے محفل بھر میں

حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رک جائے — دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے — پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

نظم "قوم کے سورماؤں کی الوداع" ۱۹۱۴ء میں تصنیف کی گئی تھی۔ جب ہندوستانی سپاہیوں کی فوج دولت برطانیہ کی جانب سے یورپ کی جنگ میں حصہ لینے کے لئے روانہ کی گئی تھی۔ اس نظم میں چکبست نے اپنی سیف زبانی کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں اور وہ پُر جوش اور زوردار اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس کی کماحقہٗ تعریف ممکن نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زور آمد اور روانی کا ایک امڈتا ہوا دریا واقعات اور جذبات کی ترجمانی کے رو میں بہتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اشعار سے ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں بہادری و ناموری اور سرفروشی و جانبازی کا ایسا نشہ طاری کر دیتے تھے جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔ اس نظم کے چند متفرق بند ملاحظہ ہوں ؎

ساحلِ ہند سے جرارِ وطن جاتے ہیں ۔۔۔ کچھ نئی شان سے جانبازِ کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں ۔۔۔ تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

ان کی رگ رگ میں ہے پیوست شجاعت کے چلن ۔۔۔ رن کا میدان ہے ان کے لئے ماں کا دامن
عرصۂ جنگ کی موت ان کو ہے اک شب کی دلہن ۔۔۔ مر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن

جوش ان میں جو ہے اس جوش کا اب دور نہیں
ساٹھ پشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا ۔۔۔ طنطنۂ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا ۔۔۔ ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لئے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

جس گھڑی معرکہ جنگ میں ہو تیغ علم | سورما لڑتے ہیں اس طرح پکارے علم
دل ہو ارجن کا جگر بھیم کا انگد کا قدم | موت کے وقت نظر میں ہو تپسیہ بھیشم

جس کا قابو نہ چلا موت کی تدبیروں پر
سایہ تیغ میں آرام کیا تیروں پر

نوٹ :۔ مندرجہ بالا مسدس میں ارجن، بھیم، انگد اور بھیشم وغیرہ خالص ہندوستانی تلمیحات و استعارات کے استعمال سے شاعر نے نظم میں جان ڈال دی ہے۔

"صبح وطن" کے حصہ دوم میں زیادہ تر اصلاحی اور مذہبی نظمیں ہیں۔ پھول مالا، کرشن کنھیا، گائے، راماین کا ایک سین اور سیر دہرہ دون وغیرہ نہایت دلچسپ اور دل آویز نظمیں ہیں۔

نظم "پھول مالا" ایک اصلاحی نظم ہے جس میں چکبست نے ہندوستانی لڑکیوں کو یورپ کی تہذیب کی کورانہ نقل کرنے سے تنبیہہ کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں | ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
رنگ و روغن تمہیں یورپ کا مبارک لیکن | قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز
جو بناتے ہیں نمائش کا کھلونا تم کو | ان کی خاطر سے یہ ذلت نہ اٹھانا ہرگز
رخ کو پردہ سے اٹھایا تو بہت خوب کیا | پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز

تم کو قدرت نے جو بخشا ہے حیا کا زیور　　مول اس کا نہیں قاروں کا خزانہ ہرگز
نقد اخلاق کا ہم نل کی طرح ہار چکے　　تم ہو دمینت یہ دولت نہ لٹانا ہرگز

نظم "کرشن کنھیا" ایک مذہبی نظم ہے۔ مگر اپنی ادبی لطافتوں کے باعث وہ ہر صاحبِ ذوق کے لئے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو دلکشی اور رعنائی سے بھری ہوئی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہو

راہ تاریک ہے اور سر پہ گرج بادل کی　　دو نگڑا مینہ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی
شوخ و طرار حسیں چھوکریاں گوکل کی　　چلی آتی ہیں صراحی لئے جمنا جل کی
دل لڑکپن کی امنگوں پہ مچل جاتا ہے
کھکھلا پڑتی ہیں جب پاؤں پھسل جاتا ہے

یہ خوشی ہے کہ منانا ہے کنھیا کا جنم　　دل میں ارمان ہزاروں ہیں مگر وقت ہے کم
نہیں سینے میں سماتا یہ ہے دل کا عالم　　آنکھ پڑتی ہے کہیں اور کہیں پڑتا ہے قدم
ایک کو ایک کی صورت جو نظر آتی ہے
مسکرا دیتی ہیں جب برق چمک جاتی ہے

نظم بعنوان "گائے" بہت دلچسپ ہے۔ یہ پوری نظم لطافت زبان حسن بیان اور پاکیزہ تخیل سے مزین ہے۔ صرف ایک بند ملاحظہ ہو

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار　　بے پئے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار　　وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کی بہار
ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
پی کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

چکبست کی نظم " راماین کا ایک سین " اردو شاعری کی ایک مایۂ ناز نظم ہے۔ یہ پوری نظم پند و اخلاق، بے ثباتی دنیا، رضائے خدا، سوز و گداز اور درد و تاثیر کا مرقع ہے۔ انتخاب الفاظ و لطافت زبان اور اسلوب بیان میں وہ کشش ہے کہ فصاحت سو جان سے قربان ہو اور بلاغت منہ چومے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کو لکھتے وقت چکبست نے انیسؔ کے تمام کمالات شاعری کو اپنے اندر سمیٹ کر فکر سخن کیا ہے۔ محض دو بند ملاحظہ ہوں ؎

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال ‏ ‏ خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال ‏ ‏ سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ ‏ ‏ نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ ‏ ‏ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

سیاسی و قومی رہنماؤں اور آزادی کے علمبرداروں کی وفات پر چکبست نے جوش و تاثیر میں ڈوبی ہوئی چند نظمیں بطور مرثیہ بھی لکھی ہیں۔

"صبح وطن" کے حصہ سوم میں بیشتر مرثیے ہیں اور حصہ چہارم میں غزلیں۔ چکبست کے مراثی درد و تاثیر کے مرقع ہیں۔ گوپال کرشن گوکھلے کی موت پر جو مرثیہ انھوں نے لکھا ہے اس میں ان کے دل میں متوفی کے متعلق جو خیالات تھے

ان کا عکس بخوبی نظر آتا ہے۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو — مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو — مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

نظم "جلوہ صبح" کو چکبست نے ۱۸۹۸ء میں سولہ سال کی عمر میں لکھی تھی۔ اس نظم سے ثابت ہوتا ہے کہ چکبست نے کم سنی ہی میں اردو زبان اور شاعری پر کافی قدرت حاصل کر لی تھی۔ ان کے ابتدائی زمانہ کے کلام میں بھی غضب کی پختگی، روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ نظم "جلوہ صبح" پر انیس کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی زور، وہی تاثیر، وہی لطافت زبان اور حسن بیان۔ صرف تین بند ملاحظہ ہوں ؎

دریائے فلک میں تھا عجب نور کا عالم — چکر میں تھا گرداب صفت نیر اعظم
اٹھتی تھیں شعاعوں کی جو موجیں وہ شرردم — سیارے حبابوں کی طرح مٹتے تھے پیہم

تھی شورش طوفان سحر غرب سے تا شرق
آخر کو سفینہ مہ گردوں کا ہوا غرق

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم — مرغان ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم
ہنگام سحر باد سحر چلتی تھی پیہم — آرام میں تھا سبزہ تہ چادر شبنم

ہر سمت بندھی نعرۂ بلبل کی صدا تھی
غنچوں کی نسیم سحری عقدہ کشا تھی

جو نخل تھا گلشن میں برومند کھڑا تھا
دامن سحر میں گل خورشید پڑا تھا
کیا خوب مقدر چمنستان کا لڑا تھا
ہر گل پہ گہر قطرۂ شبنم کا جڑا تھا
بلبل کہیں طاؤس کہیں گھوم رہے تھے
مستوں کی طرح نخل چمن جھوم رہے تھے

انتخاب از غزلیات چکبست

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروس شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

تصوف و روحانیت

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے میرا
جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہے میرا
پیتا ہوں وہ مے نشہ اترتا نہیں جس کا
خالی نہیں ہوتا ہے وہ پیمانہ ہے میرا
ہر ذرۂ خاکی ہے مرا مونس و ہمدم
دنیا جسے کہتے ہیں وہ کاشانہ ہے میرا
عاشق بھی ہوں معشوق بھی یہ طرفہ مزا ہے
دیوانہ ہوں میں جس کا وہ دیوانہ ہے میرا
ملتا نہیں ہر ایک کو وہ نور ہے مجھ میں
جو صاحب بینش ہے وہ پروانہ ہے میرا

لکھا یہ داور محشر نے میری فرد عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

حب وطن

جنوں حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پیر میں ہوں اور دل آزاد رہے
باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہوں
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آزاد رہے

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب — وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے — اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پہ بھی — پر اب عروج وہ علم و کمال و فن میں نہیں

وہی ہے بزم وہی شمع ہے وہی فانوس — فدائے بزم وہ پروانے انجمن میں نہیں

غرور و جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا — بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے — مزا دامان مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

قوم کا غم مول لے کر دل کا یہ عالم ہوا — یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک فسوں گر نے — نہ میں ہندوستاں کا ہوں گو ہے ہندوستاں میرا

سیاسی

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ مری — کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ ہنسنے پائیں — چپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے

باغ میں لے کے جنم ہم نے اسیری جھیلی — ہم سے اچھے رہے جنگل میں جو آزاد رہے

زبان کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

یہ بے کسی بھی عجب بے کسی ہے دنیا میں — کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

گنہگاروں میں شامل ہیں گناہوں سے نہیں واقف — سزا کو جانتے ہیں ہم خدا جانے خطا کیا ہے

در زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے — وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے — نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو

پابند قفس کی نہیں یہ آہ شرربار — لگ جائے کہیں آگ نہ صیاد کے گھر میں

شاد ہیں ناشاد ہیں یا خانماں برباد ہیں — ہم سے اچھے ہیں کہ یہ وحش و طیور آزاد ہیں

فلسفہ

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

ایک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشت خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

اعمال کا طلسم ہے نیرنگ زندگی
تقدیر کیا ہے گردش لیل و نہار کیا

سفر میں زندگی کے سو گیا ہوں تھک کے منزل پر
اجل کے نام سے بدنام ہے خواب گراں میرا

پند و اخلاق

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

میں دوست بھی اپنا ہوں عدو بھی میں اپنا
اپنا ہے کوئی اور نہ بیگانہ ہے میرا

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستار غریباں ہونا

ہے مرا ضبط جنوں جوش جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

کیسا ہوائے حرص میں برباد ہے بشر
سمجھا ہے زندگی کو یہ مشت غبار کیا

متفرق

یہ انقلاب ہوا عالم اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

باغباں نے یہ انوکھا ستم ایجاد کیا
آشیاں پھونک کے پانی کو بہت یاد کیا

کیا کونپلیں دکھاتی ہیں عالم ابھار کا
آنچل سرک گیا ہے عروس بہار کا

پھیلی ہو جیسے گورِ غریباں میں چاندنی
عالم یہ ہے خوشی میں دلِ داغ دار کا

وہ دن گئے کہ تجھ سے لرزتے تھے اے اجل
اب زندگی ہے نام ترے انتظار کا

ہر اک خشتِ کہن افسانۂ دیرینہ کہتی ہے
زبانِ حال سے ٹوٹے کھنڈر فریاد کرتے ہیں

بلائے جان ہیں یہ تسبیح و زنار کے پھندے
دلِ حق بیں ہم کو اس قید سے آزاد کرتے ہیں

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

شفق ہے آسماں پر لالہ و گل باغ و صحرا میں
دکھاتا ہے شہیدوں کا لہو رنگینیاں اپنی

ہزاروں آرزوئیں داغ بن کر دل میں پنہاں ہیں
کہ جن کا نام لینے سے لرزتی ہے زباں اپنی

نہ بدلی ہے نہ بدلے گی ترنگ اپنی طبیعت کی
دکھائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

چمکتا ہے شہیدوں کا لہو پردہ میں قدرت کے
شفق کا حسن کیا ہے شوخیٔ رنگِ حنا کیا ہے

محبت ہے مجھے کوئل کے درد انگیز نالوں سے
چمن میں جا کے میں پھولوں کا شیدا ہو نہیں سکتا

ہزاروں جان دیتے ہیں بتوں کی بیوفائی پر
اگر ان میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

ہوا مزاج کا عالم یہ سیرِ یورپ سے
کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے

زمیں لرزتی ہے بہتے ہیں خون کے دریا
خودی کے جوش میں بندے خدا کو بھول گئے

گراں تھی دھوپ اور شبنم بھی جن پودوں کو گلشن میں
تری قدرت سے وہ پھولے پھلے صحرا کے دامن میں

ذکر کیوں آئے گا بزمِ شعرا میں اپنا
میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

چکبست کی غزل گوئی

چکبست بلاشبہ ایک سچے محب وطن اور ملک کی آزادی کے مجتہد تھے۔ ان کی

قبل از وقت موت سے اردو ادب اور ملک و قوم کی بہبودی کو بہت بڑا نقصان پہنچا۔ ان کی طبیعت کا رجحان بیشتر نظم گوئی کی طرف تھا۔ وہ نظمیں زیادہ اور غزلیں کم کہتے تھے۔ وہ اپنی دلکش نظموں کی بدولت ہی غیر معمولی اور ابدی شہرت حاصل کر سکے۔ مگر غزل گوئی میں بھی وہ ایک کامیاب شاعر تھے اور اس رنگ میں اپنی انفرادی خصوصیت رکھتے تھے۔ غزل گوئی کے میدان میں وہ جادۂ عام سے دامن کشاں گئے۔ معشوق خیالی کے حسن و عشق، وصل و ہجر اور ظلم و ستم کے متعلق فرسودہ مخرب اخلاق اور بے کار باتوں کو قلمبند کرنے کے بجائے انھوں نے اپنی غزلوں کو بھی ملکی، قومی اور اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ بنایا۔

چکبست نے اپنی غزلوں میں زیادہ تر اپنے حب وطن اور قومیت کے جذبات کا ہی اظہار کیا ہے۔ چمن و آشیاں، گل و گلچیں، بلبل و صیاد اور باغ و جنگل کی آڑ میں انھوں نے برٹش حکومت کے نظام پر زبردست چوٹ اور قوم کی غلامی و بیکسی پر اظہار تاسف کیا ہے۔ ان سے قبل کسی اور شاعر نے غزل کو سیاسی و ملکی حالات اور قومی جذبات کے اظہار کا آلہ نہیں بنایا تھا۔ غزل کے رنگ اور محدود میدان میں ایک کارآمد نئے راستے کا نکالنا اور اس پر اپنے رہوار تخیل کو کامیابی کے ساتھ دوڑا کر دکھلا دینا چکبست کا ایک خاص ادبی کارنامہ ہے۔ یہ یاسی رنگ چکبست کی غزل گوئی کی انفرادی خصوصیت ہے۔

قومی و سیاسی رنگ کے کلام کے علاوہ چکبست کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی کثیر تعداد میں ملتے ہیں جن میں انھوں نے تصوف یا فلسفۂ زندگی کا اظہار یا

پند و اخلاق کی تلقین کی ہے۔ اسلوب بیان اور حسن زبان کا کیا کہنا اس سے تو چکبست کا سارا کلام مزین ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور چکبست کی نسبت فرماتے ہیں[۱]" چکبست انیس و آتش کے صرف قائل ہی نہیں مقلد بھی تھے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں ہر دو اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے کلام میں رنگینی و درد ہے۔ صدق جذبات اور سوز گداز نے کلام میں تاثیر پیدا کی ہے اور روانی و صفائی نے اسے دلنشین بنایا ہے"

چکبست کی نظم نگاری

چکبست کا شمار اردو کے ان معدودے چند شعرا میں ہوتا ہے جن پر جدید اردو شاعری جتنا ہی ناز کرے کم ہے۔ جس رنگ جدید کو نظیر اکبر آبادی مولانا آزاد اور حالی نے شروع کیا تھا اسی کے نمائندوں میں چکبست کی ایک مایۂ ناز ہستی ہے۔ رنگ جدید کے بہترین شعرا ڈاکٹر اقبال اور سرور جہان آبادی کی طرح چکبست بھی حسن و عشق کی باتوں اور بیکار قصیوں سے نفرت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ملکی، قومی، مذہبی، اخلاقی اور نیچرل نظموں کے ذریعہ ایک ایسا دلفریب البم تیار کیا ہے جس میں ہمیں حب الوطنی، پند و اخلاق اور مناظر قدرت کی دل کش اور روح افزا تصویریں جا بجا ملتی ہیں۔ انھوں نے سادہ و سلیس الفاظ میں دُرِ خیال کی دلفریب لڑیاں تیار کی ہیں۔ سلاست زبان، چستی بندش اور زور کلام کا کیا کہنا۔

---

(۱) تنقیدی اشارے۔ از پروفیسر آل احمد سرور ص۱۱۲

ایک بحر ذخار ہے کہ بڑھتا اور امڈتا چلا آتا ہے۔ کہیں پر کسی قسم کی سستی یا زبان کو رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی زبان پر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کی مہر ہے۔

چکبست ایک فکری اور وہبی شاعر تھے۔ انھوں نے پہلی غزل صرف نو سال کی عمر میں کہی تھی۔ اسی عمر سے وہ برابر شعر کہتے تھے۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر تک انھوں نے سخن گوئی میں وہ مشاقی اور زبان میں وہ صفائی پیدا کرلی تھی کہ ان کی نظم "جلوۂ صبح" اور "مرقع عبرت" سے انیس کے کلام کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اساتذہ میں وہ آتش، غالب اور انیس کے کلام کے شیدا تھے۔ چنانچہ ان کی غزل پر آتش اور مسدس پر انیس کی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔ حالانکہ خیالات اور مضامین میں بہت اختلاف ہے۔ سلاست زبان، بندش الفاظ اور حسن ترکیب میں انھوں نے انہی استادوں کی پیروی کی ہے۔

وطن کی محبت اور ملک کی آزادی حاصل کرنے کے جذبہ کو ابھارنا چکبست کی نظموں کا نصب العین ہے۔ اردو شاعری نے اب تک کوئی ایسا شاعر پیدا نہیں کیا جو چکبست کی طرح ہمیشہ اپنے وطن کی شراب محبت سے مست رہے اور سدا اسی کے گیت گائے۔ حب وطن اور قومیت کی تربیت و ترقی چکبست کی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ ان کی بعض نظمیں بادۂ حب وطن سے اس قدر لبریز ہیں کہ ان کو پڑھتے ہی قارئین و سامعین کے دل و دماغ پر قوم پرستی اور حب وطن کا ایسا زبردست نشہ طاری ہوجاتا ہے کہ وہ وطن کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ دل میں بہادری اور جوش کا ایسا دریا موجزن ہونے لگتا ہے جس کی روانی کو سخت سے سخت مصائب و مظالم

کے چٹان روکنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ خاک ہند، وطن کا راگ، آوازۂ قوم، مسز بسنت کی خدمت میں قوم کا پیغام وفا، فریاد قوم اور قوم کے سورماؤں کی الوداع وغیرہ اسی طرح کی پرجوش اور جذبات انگیز نظمیں ہیں۔

جذبات نگاری اور واقعہ کی مصوری میں بھی چکبست کو کمال حاصل تھا۔ ان کی نظموں کو پڑھنے سے دل پر وہ جذبات طاری ہو جاتے ہیں جو شاید اصل واقعہ کو بھی دیکھنے سے نہ طاری ہوتے۔ کسی واقعہ کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل واقعہ ہمارے سامنے گزر رہا ہے۔ 'راماین کا ایک سین' فریاد قوم اور وہ نظمیں جو سیاسی و قومی لیڈروں کی وفات پر لکھے گئے ہیں جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کے بہترین مرقعے ہیں۔

چکبست کی نیچرل نظموں کی تعداد اگرچہ کم ہے مگر جس قدر ہے وہ دلفریب قدرتی مناظر، اعلیٰ تخیل اور حسن بندش سے مرصع ہے۔ مناظر قدرت کا نقشہ وہ اس کمال کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ان کی دلکش تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ محاکات میں کمال اور زبان پر قدرت کاملہ حاصل ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری سراپا مصوری بن گئی ہے۔ خاک ہند، سیر دہرہ دون، جلوہ صبح، برسات، کرشن کنھیا اور گائے وغیرہ نظموں میں چکبست نے مناظر قدرت کے نہایت دلفریب اور وجد آور مرقعے پیش کئے ہیں۔ چکبست کی بعض نظموں مثلاً پھول مالا اور راماین کا ایک سین وغیرہ سے اعلیٰ اخلاق، وفا شعاری، ایثار، ہمدردی اور پاکیزہ جذبات کی ایسی تعلیم ملتی ہے جو ہم میر انیس اور دبیر کے مراثی میں پاتے ہیں۔

چکبست صحیح معنی میں سب سے بڑے قومی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ ہندوستان کی ملکی، قومی، تمدنی اور اخلاقی زندگی کی تربیت و اصلاح کرنا ہی ان کی شاعری کا نصب العین تھا۔ وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب و شائستگی کے مدح خواں اور قوم کی موجودہ پامالی اور خستہ حالی کی اصلاح و ترقی کے دل وجان سے خواہاں تھے۔ وہ نہ صرف وطن بلکہ وطن کی ہر شے سے محبت کرتے تھے۔ انھوں نے اسی جذبہ کے تحت اپنے کلام میں ایسے مناظر اور واقعات پیش کئے ہیں جو صرف ہندوستان ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تلمیحات، تشبیہات اور استعارات وغیرہ بھی ان تاریخی و مذہبی واقعات اور قدرتی مناظر سے متعلق ہوتے ہیں جن کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ دور از کار استعارے اور فرسودہ تشبیہوں کے استعمال سے انھوں نے گریز کیا ہے اسی وجہ سے وہ اپنی نظموں کی دلکشی و تاثیر کو غیر معمولی طریقے سے بڑھانے میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔

چکبست کی شاعری پر علماء کی رائیں

ڈاکٹر عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو فرماتے ہیں[۱] ایک ریسرچ کے طالبعلم کے ساتھ مجھے بھی چکبست کا کلام غور سے پڑھنا پڑا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ کیسا قادر الکلام شاعر ہے۔ زور بیان اور فصاحت زبان کے ساتھ خلوص اور درد بھی ہے۔ وہ ملک کی بے بسی اور خستہ حالی کو دیکھ کر بےچین

---

[۱] ماخوذ از کتاب "یادگار چکبست"

ہو جاتا ہے اور اس حال میں جو کچھ کہتا ہے اس کا ہر کلمہ اثر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ انگریزی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے مگر یورپ کا اندھا مقلد نہیں۔ وہ اپنے ملک کی معاشرت اور رسم و رواج سے خوب واقف ہے اور ان کے عیب چن چن کے دکھاتا ہے لیکن وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ نئے خیالات کی رو میں ہماری خوبیاں بھی بہ جائیں۔ وہ جذبات انسانی سے گہری واقفیت رکھتا تھا اور بعض اوقات نازک جذبات کے موقعے پر بڑی خوبی اور حسن سے ادا کر جاتا ہے۔ اس کا مشاہدہ بھی معمولی نہیں۔ وہ حقیقت اور واقعیت کو خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ تصویر کھنچ جاتی ہے۔ ۔۔۔ اس نے اپنے کلام سے اردو زبان کا مرتبہ بڑھا دیا اور اس کے ساتھ ہی اردو ادب میں اپنی جگہ قایم کر دی۔ بلاشبہ اس کا شمار ہمارے اساتذہ میں ہے"

نیاز فتح پوری فرماتے ہیں[1] "اگر میرا قیاس غلط نہیں تو شاید چکبست نے بھی سب سے پہلے ۱۸۹۶ء میں جب ان کی عمر پندرہ سال کی تھی مسدس ہی لکھا جس کا عنوان "جلوہ صبح" ہے اور جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک انیس سے متاثر تھے۔ آپ اگر اس نظم کو انیس کے کسی مرثیہ میں شامل کر دیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی اور کا کلام ہے۔۔۔۔ ان کے ابتدائی کلام کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی نظم وہ ہے جو نوجوانانِ کشمیر کے ایک سالانہ جلسہ میں اس پندرہ سال کے نوجوان کشمیری نے پڑھی تھی اور حیرت ہوتی ہے کہ اس کم سنی میں ایسے جذبات کہن سال کیونکر ان کے اندر پیدا ہو سکے اور بیان کی

[1] ماخوذ از کتاب "یادگار چکبست"

یہ قدرت کس طرح حاصل ہوئی۔ اس مسدس کی ابتدا بالکل انیس کے رنگ میں ہوتی ہے، وہی جوش، وہی شوکت، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی روانی ہے؟

اس مقالہ کے خاتمہ میں نیاز صاحب فرماتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ چکبست غزل گوئی کے لئے پیدا نہ ہوئے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کی ذہانت اور خوش ذوقی کا کمال تھا کہ جب اس زمین کی طرف توجہ کی تو وہاں کبھی آسمان کے تارے توڑ کر دکھا دیئے۔ آپ کا سارا کلام پڑھ جائیے کسی ایک جگہ بھی کوئی رکیک جذبہ یا لفظ نظر نہ آئے گا اور یہ خصوصیت چکبست کی اس انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے جس میں کوئی لکھنوی شاعر ان کا شریک نہیں"

منشی دیا نراین نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور لکھتے ہیں "چکبست کی زندگی میں کوئی قومی تحریک ایسی نہیں ہوئی جس نے ان کے شاعرانہ جذبات میں تلاطم برپا نہ کیا ہو جس سے ان کی شاعرانہ طبیعت متاثر نہ ہوئی ہو۔ بقول سر تیج بہادر سپرو ہندوستان کے ہموطنوں کے جو پر جوش اور پر درد جذبات چکبست کے زمانہ میں موجزن رہے ان کو انھوں نے شاعری کا جامہ پہنا کر اپنی زبان میں ادا کیا ہے جس کی تقلید یا تتبع کرنا غیر ممکنات سے ہے۔ ان کی سب نظموں میں قومیت اور حب وطن کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے انداز بیان کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے استعارے، تشبیہیں اور مناظر سبھی ایسے ہیں جو ہندوستان اور صرف ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری رستم اور اسفندیار کی داستان یا گل و بلبل کا افسانہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ارجن و بھیشم، اکبر و پرتاپ، گوتم و سرید اور گنگا، جمنا و ہمالہ

کا ذکر ہے۔"

چکبست ایک غزل کے خاتمہ میں لکھتے ہیں ؎

قدرداں کیوں مجھے تکلیف سخن دیتے ہیں میں سخنور نہیں شاعر نہیں استاد نہیں

لیکن یہ ان کا انکسار شاعرانہ ہے۔ ورنہ بقول نیاز فتح پوری حقیقت یہ ہے کہ ؎

"وہ سخنور بھی تھے شاعر بھی تھے استاد بھی تھے"

۴۔ مہاراج بہادر برقؔ دہلوی

حالات زندگی

منشی مہاراج بہادر ماہ جولائی ۱۸۸۴ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ شاہی زمانہ میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز تھے۔ ان کے دادا منشی خوب چند سکینہ آخری دور شاہی میں شاہی وکیل تھے۔ ان کے والد منشی ہرنراین داس حسرت ایک خوش فکر شاعر تھے۔ برقؔ کے نانا رائے دولت رام عبرتؔ ذوقؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ پرانے تذکروں میں ان کے حالات و اشعار ملتے ہیں۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ شاعری حضرت برقؔ کو ورثہ میں ملی

(۱) ماخوذ از مقدمہ مطلع انوار از چودھری جگت موہن لال رواں اناوی ص ۱۰۔۱۱

تھی تو غلط نہ ہوگا۔

اوائل عمر ہی میں برقؔ کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ عبرتؔ اور دیگر مشاہیر سخن کے صدہا اشعار ان کے نوک زبان تھے۔

شروع میں ان کے والد نے ان کو تعلیم میں ہرج ہونے کے خیال سے فکر سخن سے باز رکھا۔ ۱۹۰۳ء میں جب انھوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تو کبھی کبھی دلی کے مشاعروں میں شرکت کی اجازت ملنے لگی۔

۱۹۰۵ء میں برقؔ کے والد کا انتقال ہو گیا جس سے ان کی تعلیم نا تمام رہ گئی اور انھیں مجبوراً ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ چونکہ تحصیل علم کا بے حد شوق تھا اس لئے ۱۹۱۸ء میں انھوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ دوسرے سال ایف اے اور ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ بعد ازاں ۱۹۲۲ء میں سب آرڈینیٹ اکاؤنٹ سروس کے ڈپارٹمنٹل امتحان میں کامیابی حاصل کی اور پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں سپرنٹنڈنٹ کے جلیل القدر عہدہ پر ممتاز ہوئے۔

ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی ان کی طبیعت شعر و سخن اور مطالعۂ کتب کی طرف مائل تھی۔ ابتدائی زمانہ میں انھوں نے کچھ غزلیں داغؔ کو بعدہٗ آغا شاعر قزلباش دہلوی کو دکھائی تھیں۔ مگر ان کا تلمذ برائے نام تھا۔ ان کی طبیعت غزل گوئی کی بہ نسبت ادبی، اخلاقی اور نیچرل نظموں کی طرف زیادہ مائل تھی۔ طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ طباعی کا یہ عالم تھا کہ فی البدیہہ نظمیں اور غزلیں کہتے تھے۔ صاحب تلامذہ تھے۔ تشن چندر روشن وکیل پانی پتی اور

تبش چند رکسینہ بی۔ اے دہلوی برق کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی نظمیں زمانہ، ادیب، العصر اور مخزن وغیرہ مشہور ادبی رسالوں میں شایع ہوا کرتی تھیں۔ ان کی دل آویز نظموں کا پہلا مجموعہ "مطلع انوار" ۱۹۲۹ء میں شایع ہوا۔

کرشن درپن برق کی دوسری مشہور مطبوعہ تصنیف ہے۔ یہ کتاب ان کے جوش عقیدت اور دلی جذبات میں ڈوبی ہوئی ان نظموں کا مجموعہ ہے جنھیں انھوں نے کرشن بھگوان کے متعلق لکھی تھیں۔

افسوس کہ حضرت برق کی عمر نے وفا نہ کی۔ وہ ۹ فروری ۱۹۳۶ء کو ڈھلتے ہوئے شباب کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی چند نظموں اور منتخب غزلوں کا ایک دوسرا مجموعہ ان کی وفات کے پانچ سال بعد ۱۹۴۱ء میں "حرف ناتمام" کے نام سے تیش چند رکسینہ طالب دہلوی نے طبع کرایا۔ یہ دوسرا مجموعہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں برق کی ۴۳ نظمیں، چند قطعات اور منتخب غزلیں شامل ہیں۔ ان کی غزلوں کا انتخاب باغ و بہار کے عنوان سے صفحہ ۵، سے صفحہ ۱۲۸ تک دیا گیا ہے۔ برق کی غزلوں کا دیوان "تجلیات برق"، ۱۹۴۱ء تک طبع نہ ہو سکا تھا۔ یہ ضخیم دیوان اور کچھ نظموں کا مجموعہ ان کے وارثوں کی کفالت میں ہے۔

مطلع انوار میں نیچرل، اخلاقی، ادبی، قومی، تاریخی و مذہبی وغیرہ ہر نوع کی نظمیں ہیں۔ زیادہ تر نظمیں مظاہر قدرت سے متعلق ہیں۔ ان میں حسن فطرت، ستارۂ صبح، کرشمہ قدرت، گنگاجی، بسنت رت، تارے، تاروں بھری رات، ماہ تاباں، شب ماہتاب، شام، برسات کی شام، برسات اور مناظرہ کوہ اور فسانہ

بہار وغیرہ نظمیں ہیں۔ قومی اور تاریخی نظموں میں ہندوستان جنت نشان،
راجکماری پنا، اہل ہند، تیغ ہندی، پدمنی کا جوہر، زیب النسا کی قبر وغیرہ
نظمیں شامل ہیں۔ اخلاقی اصلاحی نظموں میں نالۂ بیوہ، یتیموں کی فریاد، اچھوتوں
سے نفرت فضول ہے اور مذہبی نظموں میں بن باسیوں کی وطن میں آمد، دسہرہ،
بھرت ملاپ، دیپ مالا، گرو نانک، کرشن سداما اور فلسفہ گیتا وغیرہ شامل ہیں۔
ان کی مذہبی نظموں میں بھی ہر مذہب و ملت کے آدمی کے لئے ذوق ادب اور دلکشی
کا کافی سامان موجود ہے۔ گیارہ نظمیں ایسی ہیں جو انگریزی، ہندی یا فارسی نظموں
کے ترجمے ہیں۔

حضرت برق کی سب سے پہلی نظم "کار خیر" جنوری ۱۹۰۸ء میں "عمل خیر"
کے عنوان سے رسالہ زبان دہلی میں شایع ہوئی جو بہت پسند کی گئی۔ اس نظم
میں حسن بیان اور زور طبیعت قابل داد ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے — شریک درد دل ہو کر کسی کا دکھ بٹایا ہے
کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اٹھایا ہے — پرائی آگ میں پڑ کر کبھی دل بھی جلایا ہے

کبھی آنسو بہائے ہیں کسی کی بدنصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ہے مفلس کی غریبی پر

"حسن فطرت" کے عنوان سے جو نظم برق نے لکھی ہے اسے پڑھنے سے ایسا
معلوم ہوتا ہے گویا شاعر کی پرواز تخیل اور وسعت نظر کے لئے زمین و آسمان
دونوں کم پڑتے ہیں، شدت احساس و جذبات الفاظ سے پھوٹے پڑتے ہیں۔
محض دو بند ملاحظہ ہوں ؎

اک جلوہ گہ حسن ہے یہ عالم اسباب — نظارہ بداماں ہے رخ مہر جہاں تاب
ہے چادر مہتاب کہ اک نور کا سیلاب — ہر اختر تابندہ ہے رشک دُر نایاب

ہے وسعت دامان خلا حسن سے لبریز
آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حسن سے لبریز

معمور لطافت سے ہے دنیائے نباتات — ہر گل میں نئی بو ہے نیا رنگ نئی بات
ہر پیکر تصویر میں ہیں حسن کے ذرات — نیرنگیٔ جلوہ ہے اسی شے کی کرامات

ہر نقش دل آویز ہے ندرت کا مرقع
اعجاز قلمکاریٔ قدرت کا مرقع

نظم "ستارۂ صبح" کا ایک بند ملاحظہ ہو:-

شب گزشتہ کے جلووں پر اشکبار ہے یہ — اداس صورت شمع سر مزار ہے یہ
خزاں نصیب کوئی غنچۂ بہار ہے یہ — نظر کو پیرہن نور میں بھی خار ہے یہ

چراغ کشتہ ہے بام سپہر اخضر پہ
یہ داغ ہے فلک نیلگوں کی چادر پہ

"کرمک شب تاب" (جگنو) کے عنوان پر ڈاکٹر اقبال سے لے کر دور جدید کے تمام نظم گو شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ حضرت برق کے لئے دوسرے شعرا کی تشبیہات سے بچ کر نئی تشبیہات تلاش کرنا ایک دشوار بات تھی مگر اس امر میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس نظم کو پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ زبان کی فصاحت و سلاست اور بندش کی چستی و صفائی کے ساتھ تشبیہات کی جدت طرازی قابل داد ہے۔

پرتو نور ہے یا شمع شب افروز ہے تو | آتش حسن کا یا پارۂ دلسوز ہے تو
یا ہے غلطیدہ ہوا میں در شبنم کوئی | شرر آتش گل یا ہے مجسم کوئی
خندۂ جام بلوریں ہے ہوا میں پرآں | گرم پرواز ہے یا پرتو شاخ مرجاں
محو پرواز یہ لعل یمنی ہے شاید | اڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید
شمع رخسار گل تر کا جو دیوانہ ہے | پیرہن نور کا پہنے ہوئے پروانہ ہے
آتش حسن کی اڑتی ہوئی چنگاری ہے | شب تاریک میں جو محو ضیا باری ہے
چشمک برق کا یہ نقش توہم تو نہیں | غنچۂ نیم شگفتہ کا تبسم تو نہیں
برق رخسار کا یا جلوۂ بیتاب کہوں | اس کو اڑتا ہوا اک قطرۂ سیماب کہوں
کسی ناشاد کی آہوں کا شرار تو نہیں | آسماں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں

نظم "بہار شفق" میں بھی برقؔ نے نادر تشبیہات کی تلاش کر کے اپنے تخیل کی پرواز کے جوہر خوب دکھائے ہیں۔ برقؔ نے اپنی متعدد نظموں میں انگریزی چو مصرعے (COUPLET) کی تقلید کی ہے جس میں پہلا، تیسرا اور دوسرا و چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ یہ نظم بھی اسی نوع کی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

ہے جلوۂ بہار شفق آسمان پر | صہبائے سرخ یا یہ خم نیلگوں میں ہے
پردے سے مہر جلوہ فگن ہے جہان پر | یا برق بے قرار تڑپ کر سکوں میں ہے
پہنے قبائے سرخ کوئی لالہ فام ہے | یا روئے آتشیں کا ہے جلوہ نقاب میں
یا چرخ فتنہ ساز یہ آتش بجام ہے | یا آفتاب ڈوب گیا ہے شباب میں

"نسیم صبح" ایک نہایت دل کش نظم ہے جس میں دس بند ہیں۔ اس نظم

؎ اس دل آویز نظم کے بقیہ ۱۲ شعر مطلع انوار ص ۱۲ پر ملیں گے۔

میں "نسیم صبح" کو شخصیت کا رنگ دے کر اس کی دلچسپی و تاثیر میں بیحد اضافہ کیا گیا ہے۔ محض دو بند ملاحظہ ہوں۔

تو چمن میں آئی عشق گل کا دم بھرتی ہوئی
چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
پھر دہی برتی ادائیں روز کی برتی ہوئی
گل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

آتے ہی صحن چمن گلزار تو نے کر دیا
گرم حسن وعشق کا بازار تو نے کر دیا
سبزۂ خوابیدہ کو بیدار تو نے کر دیا
نرگس بدمست کو ہشیار تو نے کر دیا
تیرے کیف آمیز جھونکے کان میں کیا کہہ گئے
ہونٹوں ہی ہونٹوں میں غنچے مسکرا کر رہ گئے

نظم "صبح امید" کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

ہر طرف ہوتا ہے جب غم کی گھٹاؤں کا ہجوم
دل سے ہو جاتا ہے نقش رنج راحت معدوم
زندگی ہوتی ہے جب موت سے بدتر معلوم
یاس افزا نظر آتی ہے حیات موہوم
اس کے جلوے کی جھلک راحت جاں ہوتی ہے
روشنی کا شب حرماں میں نشاں ہوتی ہے

بسنت رت پر برق نے متعدد دل آویز نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن جنوری ۱۹۲۶ء کی تاریخ میں جو نظم انھوں نے لکھی ہے وہ بیحد دلکش اور موثر ہے۔ اس سحر آمیز نظم کے صرف چار بند ملاحظہ ہوں:۔

بسنت رت کیا جہاں میں آئی پیام دورِ بہار آیا
نظر ہے مست شراب جلوہ کہ روئے گل پر نکھار آیا
اچھوتی کلیوں کے بھی لبوں پر تبسم بے قرار آیا
نئے رنگوں نے گھلانے گویا یہ موسم خوشگوار آیا

نصیب سبزہ کے جاگ اٹھے ہیں ستارے ہے اوج پر چمن کا
جما ہے نقشہ روش روش پر شگفتہ پھولوں کی انجمن کا

کھلے ہیں ٹیسو کے پھول بن میں ضیا فگن ہے شفق زمیں پر
چنے ہیں قدرت نے سبز شاخوں پہ شیشہ ہائے شراب احمر
جب ان پہ پڑتی ہے ہلکی ہلکی شعاعِ سیمیں ماہ انور
مرقعِ شان دلفریبی دکھاتا ہے جانفروز منظر

لگائے صحرا کو لعل اس نے جو وجہ زیبائش چمن ہے
نہال فطرت کے فیض سے ہے زمیں گلزار ہے کہ بن ہے

نسیم گلشن ہے کیف پرور ہوا ہے ڈوبی ہوئی اثر میں
نمو کی تاثیر ہے یہ یکسر کہ تازگی ہے رگِ شجر میں
خوشی سے پھولیں نہ کیوں گل تر قبائے زریں سجے بریں
عجیب فرحت فزا ہے منظر بسی ہیں رنگینیاں نظر میں

سماں یہ سرسوں کے کھیت کا ہے کہ زعفران زار کھل رہا ہے
فضا میں کندن دمک رہا ہے سرور آنکھوں کو مل رہا ہے

کنول کے پھولوں سے ہو رہے ہیں کہیں لب جو چراغ روشن
ہے انکی رنگیں اداؤں سے منقش آب رواں کا دامن
ہوا کی مسرور جنبشوں سے یہ گل جو ہوتے ہیں عکس افگن
مصفا پانی کے آبگینے میں لہریں لیتا ہے روئے گلشن

نظارہ دلکشا ہے ہر سو جو سین ہے جاذب نظر ہے
بسنت رت کے ہیں سب کرشمے بہار ذروں میں جلوہ گر ہے

اس دلکش نظم کی شان میں رواں اناوی فرماتے ہیں کہ "کاش ہمارے اردو شعراء اس قسم کے موضوع پر اپنی توجہ مبذول فرماتے تو ان کو فرہاد کے ساتھ کوہ کنی اور مجنوں کے ساتھ دشت نجد کی خاک چھاننے کی ضرورت نہ باقی رہتی۔ برق نے اپنی نظموں کو ہندوستانی گل بوٹوں اور اشیاء سے سجا کر انھیں بے حد دلکشی اور تاثیر بخشی ہے۔

برق کی جملہ نیچرل نظمیں دل آویزی میں ایک سے ایک بڑھ کر ہیں کسی نظم کو نظر انداز کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ نظم شب ماہتاب کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

مہر جہاں فروز نے رخ پہ جو لی نقاب شام
بام سپہر پر ہوا جلوہ فگن مہ تمام

چشمۂ نور ابل پڑا دامن چرخ پیر میں
موج ضیا نہیں ہے یہ جوش ہے جوئے شیر میں

تار شعاع نے عجب مژدۂ جانفزا دیا
تابش فرح بخش نے دل کا کنول کھلا دیا

دامن دشت و کوہ پر بچھ گیا فرش نور کا
چشم نظارہ باز میں جلوہ ہے برق طور کا

زریں ہیں سقف و بام و در چمکے ہیں سب شجر حجر
جس طرف اٹھ گئی نظر رنگ ملا ہے سر بسر

برق نے متعدد قومی اور ملکی نظمیں نہایت موثر اور لطیف انداز میں لکھی

ہیں۔ ان میں "ہندوستان جنت نشان" نظم نہایت دل آویز ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں:۔

ہندوستان مایۂ ناز جہاں ہے تو ۔ چشم و چراغ محفل کون و مکاں ہے تو
روئے زمیں پہ خطہ جنت نشاں ہے تو ۔ اپنا عدیل آپ تہہ آسماں ہے تو

ہے جلوہ گاہ حسن ازل سرزمیں تری
آئینہ تجلی وحدت جبیں تری

ہے تیری خاک پاک کا دہ رتبۂ گراں ۔ ذروں سے جس کے جوہر تقدیس ہے عیاں
ہے سجدہ گاہ خلق ترا سنگ آستاں ۔ سچ ہے اگر کہیں تجھے سرتاج کشوراں

روشن چراغ دید مقدس یہیں ہوا
آہن طلا ہو جس سے وہ پارس یہیں ہوا

گنگ و جمن ہیں کوثر و تسنیم کا جواب ۔ ہے جن کے آگے چشمۂ حیواں بھی آب آب
سیل رواں کی دید کے قابل ہے آب و تاب ۔ ہے شور موج میں اثر نغمۂ رباب

باہر بیاں سے ہیں جو ان میں صفا ہیں
تر دامنوں کے حق میں یہ آب حیات ہیں

برق کی بعض نظمیں زور، تاثیر اور پیرایۂ بیان کے لحاظ سے میر انیس کے مشہور مراثی کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ چنانچہ ایسی ایک نظم تیغ ہندی کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

غیرت برق شرر بار جھلک ہے تیری ۔ جس سے خیرہ ہوں نگاہیں وہ چمک ہے تیری
دست غیبی جسے کہتے ہیں کمک ہے تیری ۔ دھوم دنیا میں تو کیا تا بہ فلک ہے تیری

صاف کرتی صفِ دشمن تو جدھر چلتی ہے
ہاتھ باندھے تیرے سائے میں ظفر چلتی ہے

حزنیہ نظموں میں "زیب النساء کی قبر" اور "نالۂ بیوہ" کے عنوان سے برق نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ نہایت موثر اور رقت آمیز ہیں۔ نظم "زیب النسا کی قبر" کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

گنبد ہے مقبرہ ہے نہ لوحِ مزار ہے — تعویذِ قبر کا بھی ہے مٹتا ہوا نشاں
نے شمع ہے نہ چادرِ گل ہے نہ قبر پوش — مٹی کا ایک ڈھیر ہے عبرت کی داستاں
ویرانیٔ لحد ہے مجاورِ سرِ مزار — زائرہجوم یاس تباہی ہے پاسباں
اڑتی ہے خاک اور برستی ہے تیرگی — چھایا ہوا ہے حسرت و اندوہ کا سماں
روتی ہے بیکسی سرِ بالیں کھڑی ہوئی — تربت پہ کس مپرسی کا عالم ہے نوحہ خواں
بادِ صبا چڑھاتی ہے چادر غبار کی — ہیں ذرہ ہائے ریگِ بیاباں گہر فشاں

"نالۂ بیوہ" کا ایک بند ملاحظہ ہو :-

میری قسمت سے نہیں چرخِ بریں کو اتفاق — آفتِ جانِ حزیں ہے صدمۂ دردِ فراق
ماتمِ شوہر کا صدمہ کیوں نہ گذرے دل پہ شاق — وہ مری آنکھوں سے اوجھل میں سراپا اشتیاق
ہجر میں ہوتا ہے صدمہ آرزوئے دید پر
صبر آئے مجھ سیہ بخت کو کس امید پر

برق صحیح معنی میں مصورِ فطرت تھے۔ ان کی وہ تمام نظمیں جن میں انھوں نے فطرت کی عکاسی کی ہے نہایت دلچسپ اور موثر ہیں۔ برق کے روح پرور کلام کا مزید نمونہ پیش کرنا طوالت کے خوف سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ راقم اب

ان کی ایک نہایت دل آویز اور مرصع نظم "جوشِ بہار" کے دو بند پیش کر کے نمونۂ کلام ختم کرتا ہے۔

گھرا ہوا سرِ فلک جو ابر قطرہ بار ہے — خزاں پہ اوس پڑ گئی چمن چمن بہار ہے
گلوں کے روئے صاف پر کمال کا نکھار ہے — ورق ورق ہے خوشنما نظر نظر نثار ہے
جمی تھی برگ برگ پر جو گرد آب وہ ڈھل گئی
کلی کلی نکھر گئی گرہ دلوں کی کھل گئی

نمو کا آشکار ہے بساطِ خاک سے نشاں — بچھا ہے فرشِ مخملی گیاہ نو سے ہے عیاں
اگل رہی ہے لعل اب زمینِ باغ بیگماں — روش روش کھلے ہیں گل چمن ہے رشکِ جناں
کلی ہے نیم وا کوئی دلہن ہے یا حجاب میں
کھلا ہوا ہے نیم رخ ہے نیم رخ نقاب میں

انتخابِ غزلیات[1]

زمینِ شعر کی زینت کے واسطے اے برق
ستارے توڑ کے لائے ہیں آسماں سے ہم

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی — میں چمن زارِ جہاں میں گلِ صحرائی تھا
بہتر ہے مجھے دارِ فنا میں جاوداں ہونا — مری ہستی کا تا ممکن ہے نقشِ رائیگاں اپنا
دو عالم میں نظر آتا ہے جلوہ سر بسر اپنا — تماشا دیکھتا ہے آپ حسنِ خود نگر اپنا
چشمِ نظارہ باز حقیقت نگر نہیں — ورنہ جدا ہیں قطرہ و موج و حباب کب

---

[1] انتخاب از "حرفِ ناتمام" مصنفہ برق دہلوی صفحہ ٧٥-١٢٨

قایم ہے بعد مرگ تسلسل حیات کا
ہستی کا نیستی سے ہوا سدِ باب کب

جز خموشی کچھ نہیں فریادِ بلبل کا جواب
ایک چپ سو کو ہراتی ہے یہ ہے گل کا جواب

انھیں کو ہم جہاں میں رہروِ کامل سمجھتے ہیں
جو ہستی کو سفر اور قبر کو منزل سمجھتے ہیں

جو ہیں جانباز کب مشکل کو وہ مشکل سمجھتے ہیں
شناور موجِ طوفاں خیز کو ساحل سمجھتے ہیں

رہیں دستِ گلچیں فنا ہے ہر گل ہستی
خزاں کا رنگ ہے گلزارِ عالم کی بہاروں میں

نہ مژگاں سے وفورِ ضبط نے ڈھلنے دیئے آنسو
یہ دریا غرق ہو کر رہ گیا اپنے کناروں میں

بند آنکھیں تھیں تو دنیا تھی مرے پیشِ نظر
کھل گئیں آنکھیں تو پھر یہ خواب کی محفل نہ تھی

سراپا بے خطا ہوں اور وہ خنجر کشاں پھر بھی
بہ رنگِ شمع ہوں خاموش کٹتی ہے زباں پھر بھی

یہی دو چار تنکے کائنات آشیاں کیا ہے
جلانے کے لئے تیار ہے برقِ طپاں پھر بھی

اٹھانے کو فلک سر پہ اٹھا لیں اپنے نالوں سے
مگر یہ خوف ہے رہنا ہے زیرِ آسماں پھر بھی

مری ہر کوشش برباد پر تقدیر ہنستی ہے
نہیں چھٹتا ہے مجھ سے سعیِ رائیگاں پھر بھی

دل جو صورت گرِ معنی کا صنم خانہ بنے
آنکھ جس شے پہ پڑے جلوۂ جانانہ بنے

اتنے ہی ہو گئے ہم منزلِ عرفاں کے قریب
جس قدر رسم و رہِ دہر سے بیگانہ بنے

خم کدہ مجھ بادہ کش کا گنبدِ اخضر بنے
کاسۂ خورشید بھر کے کشتیِ ساغر بنے

پھر دیا فطرت نے ذروں میں جمالِ دلفریب
یہ زمیں پہ لالہ و گل چرخ پہ اختر بنے

ہو اگر نظارۂ فطرت سے دل کیف آشنا
برقِ رنگینیِ شفق کی بادۂ احمر بنے

آفریں اے صانعِ قدرت ترے اعجاز پر
رقص کرتا ہے نظامِ دہر تیرے ساز پر

نیم مست آنکھیں پھر اس پر سرمۂ دنبالہ دار
سان رکھ لی آپ نے تیغِ نگاہِ ناز پر

عشق رسوا ہوا عالم میں بشکلِ مجنوں
حسن پردہ میں رہا لیلیٰ محمل ہو کر

محو ہے سارا جہاں نیرنگ دنیا دیکھ کر
کس قیامت کی کشش نظارۂ باطل میں ہے

اشک ریزی اس کی فطرت ہے بدل سکتی نہیں
قبرِ بیکس پہ جلے یا شمع محفل میں جلے

جنبش پیہم میں ہے رازِ ثباتِ زندگی
کب سکوں موجِ رواں کو دامنِ ساحل میں ہے

نظر نظر تری ڈوبی ہوئی شراب میں ہے
جہانِ کیف تری چشمِ نیم خواب میں ہے

اٹھا وہ ابرِ کرم برق میکدے چلئے
کہ لطف بادہ کشی دامنِ سحاب میں ہے

تری معصومیت اے عہدِ طفلی یاد کرتا ہوں
بلائے جاں ہے بدمستی شباب فتنہ ساماں کی

بساطِ خاک پر کیا ہیں نقوشِ لالہ و سنبل
قلمکارِ حقیقی کی یہ ہیں تحریر کے ٹکڑے

تپِ فرقت یہ دل سے تا زباں آئی ہے رک رک کر
ہوئے ہیں ضعف سے کیا آہ بے تاثیر کے ٹکڑے

نئے قالب میں فیضِ ابرِ تر سے پھر شگفتہ ہیں
جو گل مرجھا گئے تھے شاخ پر اگلی بہاروں میں

دل تری زد پر نگاہِ فتنہ ساز آہی گیا
بچتے بچتے بھی تہِ شمشیرِ ناز آہی گیا

ہوتے ہوتے ہو گئی آخر حقیقت بیں نظر
آتے آتے راہ پر عشقِ مجاز آہی گیا

برق کے کلام پر مقتدر اہل قلم کی رائیں

چودھری جگت موہن لال رواں اناوی فرماتے ہیں[۱] " اقبال، محروم اور تسکین۔ اختر اور شوق قدوائی، شاد حیدرآبادی، چکبست لکھنوی اور عزیز لکھنوی سے جو سلک مروارید مرتب ہوتی ہے اسی کے ایک درخشندہ گوہر جناب برق دہلوی ہیں۔۔۔ جناب برق کی نظر اسی طرح وسیع اور ہمہ گیر ہے اور کلام میں وہی زور و تاثیر ہے۔ وہ اپنے صحیح اور سچے جذبات صاف، موثر اور

[۱] مقدمہ مطلع انوار ۱۳، صفحہ ۲۹، ۳۰

پاکیزہ زبان میں ادا کرتے ہیں ---- ان کی نظر بحد وسیع، ان کی طبیعت
دردمند اور دل احساسات سے لبریز ہے۔ ان کی مذہبی نظموں میں بھی کہیں
تعصب، تنگ خیالی اور کوتاہ نظری کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

غرض کہ ایک ہی نہیں جملہ نیچرل نظمیں جو اس مجموعہ میں ہیں اپنے دامن
میں ایک طرف شاعری کے جواہر پارے لئے ہیں تو دوسری جانب زبان ومحاورات
کے صحیح کارنامے۔ ایک جانب جذبات فطری سے مالامال ہیں تو دوسری طرف
جدت و بلندی تخیل کا دریا موجیں مار رہا ہے۔ ایک طرف فلسفہ حیات کی
تشریح ہے تو دوسری جانب اسرار حقیقت کی توضیح۔ ایک جانب قوت تخیل
کی بہترین مثالیں ہیں تو دوسری جانب پاکیزہ تشبیہات ونادر استعارات کی
عجیب و غریب تمثیلیں۔ کہیں جلوہ فطرت نور بار ہے کہیں ہنگامہ قدرت آشکار۔"

منشی اصغر حسین اصغر گونڈوی برق کے متعلق فرماتے ہیں[1] "یادش بخیر دلی
نے اپنے عہد ماضی میں کیا کیا بلند مرتبت ہستیاں تیار کی تھیں۔ آج ایک مدت
کے بعد اس کی خاک سے پھر ایک شرارہ بلند ہو کر ستارے کی طرح افق شاعری
پر نمودار ہوا ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کا کافی و مناسب جوش و خروش
سے خیر مقدم کریں گے۔"

علامہ کیفی برق کے مرتبہ سخن کے متعلق تحریر فرماتے ہیں[2] "وہ ہر موضوع
سخن میں رنگینی ادا بھر دیتے ہیں۔ تخیل بلند ہے مگر پادر ہوا نہیں۔ ان کے
تخیل کے پاؤں زمین پر رہتے ہیں اکھڑتے نہیں۔ ---- برق کے کلام میں ہر قسم

۱۔ دیباچہ مطلع انوار، ۲۔ "حرف ناتمام" مجموعہ کلام برق دہلوی ص ۱۱۸

کے موضوع ملتے ہیں۔ داخلی بھی اور خارجی بھی۔ وہ تخیل پردازی اور منظر نگاری دونوں میں برق تھے۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان تھی ---- شہر میں نظم گوئی کا چرچا انھیں کے دم سے تازہ ہوا اور عام لوگوں کے مذاق نے غزل کے سوا اور اصناف خاص کر قومی اور وطنی رنگ کی نظموں کا اثر لینا شروع کیا۔"

مسٹر آصف علی بیرسٹرایٹ لا برق کی شاعری کے متعلق تحریر فرماتے ہیں[۱]۔ ہزار افسوس کہ مہاراج بہادر برق کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ نہ معلوم اور کتنا خزانہ اس معدن سخن سے نکلتا اور اردو کو مالا مال کرتا۔ دہلی اور دہلی والے ہی نہیں، اردو کے حامی مرحوم کے کلام پر جتنا ناز کریں بجا ہے۔ مہاراج بہادر دلی کی وہ ستھری زبان لکھتے تھے جو سند مانی جاتی تھی ---- برق پیدائشی اور خاندانی شاعر تھے۔ طبیعت کی موزونی ان کا ورثہ تھا اور ذوق سخن کی تجلی ان کے رگ و پے میں دوڑتی تھی۔ حالات کے ناموافق ہونے کے باوجود ان کی فطرت نے اپنے ورثہ اور امانت کو اوجھل نہ ہونے دیا اور آخر ان کی شاعری کی بجلی چمک کر رہی۔"

حضرت برق اردو کے بلند مرتبت نظم نگار شعرا سرور، اقبال، چکبست، جوش اور محروم وغیرہ کی صف میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ سرور اور چکبست کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت وطن کی محبت اور قومی جذبات کو ابھارنا ہے۔ ڈاکٹر اقبال اردو کے سب سے بڑے نظم نگار شاعر ہوئے ہیں۔ شروع میں انھوں نے وطن اور حب وطن کے متعلق نظمیں لکھ کر شہرت عام حاصل کی۔

---

[۱] حرف ناتمام ص۳۲، ۳۳

بعد کو وہ محض ایک قومی اور پیامی شاعر بن گئے۔ جوش ملیح آبادی شاعرِ انقلاب کہے جاتے ہیں۔ مخدوم کی شاعری کی خصوصیت صلح و محبت کی تلقین اور مناظرِ قدرت و جذبات غم کی عکاسی کرنا ہے۔ برق صحیح معنی میں مصورِ فطرت کہے جاتے ہیں۔ اپنی مذہبی اور نیچرل نظموں کے لئے وہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔ حالانکہ برق ایک اعلیٰ پایہ کے غزل گو بھی تھے مگر جس چیز نے انھیں مقبولیت عام اور بقائے دوام ملی ہے وہ ان کی روح پرور اور کیف آگیں نظمیں ہیں۔ ان کی کوئی نظم ایسی نہیں ہے جو زورِ کلام اور تاثیر و لطافت سے خالی ہو۔ ان کا سارا کلام حسن تخیل، لطافت زبان اور جدت بیان سے مزین ہے۔

برق نے نیچرل، قومی، وطنی، تاریخی، اصلاحی اور مذہبی وغیرہ ہر نوع کی متعدد نظمیں لکھی ہیں جو جدت تخیل، پرواز تصور، شدت جذبہ، زور بیان اور لطافت زبان سے بھری ہوئی ہیں۔ انھوں نے گلزارِ سخن میں ایسی ایسی شگوفہ کاریاں کی ہیں اور ایسے ایسے گلہائے مضامین کے انبار لگائے ہیں جن کی شگفتگی و تازگی کبھی کم نہ ہوگی اور جو اربابِ نظر سے ہمیشہ خراج تحسین حاصل کرتی رہیں گی۔ بقول علامہ کیفی دہلی شہر میں نظم گوئی کا چرچا انھیں کے دم سے تازہ ہوا۔ ان کی تقلید میں اکثر شعرا نے غزل گوئی کے علاوہ نظم گوئی میں خاص دلچسپی لینا شروع کیا۔

برق نے اپنے کو ایک شعر میں گل صحرائی کہا ہے جس پر کسی کی آنکھ نہیں پڑی۔

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی

میں چمن زار جہاں میں گل صحرائی تھا

مگر حقیقت یہ ہے کہ برق گلزار سخن کے ایسے مایہ ناز پھول ہوئے ہیں جس کی شمیم جانفزا کبھی زائل نہ ہوگی مشام جاں کو سدا معطر کرتی رہے گی۔

۵۔ چودھری جگت موہن لال رواںؔ آناوی

رواں کا شمار دورِ جدید کے چوٹی کے شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۴ر جنوری ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں وہ اپنے والد چودھری گنگا پرشاد (قوم کایستھ سریواستو) کے سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد رواں اپنے بڑے بھائی کنہیا لال کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۹۰۷ء میں مورادآباد ہائی اسکول سے انٹرنس کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ۱۹۱۱ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے پاس کیا۔ خداداد ذہانت اور طبعی شوق سے ہر امتحان میں ہمیشہ درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کتب بینی کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ شاید ہی انگریزی کا کوئی مایہ ناز شاعر ایسا ہو جس کا کلام رواں نے ابتدا سے انتہا تک نہ پڑھا ہو۔ ادب انگریزی کے ساتھ فارسی شعراء کا کلام بھی دیکھتے رہے۔

۱۹۱۶ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر کے مستقل طور پر اناؤ میں قیام کیا اور پیشۂ وکالت شروع کی۔ اناؤ کے سربرآوردہ اور بااثر وکیلوں میں ان کا شمار تھا۔ وکالت کو ایک مجبوری کا فریضہ سمجھتے تھے۔ خاص دلچسپی کا

مشغلہ صرف شاعری تھی۔ نہایت منکسر، نیک دل اور حلیم الطبع انسان تھے۔

رواںؔ ایک وہبی شاعر تھے۔ ان کی طبع بچپن ہی سے شاعری کی طرف مائل تھی۔ تعلیم کے ساتھ شاعرانہ قوت بڑھتی گئی۔ مطالعہ اور فلسفیانہ قوت نے اسے معراج کمال پر پہنچا دیا۔ ۱۹۰۶ء میں وہ لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ اناؤ ایسے چھوٹے شہر میں شاعری کا ماحول نہ ہونے کے باعث ہی غالباً رواںؔ نے یہ شعر کہا تھا۔

گل ویرانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدرداں میرا
تو ہی دیکھا اے مرے خلاق حسن رائیگاں میرا

رواںؔ کا ایک مجموعہ کلام ۱۹۳۸ء میں روح رواں کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی نے "روح رواں" پر ایک نہایت گرانقدر مقدمہ لکھا ہے۔ رواںؔ کی رباعیات کا ایک مجموعہ بھی ادبی مرکز لاہور سے طبع ہوا ہے۔ وہ ایک مثنوی "گوتم بدھ" کے عنوان سے لکھ رہے تھے کہ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں محض ۴۵ سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کرنا پڑا۔

رواںؔ کا مجموعہ کلام 'روح رواں' ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صفحہ ۷۹ تک تیس نظمیں درج ہیں، صفحہ ۸۱ سے صفحہ ۱۲۳ تک غزلیات، صفحہ ۱۲۵ سے صفحہ ۱۳۱ تک قطعات اور صفحہ ۱۳۲ سے ۲۱۲ تک رباعیات ہیں۔

نظموں میں معمائے فطرت، تتلی، لاوارث بچہ، شاعری، چترکوٹ، گنگا کنارے کی شام اور دو آئینے وغیرہ عمدہ اور دل آویز نظمیں ہیں۔

'معمائے فطرت' ایک عمدہ نظم ہے جس میں رواں نے مناظر قدرت کی دلفریبیوں اور نیرنگیوں سے خلاق عالم کے وجود کو شاعرانہ پیرایہ میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ قمر یہ مہر یہ تارے یہ رنگ آسماں — یہ زمیں یہ باد و باراں یہ شفق کی سرخیاں
یہ چمن یہ پھول یہ پتے یہ پھل یہ سبزہ زار — یہ لب جو یہ سمندر یہ فضائے کوہسار
یہ جبل یہ دشت یہ ہامون یہ ریگ و خاک و سنگ — یہ سحاب و برق یہ موسم یہ ابر رنگ رنگ
آخر ان چیزوں میں وجہ ربط باہم کون ہے — خود اگر پیدا نہیں خلاق عالم کون ہے
برتر از دنیائے فانی کوئی ہے بھی یا نہیں — اس بھری محفل کا بانی کوئی ہے بھی یا نہیں
چل رہی ہیں ہر طرف کیونکر عناصر کی کلیں — جل رہی ہیں کس طرح شمس و قمر کی مشعلیں
خود بخود چلتی ہیں یا ان کو چلاتا ہے کوئی — آپ ہی جلتی ہیں یا ان کو جلاتا ہے کوئی

رواں کی نظم بعنوان "شاعری" ان کے تمام مجموعہ نظم کی روح اور اعلیٰ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس نظم کا ایک ایک ٹکڑا نہایت معنی خیز اور بلند ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

شاعری کیا ہے اک احساس قوانین وجود — دل کے جذبات کا اظہار بتائید قیود
برہمن ہے دل شاعر بت فطرت معبود — جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حسن نمود

جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینہ پہ تصویر اتر آتی ہے

دل ہے شاعر کا کہ اک منزل انوار جمال — اور جولانگہ دل وسعت میدان خیال
نغمہ زن ہوتا ہے جب مست سخن طائر قال — بزم فطرت میں ہر ایک چیز کو آجاتا ہے حال

کوہ جھک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے
چشمے رک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

پیاری اردو تری محفل میں سخنور کم ہیں
سنگریزے تو بہت ہیں مگر گوہر کم ہیں

چوٹ لگ جائے جن اشعار سے دل پر کم ہیں
جن میں پنہاں ہوں خیالات کے دفتر کم ہیں

میر سمجھا تھا فقط معنی اسرار سخن
ختم غالب پہ ہوئی گرمیٔ بازار سخن

نظم "تتلی" رواں کی ابتدائی مشق سخن کا نمونہ ہے۔ تاہم ندرت تشبیہات و لطف استعارات سے کوئی شعر خالی نہیں ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

اڑتا پھرتا ہے ہوا پر ساغر زریں کوئی
کر رہی ہے سیر یا معشوقۂ رنگیں کوئی

بن کے یوسف حسن خود آیا ہے یا بازار میں
پڑ گئی ہے جان تازہ یا گل گلزار میں

یا مصور شوخیٔ معشوقۂ رعنا ہے تو
یا مجسم رنگ روئے عاشق شیدا ہے تو

ہلکی پھلکی گرچہ ہے تو اک ذرا سی جاندار
دیکھتے ہیں تجھ میں ہم نیرنگ قدرت کی بہار

باعث حیرت ہے رنگینی تری ہم کیا کہیں
پھول اک اڑتا ہوا یا باغ چھوٹا سا کہیں

کر رہے ہیں رنگ یا خود سیر باد دوش پر
ٹکڑے یا قوس قزح کے اڑتے آتے ہیں نظر

اڑتے پھرتے دیکھتے تجھ کو ہوا میں شاد شاد
اک عجب حسرت سے بچپن کی ہمیں آتی ہے یاد

کوششوں پر بھی ہمارے ہاتھ کب آتی تھی تو
تجھ تلک چٹکی پہنچتی تھی کہ اڑ جاتی تھی تو

نظم "معجزہ انتظار" شوق قدوائی کی نظم "عالم خیال" کا چربہ ہے۔ یہ ایک عورت کے انتظار اور محو خیال یار کی تصویر ہے جس میں محاکات کا کمال ہر مصرع سے ظاہر ہوتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

وقت غروب آفتاب حالت انتظار میں
بیٹھی ہے اک مہ جبیں محو خیالِ یار میں

قاعدہ شمار سے ختم ہے اب فراق دوست
اس لئے اور تیز ہے آتش اشتیاق دوست

کرتی تھی ہر طرح درست اپنے سنگار کی پھبن
ایک لباس اتار کر کرتی تھی ایک زیب تن

بن کے سنور کے ہر طرح بیٹھی وہ تشنہ کام شوق
دل میں خیال روئے یار کانوں میں وہ پیام شوق

کوئی صدا سنی اگر دل نے کہا وہ آگئے
کوئی چلا ادھر ادھر دل نے کہا وہ آگئے

"گنگا کنارے کی شام" یہ نظم منظر قدرت کا ایک آئینہ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

اف یہ فضائے دریا ٹھنڈی ہوا کے جھونکے
موجوں کا چلبلا پن فطرت کے یہ کرشمے

حد نظر تک اپنی پھیلا ہوا ہے پانی
پانی میں آرہے ہیں ہلکورے ہلکے ہلکے

حد نگاہ پر ہے اف کس غضب کا منظر
سبز آسمان پیچھے نیلے درخت آگے

یوں ٹوٹی پڑ رہی ہیں ایک ایک پر یہ موجیں
ملنے کو مضطرب ہیں گویا کہیں کسی سے

آئینہ ہے کہ پانی اللہ ری دل فریبی
ایک آسمان اوپر ایک آسمان نیچے

پانی کے دائروں سے موجوں کا آکے ملنا
دونوں کا مل کے چلنا ایک آگے ایک پیچھے

یہ نشہ خیز موسم یہ دل ربا خموشی
یہ جاں فزا مناظر گنگا میں تیرے صدقے

نظم "دو آئینے" ایک اخلاقی نظم ہے جس میں ایک ہندو بیوہ کے کردار کی بلندی کو نہایت درد انگیز اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں ایک شخص ایک نوجوان ہندو بیوہ کو شادی کی ترغیب دیتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

زندگی کیا ہے فقط وقت کا اچھا کٹنا
اور تمہید اجل روح کی راحت گھٹنا

سکۂ حسن بنایا گیا چلنے کے لئے
نہ کہ یوں آتش فرقت میں پگھلنے کے لئے

شمع بیکار ہے جب اس سے اجالا نہ ہوا
حسن کس کام کا گر دیکھنے والا نہ ہو

روح قالب سے پس مرگ جدا ہوتی ہے ‏ کس کو معلوم کہاں جاتی ہے کیا ہوتی ہے
جان بھی دے دیں اگر رنج اٹھانے والے ‏ پھر پلٹ کر کبھی نہیں دیکھتے جانے والے

....

دوپہر کی وہ اداسی وہ پہاڑ ایسے دن ‏ کاٹے کٹ جائیں اکیلے یہ بھلا کب ممکن
دن اگر کٹ بھی گیا رات کٹے گی کیونکر ‏ جس کی ایک ایک گھڑی طول میں روز محشر
ساتھ لاتی ہے بہاروں کے جھیلے برکھا ‏ کیسے کاٹوں گی مری جان اکیلے برکھا
جھونکے اٹھلاتے ہوا کے جو کبھی آئیں گے ‏ تیر کی طرح کلیجے میں اتر جائیں گے
آکے برسیں گی جو گھنگھور گھٹائیں بن میں ‏ تیر بن بن کے ہر اک بوند لگے گی تن میں
زندگی وہ ہے جو ہنس کھیل کے خوش ہو کے کٹی ‏ کیا کٹی عمر اگر غم میں کٹی رو کے کٹی

"پیام شادی" کے جواب میں بیوہ کی طرف سے رواں نے جو اشعار تحریر فرمائے ہیں وہ نہایت درد انگیز اور موثر ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

آپ نے خط تو بہت خوب لکھا ہے لیکن ‏ سخت افسوس کہ اقرار نہیں ہے ممکن
'جان'، کہنا کسی بیگانے کو دستور نہیں ‏ یہ کرم ایسی عنایت مجھے منظور نہیں
دل نہیں ٹوٹے ہوئے دل سے لگانے قابل ‏ میں سیہ بخت نہیں پیار جتانے قابل
ساتھ سوامی کے مرے دل کی ترنگیں بھی گئیں ‏ میرے ارمان بھی گئے میری امنگیں بھی گئیں
بجلی تڑپے گی تو سمجھوں گی مرا دل تڑپا ‏ آسمان پر بھی کوئی مد مقابل تڑپا
کبھی بادل جو برستے ہوئے آئیں گے نظر ‏ میں یہ سمجھوں گی کہ روتے ہیں مری حالت پر
کیا سنائیں گے پپیہے مجھے بانی اپنی ‏ میرا ہی دکھ تو کہیں گے وہ زبانی اپنی
کوک کوئل کی سنوں گی تو یہ سمجھوں گی ضرور ‏ کہ جدائی سے ہے ہم جنس کے اپنے مجبور

عشق کا کرتے ہیں کم ظرف جو اکثر اظہار   چار دن بھی نہیں ایسوں کی محبت کو قرار

"چتر کوٹ" ایک مذہبی نظم ہے جس میں رامائن کے ایک سین کو دلفریب انداز میں پیش کیا ہے۔ بھرت چتر کوٹ میں شری رام چندر سے ایک جم غفیر کے ساتھ ملنے آتے ہیں۔ ان کو آتے ہوئے دیکھ کر لچھمن جی کو بغاوت اور خطرہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

آیا نظر جو دور سے اڑتا ہوا غبار   لچھمن کے دل کو ہونے لگا سخت انتشار
کی عرض یوں حضور شہ آسماں وقار   کچھ ہو رہے ہیں خطرہ کے آثار آشکار
تسکیں حصول تخت سے شاید ہوئی نہیں
یہ فوج ہے بھرت کی مرے دل کو ہے یقیں

دشوار ہے یہ کام کچھ آساں مگر نہیں   شاید ہمارے زور کی ان کو خبر نہیں
گو میرے پاس نام کو تیغ و تبر نہیں   ہوں زیر سایہ آپ کے کچھ مجھ کو ڈر نہیں
گر حکم جنگ مجھ کو شہ ذوالکرام ہو
دم میں بھرت کی فوج کی ترکی تمام ہو

انتخاب غزلیات رواں

کیوں کسی سے کیجئے آخر طلب داد سخن   نغمہ سنجی شغل مرغان خوش الحاں چاہیے
عجیب قسم کی بجلی نگاہ یار میں ہے   کہ جل بجھے یہ ہوس قلب بیقرار میں ہے
مرا دل اور کسی کی آستاں بوسی معاذ اللہ   نہ دکھلائے خدا دشمن کو بھی معذور ہو جانا
تسبیح کے میں قرباں زنار کے میں صدقے   دونوں میں مگر مجھ کو پھندا نظر آتا ہے

تڑپتی پھرتی ہے اک برق عرفاں میکدے بھر میں
کبھی مینا میں خم ہے اور کبھی مینا ہے ساغر میں

روشنی روح کی موقوف گدازِ تن سے ہے
جلتے جب شمع کو دیکھا تو پگھلتے دیکھا

جان کے زیست کا مآل پا کے اجل کو روبرو
پھر بھی ہیں مست عیش ہم یہ بھی عجیب راز ہے

یہ ہم دیئے وہ رنج کہ انساں بنا دیا
منت پذیر ہوں ستم روزگار کا

آتا ہوں فاصلے سے جاتا ہے دور مجھ کو
دلچسپ تھے مناظر دم بھر ٹھہر گیا ہوں

مجھے رسمی تواضع پر یقیں مطلق نہیں ہوتا
مرا دل اس پہ صدقے جان قربان جو ملے دل سے

حرص دنیا میں گر انسان گرفتار نہ ہو
دل پشیمان نہ ہو روح کبھی خوار نہ ہو

نزع میں آ کر کھلا ہے عالم فانی کا راز
اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا

یقیناً وسعتِ امکان انسانی یہاں تک ہے
کہ میدان عمل اس کا زمیں سے آسماں تک ہے

زمیں پر بار ہوں اور آسماں سے دور لے مالک
نہیں معلوم کچھ آخر ٹھکانا ہے کہاں میرا

بتوں کا ذکر کرتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں
فرشتے بھی نہیں کرتے جو آدم زاد کرتے ہیں

ذرا کمی تو کرے شام کی اداسی میں
چراغ گور نہ دے ساتھ رات بھر نہ سہی

رکھ دیا ہمت نے بڑھ کر حد منزل پہ قدم
میں ابھی شکوہ طراز گردشِ ایام تھا

اب چمن میں رہ کے بھی لطف چمن حاصل نہیں
ہاں مگر جب تک چمن میں تھے قفس بدنام تھا

قفس میں اور یہ صیاد نے مجھ پر ستم ڈھایا
نظر کے سامنے ہی لا کے شاخ آشیاں رکھ دی

دل انساں میں جب فطرت نے رکھیں قوتیں لاکھوں
تو اک کمزوری الفت بطرز امتحاں رکھ دی

حسرت انگیز ہے اے شمع لحد تیری حیات
جل بجھی جس کے لئے اس نے نہ جلتے دیکھا

بس تھک گیا سفیرِ عمل کہہ کے یا نصیب
جس جا یہ ختم منزل تدبیر ہو گئی

جو لکھا ہے کاتب تقدیر نے ہوگا وہی
اپنی کوشش بھی مگر تا حد امکاں چاہیے

تقدیر جب معاون تدبیر ہو گئی
مٹی پہ کی نگاہ تو اکسیر ہو گئی

اٹھ کے حرم سے اس لئے جاتے ہیں میکدہ رواں
ایک کو ایک پر یہاں فوق ہے امتیاز ہے

سکوت بے محل تقریر بے موقع کی تہمت کیوں
اٹھانا ہو تو یوں ہم کو اٹھا دو اپنی محفل سے

یہ امکان ترقی آج ہے دعویٰ خدائی کا
اسی دل کو جو کل تک تھا لہو کی بوند مشکل سے

رباعیات رواں

حرص و ہوس حیات فانی نہ گئی
اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواں
مر کر بھی امید زندگانی نہ گئی

آلودۂ معصیت ہے دامن میرا
جل جانے کا مستحق ہے خرمن میرا
بیکار ہے شکوہ اہل دنیا کا رواں
بڑھ کر نہیں کوئی مجھ سے دشمن میرا

بے چشم حواس کور آفت یہ ہے
ہم راہ رووں کو رنج غربت یہ ہے
آتے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں
اس کی بھی خبر نہیں مصیبت یہ ہے

نوروز ہے غرق بادہ دینا کر دے
میرا ارمان آج پورا کر دے
پی لوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی
تو کاسہ آسمان کو سیدھا کر دے

تابع ہمیں عقل کا کئے دیتی ہے
آزادی دل فنا کئے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے
فطرت سے ہمیں جدا کئے دیتی ہے

حال دل کچھ خراب سا رہتا ہے
یعنی اک پیچ و تاب سا رہتا ہے
کھلتا نہیں ہے راز کلفت لیکن
ہر وقت اک اضطراب سا رہتا ہے

رواںؔ کی نظم نگاری

رواںؔ ایک وہبی شاعر تھے۔ وہ دورِ جدید کے صفِ اول کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے بیشتر نظمیں، غزلیں اور رباعیاں لکھی ہیں۔ ان کی نظمیں نیچرل، اخلاقی، تاریخی اور مذہبی عنوانات پر لکھی گئی ہیں۔ ان کی نظم گوئی کی نمایاں خصوصیت سماج کی برائیوں کو دور کرنا اور انسان کے اخلاق و کردار کو بلند کرنا ہے۔ انھوں نے غالباً ملکی اور قومی عنوانات پر نظمیں نہیں لکھیں، جبکہ بت کے دل میں اگر وطن اور قوم کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی تو رواںؔ کے دل میں انسان اور سماج کے اخلاق و کردار کی اصلاح کرنے اور اسے اونچا اٹھانے کا جذبہ موجزن تھا۔ اسی مقصد کے تحت ان کی نظمیں لاوارث بچہ، شوہر کش حسینہ، عظمت توبہ اور دو آئینے وغیرہ لکھی گئی ہیں۔ نیچرل عنوانات پر بھی رواںؔ نے عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ اس میں سرودِ عشق، تتلی اور گنگا کنارے کی شام دلچسپ نظمیں ہیں۔ رواںؔ کی ایک ادبی نظم بعنوان "شاعری" ان کی بہترین نظم خیال کی جاتی ہے۔ اس نظم سے ان کے تخیل کی بلندی اور شاعرانہ کمالات کا اظہار ہوتا ہے۔ زبان کی فصاحت، ترکیب کی چستی، الفاظ کی بندش اور کلام کی روانی کے لحاظ سے بھی ان کی نظمیں اچھی کہی جاسکتی ہیں

رواں کی رباعیات

رواںؔ نے نظمیں، غزلیں اور قطعات کے علاوہ رباعیاں بھی کافی تعداد

میں کہی ہیں۔ ان کی کلیات "روح رواں" میں ۱۶۲ رباعیاں چھپی ہیں۔ اس صنف میں رواں نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی رباعیات میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو عمر خیام کی رباعیات میں ملتی ہیں۔ اردو ادب میں انیس اور دبیر نے اس صنف کو معراج کمال تک پہنچا دیا مگر ان کی رباعیات فلسفہ غم سے متعلق ہونے کے باعث ان کی مرثیوں کا ایک جز بن کر رہ گئیں۔ رواں نے اپنی رباعیوں میں فلسفہ حیات و موت اور مسائل زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت پراثر طریقے سے طبع آزمائی کی ہے۔ خمریات پر بھی انھوں نے متعدد نہایت کیف آگیں رباعیات کہی ہیں۔ ان کی بیشتر رباعیاں ایسی ہیں جو ان کے مشرقی و مغربی ادب اور تہذیب و تمدن کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ مولانا عزیز لکھنوی ان کی رباعیوں کے متعلق فرماتے ہیں "یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ رواں کی رباعیاں باعتبار تنوع مضامین، زبان اردو میں ایک خاص اضافہ ہیں اور بقول جناب اثر اگر مشق جاری رہی تو کسی زمانے میں اردو کے خیام کا لقب زیب دے گا[1]" رواں کی رباعیوں میں بندش کی چستی، زبان کی سلاست، تخیل کی بلندی اور طرز ادا میں ندرت بھی خوب ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین رواں کے متعلق لکھتے ہیں[2] "رواں کا دیوان روح رواں، اپنے دامن میں غزل، قطعہ اور رباعی کے علاوہ مستقل نظموں کے دلفریب پھول بھی لئے ہوئے ہے۔ غزلوں میں رواں نے زبان کا خاص طور سے لحاظ رکھا ہے۔ منتخب الفاظ اور فارسی ترکیبوں کے ساتھ روانی کا خیال رکھتے ہوئے نہایت خوبصورتی سے نظم کرنا ان کا خاص انداز ہے۔ عامیانہ الفاظ و لہجہ سے ان کو

---

[1] روح رواں صفحہ ۴۲-۴۳، [2] مختصر تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر سید اعجاز حسین صفحہ ۱۵۷

یک قلم گریز ہے جس کی وجہ سے کلام میں تازگی اور بیان میں ندرت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے تمام کلام میں اور خاص کر غزلوں میں برجستگی نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہے جو دلکشی اور تاثیر میں کافی اضافہ کر دیتی ہے۔۔۔۔ رواںؔ اپنی نظموں میں غزل کی چاشنی دے کر نہایت خوبی سے تاثیر کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ان کی بعض نظمیں کردار کی بلندی کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔"

لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی اپنے مقدمہ بابت روح رواں میں فرماتے ہیں[1]"رواںؔ کے کلام میں محض شوکت الفاظ نہیں بلکہ معنویت کا دریا بہہ رہا ہے۔ رواںؔ نے جدید انکشافات و فلسفہ و سائنس کے مضامین بیشتر اپنے اشعار میں نظم کئے ہیں اور اس طرح نہیں جس طرح ایک فلسفی یا سائنس داں مسائل حکمیہ بیان کرتا ہے بلکہ فلسفہ کے مسائل شاعر کی زبان سے ہیں اور رنگینی و اثر ہر شعر میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ پرانے فرسودہ خیالات سے یہ مجموعہ پاک و صاف ہے جس کی نسبت خود کہتے ہیں ؎

جو زمانے کے خیالات ہیں کرتا ہوں ادا　　　جانئے آپ مری دور کی تصویر مجھے

مگر نظموں سے زیادہ ان خصوصیات کا اظہار غزلوں اور رباعیوں میں ہوتا ہے۔ غزلیات میں کہیں فلسفہ و اخلاق کے مسائل ہیں مگر رنگ تغزل میں ڈوبے ہوئے۔ کہیں تصوف کی عرفان زار تجلیاں ہیں، کہیں روحانی نغمے، کہیں وجدانی ترانے جس کے ساتھ روانی و سلاست اور جوش و خروش و سوز و گداز کی بہتر سے بہتر تصویریں اس کاغذی پیرہن میں پائیے گا۔ درد ہر شاعر کا حصہ نہیں۔ رقص

---

[1] روح رواں ص ۲۰۹

کرنے والے اشعار کہنا ممکن مگر دردِ دل پیدا کرنا محال ہے۔"

۶۔ تلوک چند محروم بی۔ اے

منشی تلوک چند محروم کے آبا و اجداد ضلع میانوالی (پنجاب) میں دریائے سندھ کے کنارے ایک گاؤں میں سکونت پذیر تھے۔ آراضی کے دریا برد ہو جانے سے دکانداری اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ محروم ۱۸۸۵ء میں تحصیل عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ورنا کیولر، مڈل، انٹرنس اور بی۔ اے وغیرہ امتحانات پاس کر کے ۱۹۰۸ء میں مشن ہائی اسکول ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں انگلش ٹیچر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں کنٹونمنٹ بورڈ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ اس ملازمت سے وہ غالباً ۱۹۴۳ء میں سبکدوش ہوئے۔ اسی دوران میں بعض ذاتی صدمات ایسے پیش آئے جنھوں نے محروم کو شکستہ خاطر کر دیا۔ سب سے بڑا صدمہ انھیں جوان بیوی کا شادی کے چند سال بعد ایک ننھی سی لڑکی چھوڑ کر انتقال کر جانے سے پہنچا۔

تقسیم ہندوستان کے بعد ترک وطن کر کے محروم نے ۱۹۴۸ء میں دہلی میں سکونت اختیار کی۔ دورِ حاضر کے مایہ ناز شاعر جناب جگن ناتھ آزاد محروم کے فرزند ہیں۔

ذوق شاعری ان کی طبیعت میں فطری تھا جس کا اظہار بچپن ہی میں ہونے

لگا تھا۔ جب محروم تیسری جماعت ہی میں تھے موزوں مصرعے خود بخود زبان پر آنے لگے تھے۔ چونکہ ان کے وطن کی زبان ملتانی تھی اس لئے زبان کے لحاظ سے ابتدائی کلام ناقص تھا۔ مگر جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا زبان صاف ہوتی گئی۔ زمانہ طالب علمی ہی سے ان کی نظمیں پنجاب کے اخبارات اور رسائل میں شایع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ انھوں نے اپنے کلام کی اصلاح کسی سے نہیں لی۔ اردو ادب کے تنقیدی مضامین اور اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ کر کے محروم نے اپنی ادبی لیاقت خوب بڑھالی۔

محروم کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۱۶ء میں شایع ہوا تھا۔ اس کا دوسرا اور تیسرا حصہ بعد کے چند سالوں میں طبع ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں ان کی نظموں کا ایک ضخیم مجموعہ معروف بہ "گنج معانی" شایع ہوا۔ اس کی ایک جلد جناب محروم نے راقم الحروف کو اپریل ۱۹۳۹ء میں عنایت فرمائی تھی۔ اپنے دستخط کے ساتھ محروم نے یہ شعر بھی اس کتاب کے سرورق پر تحریر فرمایا تھا ؎

دریں دشتِ کہن باقی نباشد چوں غبار از من
بماند در جہاں گنج معانی یادگار از من

'گنج معانی' محروم کی نہایت دلچسپ، مؤثر اور روح پرور ادبی نیچرل اور اخلاقی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کی اکثر نظمیں اس قدر پاکیزہ اور عبرت انگیز ہیں کہ وہ درسی کتب میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔ گنج معانی ۷۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دل آویز مجموعہ اپنے دامن میں ۱۷۵ نظموں کے علاوہ رباعیات، قطعات، قصیدے، سہرے، نوحے اور تضمینیں وغیرہ سب کچھ لئے ہوئے ہے۔

محروم کے کلام کے متعلق اکبر الہ آبادی نے مندرجہ ذیل رباعی لکھ کر ان کی طباعی کی تعریف کی تھی۔

ہے داد کا مستحق کلام محروم — لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید دانش آموز — ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

محروم نے اس داد دہی کا شکریہ مندرجہ ذیل رباعی کے ذریعہ ادا کیا تھا۔

طبع موزوں خدائے برتر سے ملی — تاثیر کلام قلب مضطر سے ملی
آیا مجھ کو یقیں کہ شاعر ہوں میں — جب داد سخن جناب اکبر سے ملی

محروم کی نظمیں

(ا) حقانی نظمیں :- حمد و معرفت کے موضوع پر "گنج معانی" میں ۸ نظمیں ہیں جو بادۂ روحانیت اور ادبی لطافتوں سے لبریز ہیں۔ نظم "یہ کس کے جلوے ہیں سارے" کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

بتاؤ مہر منور میں نور کس کا ہے — میاں انجم تاباں ظہور کس کا ہے
یہ تجھ میں اے دل شاعر ظہور کس کا ہے — دماغ فلسفی تجھ میں شعور کس کا ہے

یہ سارے جلوے ہیں کس کے، خدا کے جلوے ہیں

وہی ہے رعد میں بجلی میں اور بادل میں — اسی کے دم سے ہے منگل ہر ایک جنگل میں
اسی کی بو ہے گلوں میں اسی کا رس پھل میں — اسی کی نگہت تر ہے صبا کے آنچل میں

(ب) ادبی نظمیں :- محروم کی ادبی نظموں کی تعداد "گنج معانی" میں تقریباً ۳۲ ہے جس میں اپنا گھر، بچہ، مار آستیں، بلبلہ، فریاد یتیم، بلبل کی فریاد،

چڑیا کی زاری، کولھو کا بیل، نور جہاں کا مزار اور سرور جہان آبادی وغیرہ نظمیں دل آویز اور ادبی لطافتوں سے سرشار ہیں۔ نظم "موت" کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

اے موت جن کا قطب سے تا قطب راج تھا — خورشید طشت زر جنھیں دیتا خراج تھا
ہم رفعتِ کلاہ فلک جن کا تاج تھا — با صد شکوہ زیر قدم تخت عاج تھا
قانون جن کا لفظ اشارہ رواج تھا — والاحشم کوئی، کوئی عالی مزاج تھا
ان کو بھی تو نے تخت سے پھینکا اتار کے
آئی دباؤ میں نہ کسی شہریار کے

رستم کا اب نشاں ہے نہ اسفندیار کا — ملتا نہیں پتہ کہیں ان کے مزار کا
سنتے ہیں ذکر ارجن گردوں وقار کا — تھا نام ایک منتخب روزگار کا
ہنگامہ جن سے گرم رہا کارزار کا — اک تیر چیرتا تھا کلیجہ ہزار کا
آخر نشانہ ہو کے رہا تیرے بان کا
تو نے ہی خاتمہ کیا تیر و کمان کا

ہے غم سے جاں بلب کوئی حرماں نصیب آہ — تو لے گئی ہے پہلو سے جس کا حبیب آہ
آزار ہجر کا نہیں کوئی طبیب آہ — روتا تڑپ تڑپ کے ہے بیکس غریب آہ
اے موت تیرے کام میں کتنے مہیب آہ — مارا ہے اس غریب کو بن کر رقیب آہ
جس دن سے تو نے اس سے کیا ہم نشیں جدا
ہوتی ہے چشم تر سے نہیں آستیں جدا

نوٹ :- اس نظم کے سارے بند اسی طرح رقت آمیز اور پر درد ہیں۔

نظم "بلبلہ" میں فلسفہ حیات کی تشریح کے ساتھ ساتھ استعارات کی دلکشی ورعنائی بہت خوب ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں ؎

چھوٹا سا ایک خیمۂ آبی کہوں اِسے — یا گنبد فلک سے میں تشبیہ دوں اسے
جام بلور ہے جو کروں واژگوں اسے — کس مست بادہ خوار نے پھینکا نگوں اسے
کس نازنیں کی بزم کا یارب! یہ جام ہے
سارے جہاں کی نازکی جس پر تمام ہے

پانی کی بوند بوند بشرا اور حباب ہیں — اور دونوں اس جہان میں نقش برآب ہیں
دونوں مٹے غرور سے مست و خراب ہیں — اور اس لئے غریقِ یم پیچ وتاب ہیں
دل میں اگر خودی نہ ہو، سر میں ہوا نہ ہو
ہوں اپنی اپنی ذات میں صورت جدا نہ ہو

(س) **مناظر قدرت:-** گنج معانی میں نیچرل نظموں کی تعداد تقریباً تیس ہے۔ ان میں صحرا، آندھی، کنار راوی، گنگا جی، ہلال عید، ماہ تاباں، شفق شام، فصل بہار اور پھر بسنت آیا وغیرہ نظمیں اپنی مضمون آفرینی، نازک خیالی، تاثیر کلام، زبان کی فصاحت اور تشبیہ و استعارہ کی لطافت وغیرہ کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہیں۔ نظم "آندھی" میں محاکات، تاثیر اور زور کلام سے محروم نے آندھی کی مجسم تصویر کھینچ دی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں ؎

وہ گرد کا پہاڑ اٹھا پھر شمال سے — بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے — آتی ہے فوج دیو نظر چال ڈھال سے
روپوش اس کے خوف سے کوہ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رخ آسماں ہوا

آتی ہے مثل اژدرِ صحرا پھنکارتی لکارتی فلک کو زمیں کو پکارتی
ذروں کو تا بہ چرخِ چہارم ابھارتی اڑتے ہوؤں کو اوجِ فضائے ابھارتی
یکساں بلند و پست پہ چھائی ہوئی چلی
ہلچل زمیں زماں میں مچاتی ہوئی چلی

شادی کے چند سال بعد ہی اپنی نوجوان بیوی کی وفات سے محرومؔ کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ وہ سراپا درد بن گئے۔ ہجر و فرقت اور رنج و غم کا اثر ان کے دل میں تمام عمر باقی رہا۔ جس کا عکس ان کی اکثر نظموں میں ملتا ہے۔ نظم "کنارِ راوی" اسی قسم کی ایک درد انگیز نظم ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:-

خواہ چرند ہے خواہ چوپائے شوق سے اپنے گھر کو پھر آئے
خانہ ویراں کو گھر جو یاد آئے کیا کرے ہائے کوئی بتلائے
شام غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

آنکھ کھولی ادھر ستاروں نے جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے
گو اشارے کئے ہزاروں نے آنکھ اٹھائی نہ غم کے ماروں نے
شام غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

نظم "ہلال عید" محرومؔ کی ایک نہایت دل آویز نظم ہے جس میں شاعر نے مکالماتی لب و لہجہ اور انداز بیان اختیار کر کے لطف کلام کو دوبالا کر دیا ہے۔ طرزِ بیان کی شوخی اور زبان کی فصاحت و روانی سے یہ نظم مرزا غالب

کے اس مشہور قصیدہ کی یاد تازہ کرتی ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

واہ اے شاہدِ کماں ابرو
کس ادا سے تنا ہوا ہے تو

خود نمائی بھی ہے ادا بھی ہے
اس پہ پھر کاہش حیا بھی ہے

یہ ترا بانکپن یہ رعنائی
بزم بالا میں خلوت آرائی

ہے سزاوار تجھ کو ناز و غرور
کھینچ بے شک تو اپنے آپ کو دور

سارا عالم ہے تیرا شیدائی
سب کو دیکھا ترا تماشائی

چشم بد دور! کیا نزاکت ہے
تجھ پہ بار نظر بھی آفت ہے

یوں عیاں ہے شفق کے دامن میں
جیسے مرد ہو کوئی گلشن میں

یا کوئی جیسے خنجرِ نازک
زینت دستِ دلبر نازک

خون عاشق سے سرخ رو ہو کر
ناز کرتا ہو اپنی برشش پر

یا کوئی جیسے نقرئی کشتی
قلزم سرخ پر ہو تیر رہی

اک جہاں اس کا ہو تماشائی
کرتی جائے وہ بحر پیمائی

رفتہ رفتہ نظر سے غائب ہو
تکتے رہ جائیں لوگ سب اس کو

اے لو یہ بھی وہ صورتِ زورق
ہو گیا گم میانِ شام و شفق

"شفق شام" ایک دلفریب نیچرل نظم ہے جسے حسین تشبیہات کے استعمال سے مرحوم نے بہت دلچسپ بنا دی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں :-

جوشِ گل دامنِ فلک پر ہے | اڑ رہی یا شرابِ احمر ہے
واہ کیا دلفریب منظر ہے | شفقِ شام جلوہ گستر ہے

یا اڑاتا ہے چرخ شعبدہ کار
یا غبارِ زمیں سے رنگِ بہار

قدسیوں نے رچائی ہے ہولی | رنگ اڑتا ہے آئی ہے ہولی
آسماں نے مچائی ہے ہولی | واہ کیا رنگ لائی ہے ہولی

یہ سن اور یہ قبائے رنگ آلود
مسخرا بن گیا ہے چرخ کبود

"فصلِ بہار" محرومؔ کی ایک دوسری دلفریب نظم ہے جو انتخابِ الفاظ، بندش تراکیب اور صفائی و روانی کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں:-

نہیں نرگس پہ خواب کی مستی | بلکہ ہے یہ شباب کی مستی
واہ بوئے گلاب کی مستی | ہے ہوا میں شراب کی مستی

ذوقِ مستی کے اے تمنائی
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

جوشِ گل سے جہاں ہوا رنگیں | دامنِ چرخ جابجا رنگیں
دشت و صحرا کی ہے فضا رنگیں | نغمۂ مرغِ خوشنوا رنگیں

ہیں یہ رنگِ بہار کے جلوے
صنعتِ کردگار کے جلوے

حسن اس فصل میں نکھرتا ہے | عشق اسی دور میں ابھرتا ہے

صورتِ گل کوئی سنورتا ہے — پیرہن کوئی چاک کرتا ہے

کر ہی دیتی ہے آہ بوئے بہار

آرزوہائے خفتہ کو بیدار

(د) اخلاقی نظمیں :۔ پند و نصائح کے موضوع پر گنجِ معانی میں تقریباً تیس نظمیں ہیں جن میں پرانا کرتہ، الدنیا دارالغرور، گوشۂ تنہائی، علم، شراب، ہجوم، دو رنگیٔ زمانہ، حسن اور زیور وغیرہ اچھی نظمیں ہیں نظم "الدنیا دارالغرور" کے دو بند ملاحظہ ہوں :۔

خوبوں کو اپنی خوبیٔ صورت پہ ناز ہے — مٹی کی گوری سانولی صورت پہ ناز ہے

ناز و ادا پہ چشمِ پُر آفت پہ ناز ہے — تنتے ہیں قدِ رشکِ قیامت پہ ناز ہے

جو ان کو دیکھتا ہے وہ کہتا ضرور ہے

دنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے

زاہد کو دیکھیے تو الگ اس کی شان ہے — خلقِ خدا پہ طعن ہیں طاعت پہ مان ہے

حضرت کو زہدِ خشک پہ کتنا گمان ہے — بگڑا ہوا مزاج سرِ آسمان ہے

جو اس کے ڈھنگ دیکھ لے کہتا ضرور ہے

دنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے

نظم "دو رنگیٔ زمانہ" کے چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

بنایا ہے خود خالقِ دادگر نے — معزز کسی کو محقر کسی کو

کسی کو چڑھایا ہے عرشِ بریں پر — گرایا ہے فرشِ زمیں پر کسی کو

کسی کو سکونِ شبِ ماہ بخشا — کیا صورتِ برقِ مضطر کسی کو

رلایا کسی کو ہے شبنم کی صورت — ہنسایا ہے مثلِ گلِ تر کسی کو
بٹھایا کسی کو سرِ گنجِ دولت — پھرایا گدائی میں در در کسی کو
کسی کو ملی کلفتِ شامِ ہجراں — ملی راحتِ وصلِ دلبر کسی کو
کسی کا ہے خونِ جگر پر گزارا — دیا بادۂ نابِ احمر کسی کو
کوئی اس جہاں کو سمجھتا ہے دوزخ — یہ دنیا ہے فردوسِ منظر کسی کو
یہ سب کچھ بجا ہے مگر آخر اک دن — کرے گی اجل ایک ساہر کسی کو

(ہ) **مذہبی نظمیں :۔** گنجِ معانی میں پانچ مذہبی نظمیں ہیں۔ ان کے عنوانات ہیں عزمِ صحرا، ویران کٹیا، سیتاجی کی فریاد، اعجازِ عصمت، راون کا ماتم۔ حالانکہ یہ سبھی نظمیں اچھی ہیں مگر ان میں وہ تاثیر، درد اور جوش و تڑپ نہیں ہے جو چکبست کی نظم "رامائن کا ایک سین" میں موجود ہے۔

(و) **نوحے :۔** گنجِ معانی میں ۶ نوحے ہیں جن میں نوحہ وفات سرورؔ، غمِ نادر، نوحہ چکبست، ماتم طالب قابلِ ذکر نوحے ہیں۔ سبھی نوحوں میں اصلیت وصداقت اور درد و تاثیر پائی جاتی ہے۔ نوحہ وفات سرورؔ کے دو بند ملاحظہ ہوں :۔

دل پہ بیٹھا آکے پھر تیرِ جفائے آسماں — لے گئی کس کو اٹھا کر آہ مرگِ ناگہاں
ہر طرف چھایا ہوا ہے کیوں خموشی کا سماں — بزمِ ہستی سے ہوئے رخصت سرورِ خوش بیاں

آہ گلچیں اجل سے کیسی نادانی ہوئی
پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی

تیرے ماتم میں ہے ساری بزمِ قدرت سوگوار — روتے ہیں گنگ و جمن مل کر گلے زار و قطار

لالۂ خونیں جگر ہے سوزِ غم سے داغدار　　خاک اڑاتی پھرتی ہے ہر کنج میں بادِ بہار

کھول کر زلفیں نہ روئے کیوں عروسِ برشگال

کون ہے اب آہ تجھ سا واصفِ حسن و جمال

طوفانِ غم

طوفانِ غم محرومؔ کی چند ان نہایت رقت آمیز اور درد و تاثیر سے ڈوبی ہوئی نظموں کا مجموعہ ہے جن کے عنوانات ہیں اشکِ حسرت، دردناک منظر، کسی کے پھول، ہری دوار سے واپسی پر، نومبر کی ایک صبح، سارس کا ایک جوڑا، تمنائے محرومؔ، اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے، ناپائیدار رشتے اور سوزِ دل وغیرہ۔ یہ نظمیں انھوں نے اپنی نوجوان بیوی کی وفات پر لکھی تھیں۔ انھیں درد انگیز نظموں کی بنا پر محرومؔ کو 'مصورِ غم' کہا جاتا ہے۔

نظم "اشکِ حسرت" کے دو بند

محرومؔ نے یہ نظم اس وقت لکھی تھی جب ان کی اہلیہ بسترِ مرگ پر حالتِ نزع میں تھی۔ وِدیا اس چھوٹی سی لڑکی کا نام ہے جسے وہ چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسی۔

نہ کر کے جاؤ مجھے آہ خانماں برباد　　نہ دے کے جاؤ مجھے شغلِ نالہ و فریاد

رکھا ہے تم نے مجھے اور میں نے تم کو شاد　　نہ جھیلی جائے گی ہجرِ دوام کی افتاد

کیا تھا عہدِ وفا مجھ سے عمر بھر کے لئے

ابھی سے ہو گئے تیار کیوں ادھر کے لئے

جو چھت سے بچۂ کنجشک کوئی آن گرا　　اٹھا اٹھا کے اسے تم نے آشیاں میں رکھا

دیا ہے خوب مقدر نے آج یہ بدلا　　تمھاری گود سے گرتی ہے خاک پر دیا

کریں گے اس پہ دل وجان نثار ہم لیکن

تمام عمر رہے گی اداس وہ تجھ بن

نظم "ناپائیدار رشتے" میں محروم نے انسان کے قریبی رشتوں کی ناپائداری اور اس کی زندگی کی بے ثباتی پر حکیمانہ نظر ڈال کر نہایت مؤثر انداز سے اسے بیان کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن　　رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں

یہ مادر و پدر زن و فرزند و اقربا　　شب بھر کے میہماں ہیں مسافر سرا کے ہیں

اطراف مختلف سے نکل آئے ہیں یہاں　　ٹھہرے سرائے دہر میں اک جا پہ آکے ہیں

مل جل کے جائیں گے نہ بہم ہو کے آئے ہیں　　رشتے نہاں نظر سے حیات و فنا کے ہیں

چاہت کا وہ طلسم سمایا ہے آنکھ میں　　عمر دو روزہ پر انھیں دھوکے بقا کے ہیں

پستے ہیں جن میں آدمی نظروں کے سامنے　　ارض و سماں دو پاٹ اسی آسیا کے ہیں

محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم　　جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی　　اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی نظم بعنوان "سوز دل" ہے۔ یہ ایک نہایت درد انگیز اور رقت آمیز نظم ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

پھر دل سوختہ مصروف فغاں ہوتا ہے　　ذکر سوز غم واندوہ نہاں ہوتا ہے

کچھ خبر ہے تجھے شمشان کو جانے والے　　سوز فرقت سے برا حال یہاں ہوتا ہے

صبح دم یاد مجھے تیری چتا آتی ہے　　شعلۂ سرخ جو مشرق میں عیاں ہوتا ہے

اور ہر شام تری رونق طلعت کے بغیر
غمکدے میں مرے وحشت کا سماں ہوتا ہے
مری آہوں سے بوئے داغ جگر آتی ہے
لخت دل ساتھ لئے اشک رواں ہوتا ہے
پھیل جاتی ہے سر شام جو دھندلاہٹ سی
مہ جبیں! وہ مری آہوں کا دھواں ہوتا ہے
وہ نہیں رنگ شفق اوج فلک پر جا کر
نفس گرم مرا شعلہ فشاں ہوتا ہے
تھا جلانا تو مجھے شمع بنایا ہوتا
یا وہ پروانہ جو محفل میں تپاں ہوتا ہے
آج محروم نکالے ہیں بہت گرم اشعار
دل جلوں کا یہی انداز بیاں ہوتا ہے

رباعیات

گنج معانی میں تقریباً ۲۲ رباعیات ہیں جو محروم کی انفرادی زندگی، تجربات دنیوی اور اخلاقی موضوعات کے متعلق ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

اک دل ہزار پیچ و تاب اے وائے
یہ زندگی ہے کہ ہے عذاب اے وائے
مردوں کو لحد میں یہ سکوں یہ آرام
زندوں کے لئے یہ اضطراب اے وائے
کیوں دار فنا کو جائے راحت سمجھے
اور ملک بقا کو دار آفت سمجھے
محروم سمجھ ہے کچھ تمھاری الٹی
غربت کو وطن وطن کو غربت سمجھے
ہے ہے! کیا دلنشیں ادائے گل ہے
زینت بخش چمن بقائے گل ہے
کیا حسن ہے کیا لطافت اللہ اللہ
اے وائے کہ مختصر بقائے گل ہے

خصوصیات کلام محروم

آنریبل خان بہادر سر شیخ عبد القادر بی۔ اے جج ہائی کورٹ پنجاب دو گنج

معانی" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں "میرے قدیم کرم فرما جناب تلوک چند صاحب محروم اپنے تخلص کی مناسبت سے دنیا کی بعض نعمتوں سے محروم رہے ہوں تو اور بات ہے مگر خداداد سخن اور موزونیٔ طبع سے انھیں حصہ وافر ملا ہے اور ان کا کلام خلعت قبول عام سے محروم نہیں رہا۔ بڑے بڑے سخنوروں نے ان کی شاعری کو سراہا ہے اور ان کے حسن بیان کی تعریف کی ہے ..... آپ کی کئی نظمیں پہلے مخزن میں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی، خیالات کی پاکیزگی حضرت محروم کے اشعار کی خصوصیات ہیں .... ایک اور چیز جو ان کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے وہ کیفیت غم ہے۔ بہار ہو یا خزاں قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے قدرت نے درد و گداز طبیعت میں حد سے زیادہ رکھا تھا۔ اس پر بعض ذاتی صدمات ایسے پیش آئے کہ شاعر سراپا درد بن گیا۔"

نظم نگاری کو رواج اور فروغ دینے والے شعراء آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، منشی سورج نراین مہر دہلوی، اکبر الہ آبادی اور نظم طباطبائی ہیں۔ ان کے بعد چند شعراء نے اسے معراج کمال تک پہنچایا۔ ان میں سرور جہان آبادی، ڈاکٹر اقبال، چکبست لکھنوی، مہاراج بہادر برق دہلوی، جوش ملیح آبادی اور تلوک چند محروم چوٹی کے شعراء شمار کیے جاتے ہیں۔

محروم کی اہلیہ کا انتقال شادی کے پانچ سال بعد ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ان کے دل میں رنج و غم نے ایسا گھر کیا کہ ساری زندگی اس نے وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیا۔ ان کے اس غمزدہ اور شکستہ دل کا اثر ان کے تمام کلام پر بہت

گہرا پڑا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں جا بجا رنج والم اور حزن و یاس کے درد انگیز مرقعے نظر آتے ہیں۔ جذبات رنج والم کا درد انگیز اظہار محروم کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ رقت آمیز نوحوں کے علاوہ گنج معانی میں مختلف مناظرِ قدرت پر ۲۸ نہایت دل آویز نظمیں ملتی ہیں۔ مگر کوئی نظم ایسی نہیں ہے جس پر محروم کے ذاتی رنج والم کی مہر نہ پڑی ہو۔ "فصل بہار" کے عنوان پر محروم نے جو نظم لکھی ہے اس کے آخری بند میں فرماتے ہیں:۔

آمدِ گل کا ہم کو کیا احساس　　دل ہے پہلو میں کب سے کشتۂ یاس
یہ جو نالے ہیں زینت قرطاس　　ہے فقط اپنی شاعری کا پاس
ورنہ ہم کو خزاں بہار ہے ایک
برگِ گل اور نوک خار ہے ایک

نظم "کنار راوی" کے ہر بند میں لکھتے ہیں:

شام غم ہے اور کنار راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

"طوفان غم" محروم کی ان نہایت رقت آمیز نظموں کا مجموعہ ہے جنھیں انھوں نے اپنی اہلیہ کی وفات پر لکھی تھیں۔ اپنی بیشتر رقت آمیز نظموں کی وجہ سے محروم واقعی مصورِ غم کہلانے کے مستحق ہیں۔ جذبات رنج والم کو مؤثر انداز سے ادا کرنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔

محروم کے کلام کی دوسری بڑی خصوصیت پند و اخلاق ہے۔ انھوں نے اپنی متعدد نظموں کے ذریعے انسان کے دل میں بے کس و بے زبان جانوروں کے

لئے ہمدردی پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ اسی مقصد سے انھوں نے شکوۂ صیاد، بلبل کی فریاد، چڑیا کی زاری، مچھلی کی بیتابی اور کولھو کا بیل وغیرہ نظمیں لکھی ہیں۔

انسان کی بری عادتوں کی اصلاح کرنا ان کی اخلاقی نظموں کی ایک دوسری بڑی خصوصیت ہے۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے الدنیا دار الغرور، شراب، ہجو مے، نوجوانو شراب سے بچنا، حسن اور زیور وغیرہ نظمیں لکھی ہیں۔

محاسن زبان اور لطافت بیان سے بھی محروم کی نظمیں مالا مال ہیں۔ انھوں نے منتخب الفاظ، چیدہ فارسی تراکیب، چستیٔ بندش اور صفائی و روانی کے ذریعے اپنے پاکیزہ کلام کے حسن میں اضافہ کرنے کا بڑا لحاظ رکھا ہے۔ محروم کی نظموں سے ان کی طبیعت کی ہمہ گیری، تخیل کی وسعت، جذبات کی رعنائی اور مضامین کی تنوع کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ نظمیں نہایت فصیح، سادہ اور شیریں زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں روانی، زور اور آمد غضب کی ہے۔ انھوں نے ہر نظم کے آخر میں نہایت بصیرت افروز اور عبرت انگیز نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

محروم کے ایک پُرگو اور باکمال نظم نگار شاعر ہونے میں شبہ نہیں۔ انھوں نے اپنی بیش بہا ادبی خدمات کی بنا پر دنیائے ادب میں اپنی ایک مستقل اور غیر فانی جگہ بنالی ہے۔

محروم نے ۶ر جنوری ۱۹۶۶ء کو اُنتقال کیا۔ گنج معانی، رباعیات محروم، کاروانِ وطن، نیرنگ معانی، شعلۂ نوا، عکسِ جمیل ان کی تصنیفات ہیں۔

دورِ جدید طبقہ دوم کی خصوصیات

جب اس دور میں ملک کے قومی رہنمایان اور سیاسی لیڈران (مثلاً بال گنگا دھر تلک، مسٹر گوکھلے، مسز بسنٹ اور مہاتما گاندھی وغیرہ) نے ملک میں حب الوطنی، حریت اور آزادی کا صور پھونکنا اور قوم کی خستہ حالی و غلامی کا احساس لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا شروع کیا تو کثرت سے ایسے شعرا بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ملکی، قومی، تاریخی اور اخلاقی نظموں کے ذریعہ حب الوطنی اور حصول آزادی کے جذبات کی اشاعت کرنا ہی اپنی شاعری کا نصب العین بنایا۔ چنانچہ اس دور کے ممتاز اردو شعرا ڈاکٹر اقبال، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، نظم طباطبائی، سرور جہان آبادی، سورج نراین مہر دہلوی، چکبست لکھنوی، مہاراج بہادر برق دہلوی، چودھری جگت موہن لال رواں اناوی وغیرہ نے اپنی ملکی، قومی، تاریخی اور اخلاقی نظموں کو لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے اور ملکی آزادی حاصل کرنے کے جوش کو ابھارنے کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے اس کے لئے کبھی اپنے کلام سے ہندوستان کی گذشتہ عظمت کی یاد تازہ کی اور قوم کی موجودہ غلامی و خستہ حالی پر آنسو بہایا اور کبھی قوم کو سماجی و اخلاقی اصلاح و ترقی کرنے کے لئے تلقین کی۔ اس طرح اس دور کا سب سے بڑا کارنامہ دلچسپ اور کارآمد نظموں کا بہت بڑا ذخیرہ پیش کرکے اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کرنا ہے۔

اس دور سے قبل اردو شاعری سے نہ تو کسی عملی زندگی کا سبق ملتا تھا اور نہ اس میں ہماری قومی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی اصلاح و بہتری کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ انگریزی ادب سے روشناس اور ملک کی آزادی کی تحریک سے اثر پذیر ہوکر اردو شعراء نے اپنے خبدیزِ سخن کی باگ نظم نگاری کی طرف موڑی۔ کیونکہ غزل جدید خیالات اور مسلسل جذبات کے اظہار کے لئے ناموزوں پائی گئی۔ انھوں نے ملکی، قومی، تاریخی اور اخلاقی موضوعات پر بے شمار ایسی جذبات انگیز نظمیں لکھیں جنھوں نے قوم کے قلبِ مردہ میں ایک تازہ روح پھونک دی اور اسے اصلاح و ترقی کے ذریعہ غلامی کی زنجیر کو توڑنے کے لئے کمربستہ کیا۔

دورِ جدید کی ایک نمایاں اور قابلِ قدر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو شعراء (خصوصاً ڈاکٹر اقبال، سرور جہان آبادی، چکبست اور مہاراج بہادر برق وغیرہ) غیر ملکی اشیاء اور روایات کے ذکر سے گریز کرکے اپنے ملک کی اشیاء، قومی روایات و خصوصیات، قدرتی مناظر اور وحش و طیور کے ذکر سے اپنی نظموں کو دل آویز بنانا اپنا فرض خیال کرنے لگے۔ یہ خصوصیت غالباً تحریک حبِ وطن کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ چنانچہ جدید اردو شعراء کی نظمیں مقامی رنگ اور ملکی و قومی خصوصیات اور روایات کی حامل ہیں۔ وہ کوہِ طور اور کوہِ بیستوں کے بجائے ہمالہ و بنجوٹی کو، دجلہ، فرات اور نیل کی جگہ گنگا، جمنا اور راوی کو، رستم و سہراب کی جگہ بھیم ارجن اور رانا پرتاپ کو اور بلبل و قمری کی جگہ کوئل اور پپیہا کو اپنی نظموں میں جگہ دینے لگے اور ان کے ذریعے اپنی نظموں کی دلکشی اور تاثیر میں غیر معمولی اضافہ کیا۔

دورِ جدید میں اردو غزل گوئی میں بھی نمایاں اصلاح اور ترقی ہوئی۔ اس دور کے قبل اردو غزل عموماً حسن و عشق، گل و بلبل، شمع و پروانہ، محبوب کے ظاہری بناؤ سنگار کے فرسودہ اور بے سود قضیہ میں پھنسی تھی۔ اس میں اصلیت اور حقیقت کے بجائے، بے کیف مبالغہ، خلافِ واقعہ باتیں، تکلف و تصنع، فرضی اور رسمی روایات اور تکرارِ مضامین کا غلبہ تھا۔ اس دور میں انگریزی ادب، سائنس اور فلسفہ کی واقفیت نے اردو شعراء کا مطمحِ نظر بلند کر دیا جس سے وہ غزل گوئی میں بھی اصلیت اور صداقت کا لحاظ رکھنے لگے۔ اب غزل میں خارجی پہلو کے بجائے داخلی پہلو پر زیادہ توجہ دی جانے لگی شعراء حسن و عشق کے بے سود بیانات کے بجائے حقایقِ زندگی، فلسفۂ حیات، مسائل تصوف، بے ثباتیٔ دنیا اور پند و اخلاق وغیرہ کو اپنے کلام میں خاص طور سے جگہ دینے لگے لیکن اس اسلوب سے کہ رنگِ تغزل کا خون نہ ہونے پائے۔ اس وجہ سے غزل کا میدان کافی وسیع ہو گیا اور اس کی رعنائی و تاثیر بجائے کم ہونے کے بڑھ گئی۔ غزل اب حسن و عشق کی فرسودہ قید سے آزاد ہو کر ہمہ گیر بن گئی۔

دورِ جدید میں اردو غزل کے مذاق میں بھی ایک خوشگوار اصلاح کی لہر پیدا ہوئی۔ اس دور سے قبل شعراء معشوق کی طرزِ معاشرت اور جذبات کی ایسی تصویریں پیش کرتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شاید اس کے پہلو میں کوئی حساس دل ہی نہیں ہے یا ہے بھی تو نہایت سنگدل، سفاک اور انسانی جذبات سے معرا۔ معشوق کی طرف سے اظہارِ محبت و عنایت کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ مگر دورِ جدید کی شاعری نے جس طرح ہر چیز کے اظہار میں حقیقت نگاری

سے کام لینا شروع کیا اسی طرح معشوق کے جذبات اور اس کے طور طریقہ کی ترجمانی کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ وہ کوئی قصائی یا جلاد نہیں ہے۔ اس کا دل بھی عام انسانی جذبات اور خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ پیرایہ بیان سے بھی معشوق کا ہر حالت میں صنف نازک سے ہونا ٹپکتا ہے۔

اس دور کے ہندو شعراء کی ادبی خدمات

اصناف نظم و غزل میں متذکرہ بالا گرانقدر اضافوں کے علاوہ ہندو شعراء نے اردو ادب کے دیگر شعبوں میں بھی قابل قدر اضافے کیے۔ دور جدید میں اردو ڈرامہ نویسی، ناول نگاری اور افسانہ نویسی کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا۔ ہندوؤں میں منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے کرشن سداما اور بھیشم پتامہ نامی دو ڈرامے لکھے۔ منشی جوالا پرشاد برق نے شیکسپیر کے نو یا دس انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کیا۔ منشی رگھناتھ سنگھ ماجر دہلوی نے نئی روشنی اور شادی خانہ آبادی نام کے دو ڈرامے لکھے۔ منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی نے فن ڈرامہ نویسی کو کافی فروغ بخشا۔ یہ فن گری ہوئی حالت میں تھا۔ اس کی اصلاح کرنے والوں میں انھیں شرف اولیت حاصل ہے۔ آغا حشر اور سید مہدی علی طالب بنارسی کے بہت بعد اس میدان میں آئے۔ طالب بنارسی کے پندرہ بیس ڈرامے طبع ہو چکے ہیں جن کے صلے میں والیان ریاست سے تمغے

ملے تھے۔ پنڈت راج نراین ارمان دہلوی نے متعدد ڈرامے اخلاقی زندگی پر لکھے۔ پنڈت نراین پرشاد بیتاب کو ڈرامہ نویسی سے خاص شغف تھا۔ پنڈت سروپ نراین ایمن کو بھی ڈرامہ نویسی کا خاص شوق تھا۔

اردو ناول نگاری میں بھی ہندو شعرا نے کافی اضافے کیے۔ منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے ڈراموں کے علاوہ متعدد ناول بھی لکھے۔ کادمبری، عالم تصویر، زلف لیلیٰ، عشق وفا اور طلسم وغیرہ افق کے مشہور ناول ہیں۔ زلف لیلیٰ میں بیگماتی زبان کا لطف پایا جاتا ہے۔ طلسم ایک ناول چندر کانتا کی قسم کا ہے۔ منشی جوالا پرشاد برق نے بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناولوں کا ترجمہ سلیس اردو میں کیا۔ روہنی، بنگالی دلہن، مرنالنی، مار آستین اور پرتاب وغیرہ برق کے مشہور ناول ہیں۔ پنڈت راج نراین ارمان دہلوی نے تقریباً ۵۹ کتابیں تصنیف و تالیف کیں جن میں اکثر ناولیں ہیں۔ منشی جے نراین ورما نے چند انگریزی ناولوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔ منشی موہن لال فہم لکھنوی نے اپنی ساری عمر ناول نویسی میں وقف کر دی چنانچہ انھوں نے تقریباً ۸۰ ناولیں تصنیف کیے ہیں جن میں سیلاب خون، اندر موہن اور کرشن کانتا بہت مشہور ہیں۔ منشی پریم چند دور جدید کے بہترین ناول نگار شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے بعد سدرشن اور کرشن چندر نے افسانہ نویسی اور ناول نگاری میں خاصی شہرت حاصل کی۔

غرضکہ دور جدید طبقہ دوم میں منشی سورج نراین مہر دہلوی نے اپنی روح پرور عارفانہ و واعظانہ نظموں سے، سرور جہان آبادی نے اپنی

دلکش نیچرل اور تاریخی نظموں سے چکبست نے اپنی لاجواب قومی اور وطنیہ نظموں سے، برق دہلوی نے اپنی وجد آور نیچرل اور مذہبی رنگ کی نظموں سے، رواں اناوی نے اپنی دل آویز ادبی اور اخلاقی نظموں سے اور منشی تلوک چند محروم نے اپنی سحر آمیز، نیچرل اور درد انگیز حزنیہ نظموں سے اردو ادب کے خزانہ میں بیش بہا نظموں کے ایک گرانقدر ذخیرہ کا اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ دیگر ہندو شعراء نے ڈرامہ، ناول اور افسانہ نگاری کے فن کو عروج بخشا اور ان میں معتدبہ اضافے کیے۔

دورِ جدید طبقہ دوم کے باقی ماندہ ہندو شعراء کی فہرست

(۱۸۹۰ء-۱۹۳۰ء)

نمبر شمار	تخلص	نام اور قوم	کیفیت
۱	ارمان	راج نراین کشمیری دہلوی	خوش فکر شاعر تھے۔ صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ (۱۸۶۲ء-۱۹۳۲ء) تذکرہ ہندو شعراء۔ برق سیتاپوری۔
۲	حیران	رام نراین کھتری دہلوی	ایک خوش فکر شاعر تھے۔ ۱۸۶۴ء-۱۹۱۰ء تذکرہ ہندو شعرا۔
۳	رونق	پیارے لال ماتھر دہلوی	بڑے کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر تھے۔ ۱۸۶۴ء-۱۹۳۴ء۔ ان کا مجموعہ کلام

نمبر شمار	تخلص	نام و قوم	کیفیت
			"کلام رونق" طبع ہو چکا ہے۔
۴	زار	تربھون ناتھ زتشی	اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔
۵	شوق	جگناتھ پرشاد نگم دہلوی	آپ کا مجموعہ کلام "آئینۂ شوق" طبع ہو چکا ہے۔
۶	فدا	جگموہن ناتھ بکو دہلوی	ایک خوش گو شاعر تھے۔ ۱۸۷۶ء
۷	کشور	کشوری لال کاٹجو دہلوی	ایک خوش گو شاعر تھے۔ ۱۸۷۷ء
۸	ماجد	رگھناتھ سنگھ کھتری "	ایک قادر الکلام شاعر ہوئے ہیں۔ صاحب اساتذہ تھے۔ ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں ۱۸۸۴ء - ۱۹۲۳ء
		شعرائے لکھنؤ	
۹	آبر	بشن نراین در	نامور بیرسٹر، وطن پرست اور اچھے شاعر تھے۔ ۱۸۳۴ء - ۱۹۱۶ء
۱۰	اثر	جے نراین ورما کھتری	رسالہ 'ناول' کے ایڈیٹر تھے۔ چند انگریزی ناولوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔
۱۱	افق	دوارکا پرشاد سکسینہ	بڑے باکمال، نامور اور مذہبی شاعر ہوئے ہیں۔ منظوم اخبار نکالتے تھے۔ ڈرامہ نویس بھی تھے۔ ۱۸۶۴ء - ۱۹۱۳ء

نمبر شمار	تخلص	نام و قوم	کیفیت
۱۲	برق	منشی جوالا پرشاد	صاحب تصانیف کثیرہ اور کثیر التلامذہ استاد تھے۔
۱۳	تمنا	رام سہائے سکسینہ	آتش لکھنوی کے برادر اور بڑے نامور باکمال شاعر ہوئے ہیں۔ ایک اچھے نثار بھی تھے۔ تقریباً دو سو کتابیں تصنیف کی ہیں۔
۱۴	ثمر	اودھ بہاری لال	نامور شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۹۳۲ء
۱۵	رونق	لچھمی نراین کھتری	خوش گو شاعر تھے ۱۸۷۴ء-۱۸۳۲ء
۱۶	شاکر	پیارے لال (عیسائی)	زبان اردو کے ماہر اور انشاپردازی کے دلدادہ تھے۔
۱۷	صدر	لچھمی پرشاد (سکسینہ)	نامور شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۱۸۶۴ء-۱۹۳۲ء
۱۸	صغیر	شیام منوہر لال گوا۔	کلام پاکیزہ اور بلند ہے۔ ۱۸۷۹ء-۱۹۳۰ء
۱۹	عاجز	ننھے لال (کایستھ)	خوش کلام نابینا شاعر تھے۔ ۱۸۷۲ء-۱۹۲۵ء
۲۰	فہم	موہن لال (سکسینہ)	۸۰ ناولوں کے مصنف ہوئے ہیں ۱۸۶۶ء-۱۹۴۰ء
۲۱	فہمی	گنگا پرشاد	کہنہ مشق اور کثیر التلامذہ شاعر تھے۔ ۱۸۷۰ء-۱۹۳۰ء
۲۲	قمر	بال کرشن سریواستو	کہنہ مشق استاد تھے۔ ۱۸۶۵ء-۱۹۳۲ء
۲۳	کشن پیاری	زوجہ رام سہائے تمنا	خوش گو شاعرہ تھیں۔ ۱۸۵۷ء-۱۹۳۲ء

نمبر شمار	تخلص	نام و قوم	کیفیت
۲۴	نظر	منشی نوبت رائے سکسینہ	ایک فاضل ادیب اور بہت نامور شاعر ہوئے ہیں۔ ۱۸۶۶ء-۱۹۲۳ء
۲۵	نیساں	ماتا پرشاد سکسینہ	فسانۂ عجائب کو نظم کیا ہے۔ ۱۸۶۰ء-۱۹۳۷ء
		شعرائے بریلی	
۲۶	جوش	سمبھو سہائے کایستھ	خوش گو شاعر تھے۔ ۱۸۷۶ء-۱۹۳۲ء
۲۷	حلم	دوارکا پرشاد سکسینہ	نامور شاعر ہوئے ہیں۔ صاحب تلامذہ بھی ہیں۔
۲۸	سوز	جے جے رام کایستھ	اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ ۱۸۶۵ء-۱۹۱۴ء
		شعرائے پنجاب	
۲۹	امین	سروپ نراین رینہ۔ امرتسری	اچھے شاعر اور ڈرامہ نویس تھے ۱۸۷۸ء۔
۳۰	زیبا	برجموہن لال تکو	خوش گو شاعر تھے۔ ۱۸۸۰ء- ؟
۳۱	شاد	لالہ بال مکند	کہنہ مشق شاعر تھے۔ ؟ - ۱۹۱۲ء
۳۲	شاطر	بیلی رام امرتسری	اچھے شاعر تھے۔ ۱۸۸۶ء-۱۹۲۲ء
۳۳	شمیم	شیو نراین رینہ	ناول نگار اور شاعر تھے۔ ۱۸۵۹ء-۱۹۳۵ء
		شعرائے بہار	
۳۴	دہاتی	ہر ہر پرشاد گیاوی	اچھے شاعر اور ڈرامہ نویس تھے ۱۸۷۰ء-۱۹۳۰ء
		شعرائے دیگر مقامات	
۳۵	محبوب	راجہ محبوب راج حیدرآبادی	راجہ گردھاری پرشاد باقی کے فرزند تھے۔ ۱۸۹۶ء-۱۹۳۳ء

نمبر شمار	تخلص	نام و قوم	کیفیت
۳۶	بریاں	حکیم رگھبیر سہائے جہان آبادی	کہنہ مشق شاعر اور صاحب تلامذہ تھے۔ ۱۸۶۸ء-۱۹۳۲ء۔
۳۷	بیتاب	شام پرشاد گنجور	خوشگو شاعر تھے ۱۸۷۱ء-۱۹۳۱ء (ذی حیات)
۳۸	خوشی	خوشی لال کانپوری	بڑے خوش کلام شاعر تھے۔ ۱۸۵۹ء-۱۹۲۴ء
۳۹	دانا	کامتا پرشاد گوالیاری	صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ ۱۸۵۴ء-۱۹۲۸ء
۴۰	شاد	پریم سنگھ بلند شہری	خوش کلام شاعر تھے۔ ۱۹۱۷ء میں زندہ تھے۔
۴۱	شاکر	شیونا تھ کول (گوالیاری)	خوش گو شاعر تھے۔ ۱۹۳۰ء میں زندہ تھے۔
۴۲	شرر	کندن لال سہارنپوری	نامور شاعر تھے۔ ۱۹۲۱ء میں زندہ تھے۔
۴۳	شوق	جگموہن ناتھ رینہ	تذکرہ بہار گلشن کشمیر کے مولف ہیں۔ ۱۸۶۳ء-۱۹۴۸ء
۴۴	شیدا	چودھری بابو رام سیتاپوری	کہنہ مشق شاعر تھے۔ ۱۸۵۱ء-۱۹۲۶ء
۴۵	شیفتہ	دولارے لال علی گنجوی	ایک خوشگو شاعر ہوئے ہیں۔ ۱۸۷۵ء-۱۹۳۸ء
۴۶	صوفی	شاہ سرن لال بنارسی	اچھے شاعر تھے۔ ۱۸۴۸ء-۱۹۰۴ء
۴۷	طالب	ونایک پرشاد بنارسی	خوش فکر شاعر اور مشہور ڈرامہ نویس تھے۔ ۱۸۵۵ء-۱۹۲۲ء
۴۸	عبرت	گورکھ پرشاد گورکھپوری	آپ فراق گورکھپوری کے والد تھے۔ ایک خوش کلام اور کامل الفن شاعر تھے۔ ۱۸۵۹ء-۱۹۱۸ء

دسواں باب

ہندو شعرا کی دیگر اہم ادبی خدمات

اس مقالے کے گذشتہ ابواب کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اردو زبان ہندو مسلم اتحاد وارتباط کی نہ صرف ایک گرانقدر یادگار ہے بلکہ وہ دونوں فرقوں کی ثقافت ومعاشرت اور مذہب واخلاق کی آئینہ دار بھی ہے۔ اس کی خدمت اہل اسلام اور اہل ہنود دونوں نے اپنے مذہبی تفرقات کے باوجود ایک ساتھ مل کر نہایت خلوص وصدق دلی کے ساتھ کی ہے۔ اس زبان کی تخلیق اس کو پروان چڑھانے اور اس کی توسیع وترقی میں ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کے دوش بدوش کام کیا ہے۔ اردو ادب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی اپنے توسن فکر کی جولانیاں اور فلک پیما ذہن رسا کے معجزے نہ دکھائے ہوں۔

اس مقالہ کے نویں باب تک اردو زبان کی تخلیق اس کی نشوونما اور ہر عہد میں اس کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوؤں نے اردو ادب خصوصاً اردو غزل گوئی اور نظم نگاری کی کہاں تک خدمت کی ہے اور اس میں کیا اضافے کئے ہیں۔ ان

اصناف کے علاوہ ہندو شعرا نے مثنوی اور مرثیہ کی جو اہم خدمات انجام دیں دنیز ہندوؤں کے مذہبی عقائد و رسوم کی ترجمانی کر کے اردو ادب کے خزانہ میں جو گراں قدر اضافے کئے اور اس کی ایک بڑی خامی کو دور کیا ان سب پر قدرے بالتفصیل لکھنے کے لئے ایک الگ باب کی ضرورت محسوس ہوئی - لہٰذا اس باب میں مندرجہ ذیل عنوانات پر روشنی ڈالی جا رہی ہے -

ا - صنف مثنوی میں ہندو شعرا کی خدمات -

ب - صنف مرثیہ میں ہندو شعرا کی خدمات -

س - ہندو شعرا کا اردو ادب میں ہندوؤں کے مذہبی عناصر کی تکمیل کرنا -

د - ہندو شعرا کے فارسی کی مشہور کتب کے منظوم تراجم

ا - صنف مثنوی میں ہندو شعراء کی خدمات

اردو مثنوی کی تاریخ

غزل اور مستقل نظموں کے بعد اردو شاعری کی دوسری مشہور اور دلچسپ صنف مثنوی ہے - مثنوی وہ صنف نظم ہے جس میں کوئی تاریخی یا مذہبی واقعہ یا عشقیہ قصہ بیان کیا جاتا ہے - یہ ایک مسلسل نظم ہوتی ہے جس کے اشعار ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح وابستہ ہوتے ہیں -

اردو میں طبع زاد یا اوریجنل (ORIGINAL) مثنویاں بہت کم لکھی گئی ہیں - زیادہ تر مثنویاں فارسی یا کسی اور زبان کی مثنویوں اور قصوں کے تراجم ہیں -

اور قریب قریب تمام اردو مثنویاں عشقیہ ہیں۔ فی زمانہ مستقل نظموں کی روز افزوں ترقی اور مقبولیت نے قصیدہ اور مثنوی کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ اس طرف بہت کم شعرا شاذ و نادر ہی اپنی توجہ مبذول فرماتے ہیں۔

اردو زبان میں ابتدا ہی سے شعرائے دکن نے مثنویاں لکھیں۔ چنانچہ رستمی کی مثنوی "خاور نامہ" اور نصرتی کی مثنوی "گلشن عشق" اور "علی نامہ" اردو کی ابتدائی مثنویوں میں شمار کی جاتی ہیں[۱]

شعرائے دکن کے بعد محمد شاہی دور میں دلّی میں شاہ مبارک آبرو نے متعدد مثنویاں لکھیں[۲]

قدما کے تیسرے دور میں مثنوی کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ چنانچہ انشاؔ اور جراؔت نے کوئی مثنوی نہیں لکھی البتہ مصحفی نے میر کی مثنوی "دریائے عشق" کو دوسرے قالب میں بدل کر اس کا نام "بحر المحبت" رکھا۔ لیکن میر حسن نے ۱۷۸۵ء میں مثنوی بدر منیر یا "سحر البیان" لکھ کر اس خامی کو دور کر دیا۔

قدما کے تیسرے دور کے بعد جب متوسطین کا دور شروع ہوا تو لکھنؤ میں ناسخ اور آتش نے مثنوی کو ہاتھ نہیں لگایا اور ان کے تلامذہ نے بھی اپنی توجہ غزل ہی کی طرف مبذول رکھی۔ مگر پنڈت دیا شنکر نسیم نے اسی دور میں ۱۸۳۶ء میں مثنوی "گلزار نسیم" لکھ کر میر حسن کی طرح اس خامی کو پورا کیا۔

شعرائے متاخرین میں قلق نے مثنوی "طلسم الفت" لکھ کر اس دور کو امتیاز بخشا۔ واجد علی شاہ کے اخیر زمانۂ سلطنت میں شوق نے چند مثنویاں

[۲،۱] شعر الہند ص ۱۶۴-۱۶۵

لکھ کر شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ اس دور کے دیگر نامور شعرا، داغ، امیر اور جلال نے اس صنف میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔

پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی

گلزار نسیم

اردو کی سب سے زیادہ مشہور و مقبولِ عام چوٹی کی مثنویاں میر حسن دہلوی کی مثنوی "سحر البیان" اور پنڈت دیاشنکر نسیم لکھنوی کی مثنوی "گلزار نسیم" ہیں۔ مثنوی سحر البیان کے برابر اگر کسی دوسری اردو مثنوی کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے تو وہ صرف "گلزار نسیم" ہی ہے۔ گل بکاولی کے دیرینہ اور فرسودہ قصہ کو جس میں دیو پری کے مافوق العادت واقعات کے ذکر کے سوا کچھ نہ تھا اور جس میں کوئی رعنائی و دلچسپی نہ تھی نسیم نے نظم کے سانچے میں ڈھال کر ایک سدا بہار چمن بنا دیا۔

پنڈت دیاشنکر نسیم خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ شروع میں غزل گوئی کا شوق تھا اور عرصہ تک غزلیں کہتے رہے مگر مثنوی کے رنگ سے خاص دلچسپی تھی۔ اس زمانے میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کی ہر طرف شہرت تھی۔ نسیم کا میلان طبع مثنوی کی طرف پہلے ہی سے تھا اس لئے انھوں نے بھی ایسی ہی مثنوی

لکھنے کا ارادہ کیا جو شہرت اور مقبولیت میں سحر البیان سے کم نہ ہو۔ مثنوی کے لئے بکاولی کا قصہ جو اس وقت تک نثر میں تھا انتخاب کیا۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں جب ان کی عمر محض پچیس سال کی تھی مثنوی "گلزار نسیم" لکھی۔ مگر یہ مثنوی اپنے رنگ میں بالکل نرالی تھی۔ نہ کسی کی تقلید تھی، نہ کسی کی نقل۔ اس کا رنگ بالکل جدا تھا۔

جس وقت مثنوی "گلزار نسیم" تیار ہوئی۔ اس کا حجم بہت زیادہ تھا۔ جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو انھوں نے کہا۔ "ارے بھئی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھے گا۔ یا تم پڑھو گے کہ تم نے تصنیف کی ہے یا میں اصلاح کے خیال سے ایک بار دیکھ جاؤں گا۔ وہ اپنا دہ یک کا قانون یہاں بھی جاری کرو" چنانچہ استاد کے ارشاد کے بموجب پنڈت جی نے مثنوی پر نظر ثانی کی اس بار ایسا اختصار کیا کہ عطر نکال لیا۔ بھرتی کے جتنے شعر تھے سب نکال دیئے۔ بلکہ جو مطلب چار پانچ اشعار میں ادا ہوتا تھا اسے ایک ہی شعر میں ادا کیا۔ استاد کے پاس دوبارہ لے گئے۔ استاد نے شاگرد کی محنت پر آفریں کی اور اصلاح کر کے مثنوی واپس دے دی۔ صحت کے بعد یہ مثنوی ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی اور بحد مقبول ہوئی۔ اس کے بعد یہ مثنوی طبع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا۔ اب "گلزار نسیم" کے جا بجا چرچے ہونے لگے۔ جواہر سخن کے پرکھنے والے جان گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے، موتی پرو دیئے ہیں۔ نسیم کو بھی شہرت عام کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے دربار میں میر حسن کے برابر کرسی ملی[1]۔

---

[1] ماخوذ از مضامین چکبست ص ۶،۵، ۷

مثنوی میر حسن اور مثنوی گلزار نسیم کا اکثر ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مثنوی گلزار نسیم پر مولانا حالی اور عبدالحلیم شرر نے چند اعتراضات کئے جس پر شرر اور چکبست کے درمیان ایک سال تک بڑی معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔ رسالہ دل گداز میں شرر کے اعتراضات اور اودھ پنچ میں چکبست کے اعتراضات شائع ہوتے رہے۔ یہ مباحثہ (جو بعد میں مباحثہ شرر و چکبست کے عنوان سے شائع ہوا) تنقیدی حیثیت سے گزر کر بہت کچھ تعصب اور ذاتی حملوں پر پہنچ گیا تھا اور فحش گوئی کی نوبت آگئی تھی۔

مگر ان دونوں مثنویوں میں بجز اس کے کہ دونوں مثنوی ہیں اور کوئی بات مشترک نہیں ہے۔ دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ نسیم نے میر حسن کے مقابلے پر اپنی مثنوی لکھی کیونکہ دونوں مثنویوں کی بحر، طرز بیان اور رنگ میں بہت اختلاف ہے۔ میر حسن کی مثنوی سلاست، بے تکلفی اور روانی و سادگی کے لحاظ سے ایک بے مثل مثنوی ہے۔ نسیم کی مثنوی معنی آفرینی، بلند پروازی، نازک خیالی، شوکت الفاظ، نزاکت تشبیہہ و استعارہ اور چستیٔ بندش کے لحاظ سے لاجواب ہے۔ چنانچہ چکبست مثنوی گلزار نسیم کی نسبت یوں رقم طراز ہیں[1]" لیکن سخن شناس جانتے ہیں کہ نسیم نے گو کہ میر حسن کے جوڑ پر مثنوی کہی لیکن بالکل دوسرے رنگ میں کہی۔ کوئی نسیم کو میر حسن کے خرمن کا خوشہ چیں نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ اپنے رنگ میں یکتا ہیں تو یہ اپنے طرز میں فرد ہیں۔ اگر کلام کی سادگی و بے تکلفی کا لطف اٹھانا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو۔

---

[1] ماخوذ از مضامین چکبست ص ۱۶۵

اگر باریک بینی اور معنی آفرینی کا رنگ پسند ہے تو گلزارِ نسیم کی سیر کرو۔۔۔۔
دونوں نے اپنے اپنے رنگ میں شاعری کا حق ادا کیا ہے۔ میر حسن کے اشعار کا
بیساختہ پن اور سادہ پن دل پر عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔۔۔۔ نسیم کے اشعار
ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی،
استعاروں کی ترکیب، تشبیہوں کی پختگی مصنف کی طبیعت کے پرزور ہونے پر
دلالت کرتی ہے۔ نازک خیالی اور بلند پروازی اس عالم کا اشارہ کرتی ہے
جہاں پہنچ کر ہمارے طائرِ خیال بے پر جلنے لگتے ہیں۔ اگر صورت حال کا بیان
میر حسن پر ختم ہے تو کلام کا معنی خیز ہونا نسیم پر۔۔۔۔ میر حسن سخن آفریں ہیں،
نسیم معنی آفریں ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں، استعارہ
و تشبیہ نسیم کا حصہ ہے۔ مگر اتنا کہنا نا انصافی نہیں کہ جو سوز و گداز میر حسن
کے کلام میں ہے وہ نسیم کے کلام میں نہیں۔"

مولانا اصغر حسین اصغر گونڈوی کی تنقید جو انھوں نے مثنوی گلزارِ نسیم پر
یادگارِ نسیم کے عنوان سے تحریر فرمائی ہے ایک نہایت گرانقدر مستند تنقید ہے۔
وہ تحریر فرماتے ہیں: "گلزارِ نسیم نہ صرف اپنے رنگ کی پہلی مثنوی ہے بلکہ
اسے لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی بھی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس مثنوی نے
ایسی شہرت حاصل کی کہ ہر طرف لوگوں کو مثنوی لکھنے کا شوق و حوصلہ پیدا ہو گیا۔
پھر تو راہ کھل گئی۔ چنانچہ گلزارِ نسیم کی تصنیف و طبع کے بعد ہی تقریباً بارہ برس
کے اندر لکھنؤ میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ جن میں قلق کی "طلسم الفت" اور نواب
مرزا شوق کی "زہر عشق" وغیرہ نے کافی شہرت حاصل کی۔۔۔۔ مگر گلزارِ نسیم سے

قبل میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کا عام شہرہ تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ نسیم نے گلزار نسیم لکھتے وقت عمداً اس کے رنگ سے علیحدگی اختیار کی۔ عدم تقلید اور عام مذاق سے اجتناب ایک زبردست انفرادیت اور ایک بلند پایہ استعداد شاعری کے آثار ہیں۔۔۔۔ اگر بہ نظر غائر اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں وہ عام خوبیاں جن کا اثر مثنوی میں ہونا لازمی و ضروری ہے ایک ایک کر کے موجود ہیں۔ مگر ان پر اس دور کے طرز بیان کے ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ عام نظریں وہاں تک مشکل ہی سے پہنچ سکتی ہیں۔"

منشی احمد علی شوق گلزار نسیم کے متعلق تحریر فرماتے ہیں[1]: "گلزار نسیم کی خوبیوں کو میرا دل ہی جانتا ہے اور میں سچ کہتا ہوں کہ نسیم مرحوم نے جس فصاحت کے ساتھ گلزار نسیم کو نظم فرمایا ہے۔ میں اس کو نہیں پہنچ سکا۔ میں نے اپنی قوت شاعرانہ ایک حد تک ترانۂ شوق میں صرف کی اور اس قدر صحیح ہے کہ ترانۂ شوق کی تصنیف کے وقت گلزار نسیم میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ حاشا اس غرض سے نہیں کہ میں اس کا جواب کہوں بلکہ اس غرض سے کہ بحر ایک ہی ہے مضامین لڑ نہ جائیں۔ لیکن نسیم کی فصاحت بیانی نے میری یہ حالت کی کہ جا بجا پسینہ آ گیا اور پھر بھی کامیابی کی حد تک نہ پہنچ سکا۔۔۔۔ میں نسیم مرحوم کی روح کو گلزار نسیم کی داد کہاں تک دوں۔ جس رنگ میں یہ مثنوی ہے اپنی مثال آپ ہی ہے۔"

نقاد لکھنوی لکھتے ہیں[2]: "گلزار نسیم بھی اسی قبیل کی ایک نظم ہے جسے جتنی مرتبہ پڑھیے اور جتنے غور سے پڑھیے ایک نیا لطف ملتا ہے اور جب ذہن اس کے

---

[1] کشمیری درپن بابت ماہ اگست ۱۹۰۵ء جلد ۳ - نمبر ۸ ، [2] رسالہ زمانہ بابت جون ۱۹۰۵ء

دقائق و نزاکت فن تک پہنچتا ہے تو ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔
درحقیقت اس میں ایسے نازک استعارے اور بلند خیالی کے نمونے ہیں جو اُردو
شاعری کی انتہائی ترقی کا پتہ دیتے ہیں اور مجموعی حیثیت سے اس میں اعلیٰ شاعری
کے اتنے ارکان جمع ہو گئے ہیں جو دوسری مثنویوں بلکہ اردو کی کل تصانیف میں
کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں۔"

گلزار نسیم کے محاسن

گلزار نسیم میں ایک اعلیٰ پایہ شاعری کے کئی ارکان مکمل طور پر ملتے ہیں۔
ان میں سے چند ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ تناسب لفظی

گلزار نسیم کا ایک خاص جوہر جو کہ نسیم کا خاص رنگ ہے تناسب لفظی
ہے۔ تناسب لفظی کی صنعت ہمیشہ اردو شاعروں کے پسند خاطر رہی لیکن کسی
نے اس کو اس درجۂ کمال پر نہیں پہنچایا جیسا کہ ہم گلزار نسیم میں دیکھتے ہیں، لہٰذا
چند اشعار تمثیلاً ملاحظہ ہوں:۔

پردہ سے نہ دایہ نے نکالا	پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
پالا تو مفارقت ہے انجام	دانا ہے تو مجھ سے لے مرے دام

۱؎ مضامین چکبست صہ ۸

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجئے ۔۔۔ سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے
سودا ہے مری بگاؤلی کو ۔۔۔ ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

تناسب لفظی کو لطافت سخن برقرار رکھتے ہوئے نبھانا ایک مشکل کام ہے۔ بقول چکبست "اس رنگ پر چلنا آسان نہیں۔ یہ راہ بڑی کٹھن ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کا اندیشہ ہے۔ یہ نسیم ہی کو فخر حاصل ہے کہ کہیں اپنے تئیں لغزش کی ہوا نہ لگنے دی۔ اکثر شعرائے اردو نے اس رنگ میں کہہ کر اپنے کلام کو بے رنگ کر دیا ہے۔ مثلاً امانت کا دیوان بھر اس بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ امانت کے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں[۱]

قبر پہ میری لگا یا نیم کا اس نے درخت ۔۔۔ بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی
پانی نہ آبرو پہ پھرے بہر حرص مال ۔۔۔ موتی ملیں تو دانت نہ اپنے نکالئے
تری جالی کی کرتی کے تصور میں یہ رویا ہوں ۔۔۔ مبصر دیکھ کر آنکھوں کو کہتے ہیں کہ جالا ہے

خلیل کا بھی ایک شعر اسی رنگ میں ملاحظہ ہو :-

وہ شمع رو پتنگ اڑاتا ہے شاید آج ۔۔۔ کچھ پیچ پڑ گیا ہے جو آنے میں ڈھیل کی

رند کہتے ہیں :-

میلا ہے چاند گنج میں سورج گہن کا آج ۔۔۔ تم کس لئے نہ غیرت شمس و قمر گئے

ب۔ ایجاز و اختصار

گلزار نسیم کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ واقعی

---

[۱] مضامین چکبست ص ۹

دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ کل مثنوی میں ایک شعر بھرتی کا مشکل سے ملے گا۔ طویل مضامین کو چند اشعار میں نہایت خوبصورتی سے ادا کر دیا ہے۔ تمثیلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

طوطا بن کے شجر پہ جا کر | پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
پتے، پھل، گوند، چھال، لکڑی | اس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی
تیورا کے وہیں وہ بار بردوش | بیٹھا تو گرا، گرا تو بیہوش
اقرار میں تھی جو بے حیائی | شرمائی، لجائی، مسکرائی
وہ سیر چمن وہ پھول لینا | وہ عزم وطن وہ داغ دینا
پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت | پوچھا کہ طلب کہا کہ قناعت

میر حسن کے یہاں بالکل مختلف رنگ ہے۔ اس میں ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے اور یہی اس مثنوی کا بہت بڑا عیب ہے۔

س۔ تشبیہہ و تمثیل

شعر و شاعری کا بہت بڑا سرمایہ تشبیہہ و تمثیل پر مشتمل ہے۔ ایک خوش مذاق شاعر کا کمال فن صرف تشبیہہ و تمثیل کے استعمال میں نہیں ہوتا بلکہ تشبیہہ و تمثیل کو سلیقہ و لطافت کے ساتھ برتنے پر ہوتا ہے۔ اگر لطافت و سلیقہ کے ساتھ تشبیہہ و تمثیل کو استعمال نہ کیا جائے تو بجائے حسن کے کلام میں ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے لئے ناسخ کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:۔

مجھ کو سودائی بنایا ہے دکھا کر آنکھیں | تم دھتورے کا لیا کرتے ہو بادام سے کام

منھ گال پر رکھنے سے خفا ہوتے ہو ناحق   مس کرنے سے قرآں کی فضیلت نہیں جاتی

مگر نسیم نے تشبیہہ و استعارہ کا کثرت سے استعمال کرتے ہوئے کہیں لطافت و شگفتگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چند اشعار تمثیلاً ملاحظہ ہوں :۔

حمالہ پاس اک حسیں تھی   زنبور کے گھر انگبیں تھی

پریوں نے ہوا سے تخت اتارا   ثابت ہوا ٹوٹتا ستارا

پریاں ہوئیں یوں بج درج کے خورسند   ہو جیسے ہوا حباب میں بند

تاج الملوک کا سرنگ سے نکل کر بکاولی کے باغ میں داخل ہونے کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

صحن چمن ارم میں جا   بوٹا سا تہ زمیں سے نکلا

تاج الملوک کا پھول لے کر پھر سرنگ میں خوفزدہ ہو کر داخل ہونے کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

ہیبت سازمیں کے دل میں آیا   اندیشہ کی طرح سے سمایا

اس طرح کے طرز بیان میں شان محاکات بھی موجود ہے

جاگی مرغ سحر کے غل سے   اٹھی نکہت سی فرش گل سے

اس شعر میں تشبیہہ کس درجہ لطافت اور رعنائی سے لبریز ہے۔

صنائع و بدائع

گلزار نسیم کا بہت بڑا حصہ صنعتوں سے لبریز ہے بلکہ اس کے اصل محاسن اسی پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔

۱۔ صنعت سوال و جواب

پوچھا کہ طلب کہا قناعت — پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت

۲۔ صنعت مشاکلہ

میں جا کے جلی تو کچھ نہیں ہائے — ڈر ہے کہ نہ تجھ پہ آنچ آجائے

۳۔ صنعت تحلیل یا جامع اللسائین

ایک ہی طرح کے لفظ یا فقرہ کو دو جگہ مختلف معنوں میں استعمال کرنا

اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد — صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

۴۔ تجنیس محرف

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ — کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

۵۔ حسن تعلیل

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

ی۔ ضرب الامثال

شعرا نے کبھی تو رائج ضرب المثل ہی کو نظم کیا ہے جس کی مثالیں ذوق کے یہاں بکثرت ملیں گی اور کبھی کبھی ان کے بعض اشعار اپنی سادگی و سلاست کے اعتبار سے زبان زد ہو کر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان دونوں طرح کی مثالیں گلزار نسیم میں بکثرت ملیں گی۔ چند اشعار تمثیلاً ملاحظہ ہوں:۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے — جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

دونوں کی رہی نہ جان تن میں — کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار | اب مان نہ مان تو ہے مختار
درویش رواں رہے تو بہتر | آب دریا بہے تو بہتر
وہ دل جو ہوں چاہنے پہ راضی | یہ جان لے کیا کرے گا قاضی
غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے | دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے
ہوتا ہے وہی جو خدا چاہے | مختار ہے جس طرح نباہے
انسان و پری کا سامنا کیا | مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے | جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے

۸- کلام کی پختگی و متانت

چکبست فرماتے ہیں[1] "نسیم کے کلام میں وہ پختگی اور ترکیب میں وہ متانت ہے کہ اکثر اشعار کی بندش ملا فیضی کا دبدبہ یاد دلاتی ہے۔ واقعی کیا پُرشوکت کلام ہے" ؎

مرغان ہوا تھے ہوش راہی | نقش کف پا تھے ریگ ماہی
سائے کو پتہ نہ تھا شجر کا | عنقا تھا نام جانور کا
پانچوں سر پنجۂ وفا تھے | یا مطلع خمسۂ صفا تھے
اک شب تھی کہ خال روئے شامت | یا خام دیدۂ قیامت

غرضکہ تناسب لفظی، اختصار، پختگی کلام، چستی بندش، شوکت الفاظ، پاکیزہ زبان اس مثنوی کے خاص جوہر ہیں اور استعاروں اور تشبیہوں سے جو مینا کاری

---

[1] مضامین چکبست ص۱۴۲

کی ہے اس نے اور حسن دوبالا کر دیا ہے۔ اس مثنوی کے مقبول ہونے کا راز یہی ہے کہ باوجود اس اختصار کے یہ اتنے محاسن کا مجموعہ ہے۔[1]

ڈاکٹر سید رفیق حسین لکچرر الہ آباد یونیورسٹی مثنوی گلزار نسیم کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں:[2] "گلزار نسیم اردو کی مایہ ناز مثنوی ہے۔ اس میں قدیم زمانہ کی ایسی شاعرانہ فن کاری ملتی ہے جو اپنی آپ مثال ہے۔ اس کی شہرت مقبولیت اور فنی اوصاف کی بنا پر بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس مثنوی کے علاوہ اگر ہندوؤں نے اردو کی تخلیق و تزئین میں کچھ بھی حصہ نہ لیا ہوتا تو بھی ان کے حقدار ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ اس مثنوی کی مقبولیت کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ صرف نولکشور پریس لکھنؤ سے پچیس بار اس کی اشاعت ہو چکی ہے۔"

منشی بنواری لال شعلہ کی مثنوی

برج چھب

موسوم بہ بزم برندابن

منشی بنواری لال شعلہ علی گڈھی دورِ جدید طبقہ اول کے بہترین ہندو شاعر ہوئے ہیں۔ ان کی سوانح عمری، نظم نگاری اور غزل گوئی وغیرہ کے بارے

[1] مضامین چکبست ص۱۳۵، [2] مثنوی گلزار نسیم تنقید و ترتیب از ڈاکٹر رفیق حسین ص۱

میں اس مقالے کے آٹھویں باب میں کافی لکھا گیا ہے۔ لہٰذا اس باب میں محض ان کی مثنوی نگاری پر بحث کی جائے گی۔

پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی کے علاوہ دیگر ہندو شعرا نے بھی متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن کی ایک فہرست اس باب میں آگے چل کر دی گئی ہے۔ مگر ان میں مثنوی گلزار نسیم کے بعد جو شہرت اور مقبولیت شعلہ کی مثنوی "برج چھب" موسوم بہ "بزم برندا بن" کو حاصل ہوئی وہ کسی اور مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔ شعلہ نے اس مایۂ ناز مثنوی کو جو تقریباً ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، سنہ ۱۸۹۰ء میں تصنیف کی تھی۔ اس مثنوی میں انھوں نے کرشن جی کی ولادت، ان کی جھانکی، ان کی بانسری کے سحر آمیز نغمہ سے بیخود ہو کر گوپیوں کا برندابن میں ان کے گرد اکٹھا ہونا، کرشن کا گوپیوں کے بیچ سے یکایک غائب ہو جانا، گوپیوں کا فرقت شیام میں بیقراری و اضطرابی اور کرشن کا ظاہر ہو کر راس منڈل رچانا وغیرہ دلچسپ واقعات کو قلمبند کیا ہے۔

شعلہ کرشن جی کے سچے بھگت تھے۔ چونکہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور زبان پر قدرت کاملہ حاصل تھی اس لئے انھوں نے اس مثنوی میں اپنی شاعرانہ قدرت کے خوب خوب جوہر اور کرشمے دکھائے ہیں۔ مثنوی "برج چھب" شعلہ کا شاہکار ہے جس نے ان کی زندگی ہی میں ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین حاصل کی۔ درحقیقت اس مثنوی کے محاسن کا اندازہ اس کا بغور مطالعہ کر کے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ زبان قلم اسے کما حقہٗ ادا کرنے سے معذور ہے۔

چونکہ اس مثنوی میں بجائے کسی افسانے کے ہندوؤں کے ایک مذہبی اوتار کی زندگی کے واقعات کو نظم کیا گیا ہے اس لئے اسے وہ ہمہ گیر شہرت و مقبولیت نہ

حاصل ہو سکی جو سحر البیان یا گلزار نسیم کو نصیب ہوئی۔ لیکن ان دونوں مثنویوں کی قدر و شہرت محض ان کے محاسن زبان اور دلچسپ اسلوب بیان کی وجہ سے ہے۔ داخلی خوبیوں کے لحاظ سے جانچنے پر ان کی قدر و قیمت کم ہی ٹھہرتی ہے۔ ان سے ہمیں نہ تو کسی تصوف یا فلسفہ کا علم ہوتا ہے، نہ تو کوئی پند و اخلاق کا سبق ملتا ہے اور نہ ان میں ہماری قومی یا سماجی زندگی ہی کا کوئی صحیح عکس نظر آتا ہے۔ ان مثنویوں کے قصوں کا دارومدار فرضی شہزادوں کا پریوں پر عاشق ہونے اور جنوں و دیوؤں کا ان کی عاشقانہ زندگی میں مخل ہونے اور دوسرے بعید از قیاس مافوق الفطرت واقعات پر ہے۔ اصلیت و واقعیت کے فقدان کی وجہ سے ان میں حقیقی تاثیر اور جوش کلام کی بڑی کمی ہے جو شاعری کا عین مقصد ہے۔ وہ ایسے خوش نما اور دیدہ زیب کاغذی پھولوں کی مانند ہیں جن میں نہ کوئی خوشبو ہے اور نہ کوئی قدرتی رنگ۔

برخلاف ان دونوں مثنویوں کے مثنوی برندابن میں ہمیں حسین مناظر قدرت کے دلکش بیانات کے علاوہ احدیت و دانانیت، عشق سرمدی و اسرار حق، تصوف و فلسفہ، وصال و ہجر اور اخلاق و پند وغیرہ کے ایسے کیف آور اور سحر آمیز مظاہر ملتے ہیں کہ ان سے قارئین و سامعین دونوں پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ مثنوی نہ صرف معنوی اور داخلی محاسن سے بریز ہے بلکہ حسن زبان اور دلکش پیرایۂ بیان سے بھی مزین ہے۔ اس میں سادگی و سلاست بیان، روانی و صفائی کلام اور فصاحت زبان و چستی بندش اور نزاکت تشبیہہ و جدت استعارہ کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی، نازک خیالی و بلند پروازی کے نمونے بکثرت ملیں گے۔

واقعیت واصلیت سے ہمدوش ہونے کی وجہ سے سارا کلام تاثیر ولطافت اور سوز وگداز سے مملو ہے۔ اس مثنوی کی لطافت کو بڑھانے کے لئے شعلہ نے جابجا گوپیوں کی باہم گفتگو کے سلسلہ میں برج کی بے تکلف شیریں زبان بھی استعمال کی ہے۔ اور مسدس وغزلیں لکھ کر اس میں مرصع کاری کی ہے۔

مذہبی تعصب وتنگ نظری سے اوپر اٹھ کر اگر اس مثنوی کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ہر مذہب وملت کے ارباب ذوق کے لئے دلچسپ بیانات و ادبی لطافتوں سے بھری ہوئی ملے گی۔

انتخاب از مثنوی "برج چھب"

ایک روز کرشن جی نے شب مہتاب میں بندابن میں جمنا کے کنارے اپنی سحر آمیز بنسی کی تان چھیڑی۔ اس کے نغمہ سے گوپیاں مست وبیخود ہوکر ننگ وناموس کو بالائے طاق رکھ بندابن کی جانب مجنونانہ حالت میں روانہ ہوئیں۔ شعلہ کی منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے جوہر اور کمالات ظاہر کرنے کے لئے اس عنوان پر لکھے گئے چند سلسلہ وار منتخب شعر ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں۔

منظر نگاری اور نزاکت تشبیہ وتمثیل

کدھر ہے ساقی بزم شب ماہ — کھلا بند نقاب حسن دل خواہ

شب مہتاب فرش چادر نور — بیاباں در بیاباں جلوۂ طور

مجلا نور تھا ہر اک طبق میں — زمیں لپٹی تھی چاندی کے ورق میں

شکن موج ہوا سے آسمان میں — جھلک سیماب کی ریگ رواں میں
زمیں پر فرش تھا کل چاندنی کا — مہ تاباں تھا اک گل چاندنی کا
ملمع تھا ہر اک گل پر سنہرا — نظر آتا تھا ہر پتا روپہرا
معطر دشت تھا عطر حنا میں — لپٹ کافور کی موج ہوا میں
عجب شفاف دریا کی روانی — بھرا نکھرا ہوا چاندی کا پانی
یہ آب و تاب تھی انوار مہ میں — جھلکتی تھی زمیں دریا کی تہ میں
وہی تھی روشنی جو طور میں تھی — عروس شب مغرق نور میں تھی
نمونہ دشت تھا حسن جہاں کا — نقاب اولٹا تھا رخ مہ وشاں کا

واقعہ نگاری اور شان محاکات

پئے سیر حسن بہار صحرا — شب مہتاب و موج آب دریا
دل و جاں دلربا دلبر دلارام — چھبیلے چھیل بانکی چھب سری شیام
سراپا عشوہ گر سرتا قدم ناز — برنگ حسن خود طاؤس طناز
نشار حسن سے سرمست و مدہوش — قیامت قامت و مشتاق آغوش
ہوا یوں جلوہ فرما برج بن میں — بہار تازہ جوں صحن چمن میں
دھری مرلی ادھر گردھر نے چھب سے — پھر سر شیام نے اعجاز لب سے
صدائے نغمہ نے غارت ہوش — دو عالم بے خودی سے خود فراموش
کیا بے چین ساری گوپیوں کو — پکارا پریم پیاری گوپیوں کو
یہ کہہ کر سب نے تن من دھن لبارا — چلو سکھیو کہ ٹیرت کا کنھ پیارا

اہا آہا اہا آہا اہا جی ۔ مدھر دھن بانسری باجی وہ باجی

وفور شوق سے رعشہ بدن میں ۔ نہ جان تن میں نہ تن تھا پیرہن میں

روانہ سوئے بن از خود فراموش ۔ پریدیانِ متھرا دوش بدوش

سرِ عصمت نہ پاس ننگ و ناموس ۔ خودی سے دور اور وحشت سے مانوس

حریف شرم عقل و ہوش تاراج ۔ حیا گھر کی نہ باہر کی کوئی لاج

گریباں پر نہ دامن پر نظر کچھ ۔ نہ سر کی اور نہ ساڑی کی خبر کچھ

بھرا جادو تھا بنسی کی صدا میں ۔ ہزاروں کر گئی رخنے حیا میں

کوئی بیٹھی ہوئی اٹھی جھجک کے ۔ کوئی اٹھی ہوئی دوڑی لپک کے

گلے میں تھا کسی کے ہار آدھا ۔ کسی کا رہ گیا سنگار آدھا

کہیں شانے سے آدھی مانگ سلجھی ۔ کہیں زلف ایک بکھری ایک الجھی

ادھوری کوئی چشم نرگسی میں ۔ لگا دونوں کا سرمہ ایک ہی میں

کہیں رکھا ہوا محرم میں بیسر ۔ کہیں تھا پاؤں کا ہاتھوں میں زیور

کوئی ماکھن دہی کو چھوڑ سٹکی ۔ کسی نے سر سے پٹکی دودھ کی مٹکی

کوئی دلدادہ گھبرائی ہوئی سی ۔ کوئی نوخیز شرمائی ہوئی سی

ہر اک میں ڈھنگ آفت کا نرالا ۔ قیامت سوز اک اک برج بالا

تپاں کوئی مثالِ شمعِ محفل ۔ رواں کوئی بہ رنگِ نالۂ دل

ہر اک دل میں تھی ہجرِ شیام کی آگ ۔ ہر اک کے حسن کو تھی عشق سے لاگ

کوئی مست خیالِ چشمِ فتاں ۔ کوئی دیوانہ زلفِ پریشاں

کوئی بیہوش و بیخود تھی مکٹ پر ۔ کوئی جامے سے باہر پیت پٹ پر

کوئی رنگ ملیح شیام بر پر　　　نمک چھڑکے ہوئے زخم جگر پر

لب جمنا تھا دیوانوں کا جھرمٹ

تھا گرد شمع پروانوں کا جھرمٹ

اس کے بعد گوپیوں کا کرشن جی کے ساتھ اظہار تعشق کرنے، پھر رنگ رلیاں منانے وغیرہ کا نقشہ شعلہ نے نہایت دلفریب انداز سے کھینچا ہے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دل بیتاب قابو میں نہیں ہے　　　کوئی شے تھی کہ پہلو میں نہیں ہے

نہیں بے وجہ کچھ صحرا نوردی　　　تلاش دل میں ہے یہ دشت گردی

اڑھا طناز اک بانکی ادا سے　　　مکٹ لیتا ہوا جھونکے ہوا کے

مٹایا حسرت تلخیٔ جاں کو　　　لب شیریں دیے لب تشنگاں کو

امنگیں حسن کی سیمیں تنوں میں　　　حمائل دست نازک گردنوں میں

بتان رشک گل بلبل کے تھیں ساتھ　　　دھرے تھے پتھروں پر پھول سے ہاتھ

لپیٹے ہاتھ میں تھی کوئی پٹکا　　　کوئی دیتی تھی نٹ ناگر کو جھٹکا

لئے ہاتھوں پہ جان و دل سر دست　　　ہزاروں بلبلیں اک گل پہ تھیں مست

وفور ذوق میں لرزاں رگ و پے　　　سرایت کر رہا تھا نغمۂ نے

دماغوں میں بھری بوئے گل تر　　　ہر اک تھی شادماں جامے سے باہر

ہر اک کے رخ سے بیتابی ہویدا　　　ہر اک سمجھی ہوئی اپنا ہی شیدا

جو دیکھا حسن گل کو اپنا دمساز　　　ہوا کچھ بلبلوں کو عشق پہ ناز

کہ ہے دستور نازمہ جبیناں　　　غرور حسن ہے رسم حسیناں

بنی سرکش ہر اک شمشاد قامت ہر اک نوخیز فتنہ اک قیامت

گوپیوں کے ذوق خود نمائی اور غرور حسن کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر انھیں رد کنے اور ان کے غرور کو توڑنے کے لئے کرشن جی یکایک ان کے جھرمٹ سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس واقعہ سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چھوڑ اک اپنا دامن سب کو چھوڑا ہر اک کے حسن کا ابھمان توڑا

ہوا مانند بو گلشن سے پنہاں بدن سے روح جیسے جسم سے جاں

گیا دامن کشاں چت چور کیسے جگر سینے سے دل پہلو سے جیسے

تمام اردو مثنویوں میں چوٹی کی دو مثنویاں "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" سمجھی جاتی ہیں۔ میر حسن نے فراق یار میں اضطراب و بے چینی کی تصویر پیش کرنے کے لئے ۱۶ اشعار اور نسیم نے ۶ شعر لکھے ہیں لیکن شعلہ نے کرشن کے گوپیوں کے درمیان سے غائب ہو جانے کے بعد گوپیوں کی اضطرابی و بے چینی اور صحرا نوردی کا جیسا درد انگیز نقشہ تقریباً ایک سو پچاس اشعار میں پیش کیا ہے اس کا جواب ممکن نہیں۔ تاثیر سوز و گداز و نیز فصاحت زبان کے لحاظ سے میر حسن اور نسیم کے وہ اشعار جو انھوں نے فرقت محبوب کی حالت پیش کرنے کے لئے لکھے ہیں، شعلہ کے اشعار کے سامنے گرد ہیں۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کدھر ہے ساقی محفل فراموش برنگ جام خالی ہے ہر آغوش

گئی گلزار سے گل کی سواری اڑائے خاک اب باد بہاری

کہاں وہ نور وہ ٹھنڈی ہوائیں زمیں جھاڑا کریں بن کی لتائیں

کلی ہر پھول کی کمھلا رہی ہے ہر اک شاخ شجر مرجھا رہی ہے

ہوا بن کر اڑی رنگت گلوں کی ۔ زباں سوکھی ہوئی ہے بلبلوں کی

عجب میلی سی رنگت ہے قمر میں ۔ ہوئی ہے چاندنی پھیکی قمر میں

فلک پر ہے نگارہ چشم مردم ۔ ہوا ہے مہ شب مہتاب میں گم

جہاں تاریک ہے سب کی نظر میں ۔ اندھیرا چھا رہا ہے بحر و بر میں

نہ بوئے پیرہن باد صبا میں ۔ نہ باقی گونج بنسی کی ہوا میں

پریشاں سر بصحرا قیس ہر اک سو ۔ بتاں شوخ ہم چشمان آہو

ہراساں ہر طرف نظریں اٹھائے ۔ غزالان بیاباں زخم کھائے

ہر اک جانب نگاہ حسرت آمیز ۔ سیاہ چشموں کی چتون وحشت انگیز

ادائے دلبری طرز جنوں زا ۔ پری رویان شہری سر بصحرا

تلاش دلربا میں بے خودانہ ۔ برنگ نالۂ دل تھیں روانہ

اگر غنچہ کوئی چٹکا تو چونکیں ۔ اگر پتا کہیں کھٹکا تو چونکیں

نظارہ خواب سا تھا رنگ گل کا ۔ پتہ کوسوں نہیں تھا بوئے گل کا

ہر اک تھی دم بخود حیران و ششدر ۔ پکارا سب نے اک اک نام لے کر

کدھر ہو لال جی جسودھا دلارے ۔ کدھر ہو اے سری گھنشیام پیارے

کدھر ہو اے مکٹ دھاری مراری ۔ کدھر ہو اے سری بانکے بہاری

کہا اک نے کہاں ہے او فسوں ساز ۔ کہا اک نے کہاں ہے او دغا باز

غرض چلائی ہر اک نالہ دمساز ۔ نہ آئی پھر کے لیکن کوئی آواز

ہجوم گوپیاں ناز پرور ۔ خراب کوچۂ عشق سمن بر

سراپا زلف مشکیں گرد آلود ۔ جگر میں آگ لب پر آہ پر دود

ہر اک تھی صورت کاکل پریشاں	غرور حسن پر اپنے پشیماں
اوٹھایا حشر کو شور و فغاں سے	ملایا تھا زمیں کو آسماں سے
زباں پر گفتگو ے جلوہ ذات	ہر اک پتے سے حسن سبز کی بات
کہ اے برگ نہالِ صحن گلشن	ہوا دار بہار شاخ گلبن
ادھر کو آے ہیں جدیت ہمارے	کہیں دیکھے بھی ہیں گھنشیام پیارے
چلی کوئی گل و سنبل کی جانب	کوئی نالاں بڑھی بلبل کی جانب
کوئی رو کے ہوئے باد صبا کو	کوئی پکڑے ہوئے موج ہوا کو
کہا سنبل کے سارے پیچ کھولو	کوئی کہتی تھی غنچوں کو ٹٹولو
یہ کیوں اترائی ہے نگہت چمن کی	چرا رکھی ہے بو کس پیرہن کی
گلوں کی کو بہ ہو شاید بدمعاشی	ذرا ان کی بھی لو جامہ تلاشی
جھکی دیکھی جو شاخ بید مجنوں	کہا لیلی وشوں نے حال محزوں
کہ اے پروردۂ دامانِ صحرا	خمیدہ صورت گیسوے لیلیٰ
تمناے قدمبوسی ہے کس کی	اوسے دیکھا بھی ہے حسرت ہے جسکی

جب گوپیاں کرشن کو تلاش کرتے کرتے پریشان اور مایوس ہو گئیں تو کرشن جی یکایک پھر عیاں ہو گئے۔ گوپیوں نے اس کے بعد کرشن سے جو شکوہ وشکایت اور چھیڑ چھاڑ کی، شعلہ کے جادو نگارِ قلم نے اس کی جو مصوری کی ہے وہ نہایت دل آویز ہے۔ بخوف طوالت صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

یکایک آئی بوے نکہت گل	فغاں سے ہو گئیں خاموش بلبل
پلٹ کر آگئیں جانیں بدن میں	اجالا سا ہوا پھر برج بن میں

نگاہیں تھیں چکاچوندھ ایک دم سے
ہُوا پرگٹ بت طرار چھم سے

ہر اک نے کھول دیں آنکھیں جھپک کر
لیا آغوش میں سب نے لپک کر

نہ تھا فکر پس و پیش و بد و نیک
گری پڑتی تھی اوپر ایک کے ایک

کسی نے زلف سے پونچھا پسینا
کسی گستاخ نے بنسی کو چھینا

کوئی تھی دیکھتی مژگاں کی صف کو
کوئی تھی کھینچتی اپنی طرف کو

کوئی تھی شوق میں لب گزیدہ
خوشی سے کوئی پیراہن دریدہ

کہا اک نے پکڑ کر ہاتھ مضبوط
چھڑا دو گر ہو گوپی ناتھ مضبوط

یہی تھی ہم سے شرط آشنائی
کیا ہے خوب پامال جدائی

اگر اب چھوٹ جاؤ تم تو جانیں
بھلا ہو جاؤ اب کے گم تو جانیں

نظر کی طرح آنکھوں سے نہاں تھا
بت نامہرباں اب تک کہاں تھا

گوپیاں جب کرشن جی کی بے مہری اور کج ادائی کی شکایتیں کرتی ہیں تو وہ انھیں وحدانیت اور معرفت کی تلقین کرتے ہیں۔ چند اشعار اس ضمن میں ملاحظہ ہوں ؎

ہر اک آئین سے آزاد ہوں میں
بہارِ عالم ایجاد ہوں میں

غرض ہجراں سے نے وصل بتاں سے
جہاں سے کام نے اہلِ جہاں سے

ولے واقف ہر اک احوال سے ہوں
نہیں غافل کسی کے حال سے ہوں

تقدس ہے مرا نور انا الشرق
تعین ہے مرا جولانگہ برق

مگر ہے مجھ سے جسکو خاص اخلاص
وہی ہے خاص بندہ محرمِ خاص

بظاہر گرچہ آزادِ قفس ہوں
جو میرے بس میں بھی اوروں کے بس ہوں

پئے عاشق ہے کچھ فرقت ضروری | کہ قدرِ وصل ہے ہجراں کی دوری
وگرنہ کون ہے جس سے جدا ہوں | رسیدہ ہوں مگر سب میں رما ہوں
مذاق عشق اول درد جاں ہے | شکیب و صبر پہلا امتحاں ہے
نکلتا ہے جو اس منزل میں کامل | جگہ ہے اس کی میرا گوشۂ دل

اس کے بعد کرشن جی گوپیوں کو پردۂ ننگ و ناموس چاک کر کے ان کے عشق میں دیوانہ وار صحرا نوردی کرنے کے خلاف نصیحت کرتے ہیں ؎

کبھی میں خوش نہیں ایسی ادا سے | کہ باہر ہوں قدم شرم و حیا سے
اٹھایا تم نے کل رسم جہاں کو | یوں ہی لگتے ہیں دھبے خانداں کو
برا ہے گھر سے باہر پاؤں دھرنا | نہیں لازم کبھی حد سے گزرنا
اٹھانا ہاتھ کو شرم و حیا سے | اترنا ہے نگاہِ اقربا سے
کیا کیوں شوق دلِ ناموس پر صرف | نگیں کیا ہے جو آئے نام پر حرف

راس منڈل کی تصویر شعلہ نے نہایت دلکش انداز سے پیش کی ہے۔ نہایت اختصار کے ساتھ چند اشعار مثالاً پیش کئے جا رہے ہیں ؎

پڑا غل دورۂ چرخ کہن میں | رچا ہے راس منڈل برج بن میں
یہی تھا غلغلہ عرشِ بریں پر | مبارک اے زمیں تیرا مقدر
ہر اک جانب تھا سامانِ تجلی | بنا تھا دشت میدانِ تجلی
لیا ڈف اپنا چرخ چنبری نے | ملائے ساز زہرہ مشتری نے
ہوا خود بزم آرا چھیل چھبیلا | بجی گھنشام کی بانکی مرلیا
ہر اک جانب بتاں فتنہ قامت | خرام ناز انداز قیامت

پریدانِ نازک شعلہ رخسار — لباس خوش نما زنگیں و زرتار
کوئی دھانی کوئی سرخ اور کوئی زرد — ہر اک تھی اپنے رنگ میں فرد
چڑھا جوش جوانی دلبروں پر — نقاب الٹے ہوئے آدھے سروں پر
ہر اک سرکش مثال شعلۂ طور — نظر آتا تھا سرتا پا بھرا نور
بتان شوخ شوق راس میں مست — سبک جسم و سبک گام و سبک جست
فروزاں بیچ میں تھا حسن قدرت — برنگ نقطۂ پرکار قدرت
ہوا تھا حسن یکساں مہوشوں کا — بنا تھا ایک چکر گردشوں کا
بنی تھی شعلہ جوالہ ہر ایک — تھی گرد ماہ مثل ہالہ ہر ایک
زہے بخت پریدان گوکل — کہ تھا ہم بزم وہ حسن جزو کل
ہر اک آئینہ رو کے روبرو تھا — وہی اک حسن سب کے دو بدو تھا
ہوا کثرت نما جب حسن یکتا — ہر اک گوپی کا تھا اک اک کنھیا
مبارک ساتھ جس کا ساتھ ہو یہ — مبارک ہاتھ جس میں ہاتھ ہو یہ
ازل سے حُسن کو ہے عشق سے کام — کہاں گوپی وگرنہ اور کہاں شیام

مثنوی برج چھپ عرصہ سے طباعت بند ہو جانے کی وجہ سے اب نایاب ہو گئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ اتفاق سے راقم الحروف کو اپنے ایک عزیز کے قدیم کتب خانے میں ہاتھ آگیا تھا۔ جس سے شعلہ کی لاجواب مثنوی کا جگہ جگہ سے کم از کم اتنا انتخاب پیش کرنا مناسب سمجھا گیا کہ اس سے ناظرین کو شعلہ کی مثنوی نگاری کی قدرت کا قدرے اندازہ ہو سکے۔

، شعلہ اپنی نظموں اور مثنویوں میں انتخاب الفاظ اور بندش تراکیب میں

ایک مرصع ساز کی طرح محتاط تھے۔ تشبیہ و استعارے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اپنے تخیلات کو حسین تشبیہات و نادر استعارات کے ذریعہ نہایت وضاحت کے ساتھ موثر ڈھنگ سے پیش کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ایک موضوع پر صدہا اشعار لکھ جانے کے بعد بھی طبیعت کی روانی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ شعلہ بلاشبہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

منشی جوالا پرشاد برق لکھنوی کی مثنوی بہار

ہندو شعرا کی لکھی ہوئی ادبی مثنویوں میں مثنوی گلزار نسیم کے بعد منشی جوالا پرشاد برق کی "مثنوی بہار" کو امتیاز حاصل ہے۔ اپنی خوبی زبان، اختصار اور دلچسپ پیرایۂ بیان کے باعث یہ مثنوی نہایت مقبول و مشہور ہوئی۔ چکبست لکھتے ہیں[1]: "مثنوی بہار کی دلچسپی اور اختصار کو دیکھ کر سر سید احمد خاں مرحوم نے یہ فرمایا تھا کہ روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد۔ یہ سند ایسی تھی جس پر ہر شخص کو ناز ہو سکتا تھا۔"

مثنوی بہار میں ہمیں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور روزمرہ و محاورہ کا بہترین نمونہ ملتا ہے۔ بامحاورہ فصیح اور نکھری ہوئی زبان لکھنؤ اور اسلوب بیان

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۲۵۰

میں استعارات کا استعمال کر کے شاعر نے آمد بہار کی ایک جیتی جاگتی حسین تصویر پیش کی ہے۔ حالانکہ برق نے اس مثنوی میں وہی بحر اختیار کی ہے جو مثنوی گلزار نسیم کی ہے مگر تناسب لفظی کی بھرمار اور اس کے بے لطف و بیجا استعمال سے گریز کیا ہے۔ جہاں کہیں تناسب لفظی کا استعمال ہوا ہے وہ اس بے تکلفی سے کیا گیا ہے کہ شعر پڑھتے وقت اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اسی نظم سے برق کی قابلیت، ذہانت اور جودت طبع کا اظہار بخوبی ہوتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور استعمال اس خوبی سے کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ہوشیار مرصع کار نے الفاظ کے نگینے جڑ دیئے ہوں۔

مثنوی بہار کے چند اشعار

اٹھلاتی، لجاتی، مسکراتی
کس ناز سے ہے بہار آتی

کم سن، الھڑ، حسین، انیلی
چوتھی کی دلہن نئی نویلی

بوٹا سا وہ قد بہار کے دن
اٹھتی کونپل ابھار کے دن

گہنا پھولوں کا زیب تن ہے
دھانی جوڑے پہ کیا پھبن ہے

گھونگھٹ اک ناز سے نکالے
سہرا پھولوں کا منھ پہ ڈالے

اتری گلشن میں جب سواری
سورج نے آرتی اتاری

گل نے زر گل کیا نچھاور
صدقے ہوئی عندلیب اڑ کر

خورشید نے آئینہ دکھایا
کرنوں نے مورچھل ہلایا

نہریں بھر بھر کے لائیں پانی
سبزے نے بچھایا فرش دھانی

خوشیاں اشجار نے منائیں
میووں کی ڈالیاں لگائیں

مرغانِ چمن نے گیت گائے　　　کیا کیا نئے زمزمے سنائے

راقم الحروف کو "مثنوی بہار" بتلاش بسیار نہ مل سکی۔ محض مندرجہ بالا چند اشعار تذکرۂ "بہارِ سخن"، مؤلفہ برق سیتاپوری سے مل سکے۔ جس کی وجہ سے اس مثنوی پر قدرے تفصیل کے ساتھ تبصرہ نہ کیا جا سکا۔

برق کے حالاتِ زندگی اور ان کی دیگر اہم ادبی خدمات[1]

منشی جوالا پرشاد برق ۲۱ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کو قصبۂ محمدی ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۸ء میں ضلع کھیری سے انٹرنس کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور وظیفہ پایا۔ ۱۸۸۲ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۸۳ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کی اور منشی کالی پرشاد مرحوم کے دامنِ عاطفت کے سائے میں کچھ عرصے تک وکالت کا مشغلہ جاری رکھا۔ ۱۸۸۵ء میں وکالت ترک کر کے منصفی کا عہدہ قبول کر لیا اور اس صیغے میں خاطر خواہ نام آوری اور ترقی حاصل کی۔ اکسٹرا ایڈیشنل سشن جج اور سشن جج کے عہدے پر بھی قائم مقامی کی حیثیت سے ممتاز رہے۔ ۲۶ر مارچ ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں بعارضۂ طاعون انتقال کیا۔ قابلیت کے اعتبار سے اودھ کے سب ججوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

حضرتِ برق خلقی طور سے نہایت ذہین اور طباع شخص تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ابتدا ہی سے اودھ پنچ کے پودے کو سینچا۔ ان کی ذہانت

---

[1] ماخوذ از مضامین چکبست ص ۲۴۹-۲۵۱

اور طباعی ضرب المثل تھی۔ زبان داں اور مذاق شعر و سخن کے اعتبار سے لکھنؤ کے سخن سنجوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔

علاوہ چھوٹی چھوٹی نظموں کے جو اودھ پنچ میں اکثر شائع ہوئیں، مثنوی بہار اور معشوقہ فرنگ جو کہ رومیو و جولیٹ کا ترجمہ ہے، ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کے علاوہ برق نے بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناولوں کا ترجمہ بڑی صفائی سے سلیس عبارت میں کیا ہے۔ بنگالی دلہن، پرتاب، مار آستین، روہنی اصل میں بنگالی زبان کے قصے ہیں۔ علاوہ ان ترجموں کے انھوں نے شیکسپیر کے نو یا دس ڈراموں کا لفظی ترجمہ نہایت سلیس نثر میں کیا ہے۔ منشی سجاد حسین، منشی احمد علی شوق اور پنڈت تربھون ناتھ ہجر جوالا پرشاد کے بڑے گہرے دوستوں میں تھے۔

ہندو شعرا کی دیگر مثنویوں کی فہرست

تخلص	نام و قوم و سکونت	نام مثنوی اور دیگر کیفیت
برق	شیام سندر لال سیتاپوری ۱۸۸۲ء - ۱۹۳۲ء	مثنوی شاہ لیر، مثنوی سلک مروارید کے مصنف، صاحب دیوان اور تذکرہ ہندو شعرا، موسوم بہ بہار سخن کے مولف تھے۔
جوہر	رائے جواہر سنگھ لکھنوی ۱۸۲۳ء - ۱۸۸۰ء	مثنوی ہائے قیافہ و نجوم، جواہر افلاک جواہر ادراک، شاہنامہ اور شکار نامہ وغیرہ کے مصنف ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ دیوان اور دیگر کتب یادگار ہیں۔

تخلص	نام وقوم وسکونت	نام مثنوی اور دیگر کیفیت
خوشتر	جگنناتھ پرشاد سریواستو لکھنوی۔ وفات ۱۸۶۴ء	مثنوی چتر گپت موسوم بہ پدم پوکتی کے مصنف ہیں۔ ان کی رامائن منظوم کی بڑی شہرت ہوئی۔
راحت	بھگوت رائے سریواستو۔ قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ وفات ۱۸۸۴ء	شاگرد امانت لکھنوی، مثنوی نل دمن، مثنوی غنیمت اردو، مثنوی مدھ مالتی، مثنوی زہرہ بہرام اور مثنوی بوستان راحت کے مصنف ہیں۔
شاد	مہاراجہ سرکشن پرشاد قوم کھتری حیدرآبادی ۱۸۶۲ء - ؟	مثنوی آئینہ وحدت، مثنوی آئینہ وجود، مثنوی سیر وجود کے مصنف ہیں۔
شاکر	پنڈت شیو ناتھ کول لکھنوی ۱۸۶۸ء - ؟	مثنوی مراۃ الخیال کے مصنف ہیں۔
شاکر	پنڈت پریم نراین کول لکھنوی ۱۸۴۴ء - ؟	مثنوی بہار کشمیر اس رنگ میں لکھی ہے جو مثنوی گلزار نسیم کا ہے۔ نمونہ کے لئے بہار گلشن کشمیر جلد دوم صفحہ ۹۲۳ ملاحظہ ہو۔
صدر	لچھمن پرشاد سکسینہ لکھنوی ۱۸۶۴ء - ۱۹۳۲ء	مثنوی اسدا ما اور مثنوی وسلک گہر، اشعار غیر منقوط میں اس خوبی سے لکھی ہے جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ نمونہ کے لئے بہار سخن صفحہ ۲۴۸ ملاحظہ ہو۔
عاشق	پنڈت کنھیا لال کشمیری برہمن دہلوی ۱۸۸۵ء میں ذی حیات تھے۔	مثنوی باغ عشق معروف بہ مثنوی گل بصنوبر چہ کرد، کے مصنف ہیں۔

تخلص	نام و قوم و سکونت	نام مثنوی اور دیگر کیفیت
طرار	چھوٹم لال کپور حیدرآبادی ۱۸۹۰ء-۱۹۲۲ء	مثنوی 'صبح وطن' کے مصنف ہیں۔
عنبر	منشی امبر پرشاد سریواستو قصبہ زید پور ضلع بارہ بنکی ۱۸۷۴ء-۱۹۴۸ء	مثنوی 'شگوفہ' اور مثنوی 'ثمر راستی' کے مصنف ہیں۔
گوہر	منشی گیندن لال سکسینہ بدایونی وفات ۱۹۰۱ء	مثنوی 'شب چراغ' تصنیف کی۔
مہر	راجہ درگا پرشاد کایستھ سریواستو کھرے۔ قصبہ سندیلہ ضلع ہردوئی۔ وفات ۱۹۲۰ء	مثنوی 'مہر تاباں' کے مصنف ہیں۔
وفا	پنڈت دیا ناتھ سپرو بریلوی	مثنوی 'چراغ دل' ۱۸۱۵ء میں اور مثنوی 'داغ دل' ۱۸۱۹ء میں تصنیف کیں۔ نمونہ کے لیے 'بہار گلشنِ کشمیر' جلد دوم ص ۵۶۴ ملاحظہ ہو۔
تمنا	منشی رام سہائے سکسینہ لکھنوی ۱۸۵۴ء-۱۹۳۲ء	مثنوی 'سنبلستان حیرت' اور مثنوی 'گلزار فرنگ' کے مصنف تھے۔ صاحبِ تصانیف کثیرہ اور مشہور شاعر تھے۔
نادان	منشی کامتا پرشاد کائستھ قصبہ داؤد گنج ضلع ایٹہ ۱۸۵۲ء-؟	مثنوی 'نیرنگ عشق' کا اردو ترجمہ مثنوی 'غنیمت' کے نام سے کیا ہے۔

ب۔ صنف مرثیہ میں ہندو شعرا کی خدمات

ہندو شعرا نے تخیل کی جولانیاں غزل، رباعی، مسدس، قصیدہ گوئی، نظم نگاری، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ جملہ اصناف سخن میں دکھائی ہیں۔ چونکہ اردو مرثیہ کا تعلق حضرت امام حسین و عزیزان کے اعزا و رفقا کی شہادت اور کربلا کے قیامت خیز و روح فرسا واقعات سے ہے اس لئے بعض اصحاب ممکن ہے یہ خیال کرتے ہوں کہ یہ واقعات ہندوؤں کے دل پر وہ اثر نہیں رکھتے جو ان کے جذبات کو ابھار کر مرثیہ کہنے کے لئے رجوع کریں۔ لیکن واقعات اس قسم کے خیالات کی تکذیب کرتے ہیں۔ ہندو شعرا میں منشی چھنو لال دلگیر نے مرثیہ گوئی میں کافی نام پیدا کیا۔ ان کے علاوہ منشی کنورسین مضطر، راجہ الفت رائے الفت اور لالہ نانک چند نانک لکھنوی وغیرہ نے مرثیے لکھے ہیں۔

مرثیہ کی تاریخ [۱]

اردو شاعری کے دیگر اصناف سخن کے ساتھ مرثیہ کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی۔ شاہان گولکنڈہ و بیجاپور نے کافی تعداد میں مرثیے کہے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں مرثیہ بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ اس میں ادبی لطافتوں کا

---

[۱] ماخوذ از شعر الہند حصہ دوم صفحہ ۱۱-۱۶۳، صفحہ ۳۵۳-۳۶۸، تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ صفحہ ۲۶۵-۲۷۰، صفحہ ۳۱۰-۳۱۱

نقدان تھا۔ وؔلی نے مرثیہ میں طبع آزمائی نہیں کی۔ سوؔدا کے وقت تک مرثیہ عموماً چو مصرع ہوا کرتا تھا۔ سب سے پہلے سوؔدا نے مرثیہ مسدس کی شکل میں لکھا جو اب تک مروج ہے۔ مگر میرؔ و سوؔدا کے مراثی کو بہترین مراثی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں حقیقی جذبات و اثر کی کمی ہے۔ چونکہ مرثیہ کا تعلق مذہب سے تھا اس لئے اس کے شاعرانہ عیوب پر نکتہ چینی کی نظر نہیں ڈالی جاتی تھی۔ میر ضاحکؔ اور میر حسنؔ نے بھی مرثیے لکھے ہیں مگر وہ کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں۔ اس وقت تک مرثیہ کا فن اپنی ابتدائی حالت میں تھا۔

صنف مرثیہ کو موجودہ ترقی یافتہ شکل میں لانے کا سہرا میر ضمیرؔ کے سر ہے۔ میر ضمیرؔ نے مرثیہ میں سراپا، رزم، گھوڑا اور تلوار وغیرہ کی تعریف، مختلف مناظر کا تفصیلی بیان، معرکۂ کارزار کے مفصل حالات، جدید تشبیہات و استعارات، شاعرانہ استدلال و دلچسپ مبالغے وغیرہ داخل کر کے اس فن کو مزین کیا۔ میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ مرثیہ گوئی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی انتہائی کوشش کیا کرتے تھے جس کا اثر مرثیہ کی ترقی و تکمیل پر بہت اچھا پڑا۔ پہلے مرثیہ محض چالیس پچاس بندوں تک محدود تھا۔ میر ضمیرؔ نے سب سے پہلے اسے طول دیا۔ تمہید، سراپا اور میدان جنگ کی تصویر کشی کو مرثیہ کا جزو بنایا اور اس کا خاتمہ شہادت پر کیا۔ اس جدت کو لوگوں نے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا کیونکہ اس نے مرثیہ میں انقلابی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ میر خلیقؔ کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ کی اور درد و اثر کو تشبیہات اور لفظی مناسبت کے مقابلے میں زیادہ ملحوظ رکھا۔ میر ضمیرؔ نے کلام میں

زور روانی اور بندش میں چستی و صفائی پیدا کی۔

میر انیس اور مرزا دبیر اردو کے بہترین اور مایہ ناز مرثیہ گو ہوئے ہیں۔ ان کے زمانے میں یہ صنف اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی تھی۔ انیس نے زبان اردو کو خوب صاف کیا۔ وہ صحت محاورہ کا بیحد خیال رکھتے تھے۔ الفاظ کی سجاوٹ اور حسین تشبیہات و نادر استعارات کے استعمال میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کے مرثیوں کی تمہید اور مناظر جنگ وغیرہ ایسی استادی اور کمال سے لکھے گئے ہیں کہ وہ نظامی کے 'سکندر نامہ' اور فردوسی کے 'شاہنامہ' کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انیس کو مناظر قدرت کی تصویر کشی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ جذبات انسانی کی عکاسی کرنے میں انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ معرکۂ جنگ میں مبارزوں کی رجز خوانی، حریف کا جواب، حملوں کا زور و شور پہلوانوں کی طاقت آزمائی اور سامان حرب و ضرب کا نقشہ مرثیہ میں اس طرح دکھاتے ہیں گویا واقعات ہماری نظروں کے سامنے ہو رہے ہوں۔ کلام میں فصاحت و سلاست زبان اور زور و روانیٔ کلام غضب کی ہوتی ہے۔ انیس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس زمانے میں تصنع و تکلف اور مبالغہ و اغراق کا بازار گرم تھا ان کی شاعری حقیقی جذبات کا آئینہ ہوتی تھی۔ اور جس نیچرل شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کے زمانے سے ہوا اس کی داغ بیل انیس نے ڈالی تھی۔

اگر انیس اردو مرثیہ گوئی کے آسمان کے آفتاب ہیں تو دبیر ماہتاب ہیں۔ دبیر نے اپنی شاندار علمی استعداد کے سہارے اردو مرثیہ گوئی میں ایک نیا رنگ دیا۔ انیس کی طرح وہ بھی زبان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان کی تشبیہات و استعارات

میں انتہائی ندرت اور حیرت انگیز حد تک جدت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے مرثیوں کی تمہیدیں اور مناظر جنگ وغیرہ ایسی استادی اور کمال سے لکھے ہیں گویا وہ خود بہت بڑے ماہر جنگ رہے ہوں۔ ان کی زبان میں ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے۔ آیات قرآنی واحادیث کو انتہائی خوش اسلوبی سے اپنے مراثی میں نظم کیا ہے۔ الفاظ کی شان وشوکت وتخیل کی بلندی اور علوے مضامین ان کے مراثی کی امتیازی شان ہیں جس نے انھیں انیس کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔

۱۔ منشی چھنولال دلگیر

منشی چھنولال دلگیر، کائستھ سکسینہ، باشندۂ لکھنؤ نوازش حسین خاں نوازش اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ دلگیر اور طرب تخلص کرتے تھے۔ اوائل شباب میں بڑے رند منش اور رنگین مزاج تھے۔ ہندو مذہب ترک کر کے دامن اسلام سے وابستہ ہو گئے تھے اور غزل گوئی ترک کر کے مرثیہ میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ غزل میں طرب تخلص کرتے تھے اور مراثی میں دلگیر۔ مرثیہ میں اپنے علم و فضل کے کمالات کا خوب مظاہرہ کیا، جس نے ان کی شہرت دور دور پہنچا دی۔ اور نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے دور کے سب سے بڑے مرثیہ گو کی حیثیت سے ان کا شمار ہونے لگا۔ مولانا محمد حسین آزاد تحریر فرماتے

ہیں کہ "عہد مذکور میں چار مرثیہ گو نامی تھے۔ میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر، میاں فصیح۔ میاں دلگیر کی زبان میں لکنت تھی اس لئے مرثیہ خوانی نہ کرتے تھے۔ تصنیف میں بھی انھوں نے مرثیت کے دائرہ سے قدم نہیں بڑھایا۔ میاں دلگیر شیخ ناسخ کے شاگرد تھے۔ مرزا فصیح میاں دلگیر سے اور شیخ ناسخ سے اصلاح لیتے تھے۔"

غرضیکہ مرثیہ گوئی میں دلگیر کو استادانہ حیثیت حاصل تھی۔ ان کے مراثی چار ضخیم جلدوں میں مرتب ہو کر طبع ہو چکے ہیں۔ ان کے نسخے الہ آباد یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہیں۔ دلگیر غالباً ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے عہد پیری میں میر انیس نے مرثیے کہنے شروع کئے تھے۔ دلگیر کا دیوان نایاب ہے۔ لالہ سری رام مصنف خمخانہ جاوید کے کتب خانہ میں ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ تھا۔ دلگیر کا کلام فصیح، سلیس، رواں اور بامحاورہ ہوتا ہے۔ جذبات نگاری میں لطافت بیان بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ نمونہ کے لئے ایک مرثیہ کے مندرجہ ذیل تین بند ملاحظہ ہوں۔

حضرت امام حسینؑ مع اپنے رفقا و اعزا اور مخدرات عصمت و طہارت مدینہ چھوڑ رہے ہیں۔ حضرت فاطمہ صغریٰ کو بیماری کی وجہ سے مدینہ ہی میں رہنے دیتے ہیں۔ سفر کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ تمام بیبیاں محملوں میں بیٹھ چکی ہیں۔ جناب فاطمہ صغریٰ کو بیحد افسوس ہوتا ہے کہ بابا جان سب کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں لیکن مجھے یہاں چھوڑے جاتے ہیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن حضرت سکینہ سے دریافت کرتی ہیں کہ میرا نام بھی جانے والوں میں ہے یا

نہیں۔ حضرت فاطمہ اور حضرت سکینہ کی باہم گفتگو دلگیر کے قلم سے سنئے۔ اس میں واقعات و جذبات کی کتنی حسین و صحیح عکاسی کی گئی ہے ؎

کہنے لگی سکینہ سے صغریٰ پکار کر　　اٹھ کر پدر کے زانو سے آؤ ذرا ادھر
بیمار کو بھلا دیا کیوں تم نے اس قدر　　یہ آج کیا ہے تم جو ملاتی نہیں نظر
تم نے سفر سے پہلے ہی توڑی کمر مری
کیوں آج صبح آکے نہ پوچھی خبر مری

آئی سکینہ پاس تو صغرا نے یہ کہا　　بیٹھے بٹھائے بہنا یہ کیسا سفر ہوا
جاتے ہیں کس طرف کو پدر ماجرا ہے کیا　　بابا نے مرا نام لکھا یا نہیں لکھا
کس کس کی ہمرہی یہ رضائے امام ہے
اس بند میں لکھا ہوا کس کس کا نام ہے

بہنا بتاؤ ذکر مرا بھی سنا ہے کچھ　　میرے بھی حق میں بابا نے منہ سے کہا ہے کچھ
چلنا نہ چلنا میرا بھی ثابت ہوا ہے کچھ　　پوشیدہ ہے یہ راز کہ تم پر کھلا ہے کچھ
کیسا سفر ہے یہ جو پھوپھی جان روتی ہیں
یہ کیا سبب ہے باتیں جو کانوں میں ہوتی ہیں

دلگیر کی غزلوں کا نمونہ خمخانۂ جاوید جلد پنجم صفحہ ۲۲۰ پر ملاحظہ ہو۔

۲۔ منشی کنور سین مضطر لکھنوی[1]

مضطر لکھنؤ کے رہنے والے اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۳۱ء میں بلند شہر میں تحصیلدار تھے۔ علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ کلام سے مشاقیٔ فن کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ انھوں نے واقعات کربلا کو قصیدہ کی شکل میں نظم کیا ہے۔

۳۔ راجہ الفت رائے الفت[2]

راجہ الفت رائے الفت قوم کائستھ متوطن لکھنؤ شاہی زمانے میں فوج کے بخشی تھے۔ فارسی کے اچھے انشا پرداز تھے۔ انھوں نے بھی مرثیہ میں طبع آزمائی کی اور اچھی خاصی شہرت حاصل کی۔ ان کی تصنیفات میں کلیات مراثی و سلام اور دیوان غزلیات ان کی یادگار ہیں۔

۴۔ لالہ نانک چند نانک لکھنوی

لالہ نانک چند نانک قوم کھتری باشندہ لکھنؤ پیارے صاحب رشید

[1،2] ماخوذ از تذکرہ بحر سخن مولفہ برق سیتاپوری

کے شاگرد ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اکیس سال کی عمر سے انھیں ذوق شعر وسخن پیدا ہوا۔ حالانکہ اردو زبان کی نوشت وخواند سے ۱۹۳۶ء تک ناواقف تھے مگر زبان پر کافی قدرت رکھتے ہیں۔ پہلے مرثیہ مڑیا یا گورکھی رسم الخط میں تحریر کرتے تھے۔ مرثیہ گوئی میں اچھا خاصہ ملکہ رکھتے ہیں چنانچہ کبھی کبھی اہل اسلام کی مجلسوں میں مرثیے پڑھتے ہیں اور خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔

نانکؔ کے مراثی میں بہار، ساقی نامہ، رخصت، رجز، تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف، واقعات جنگ اور ذکر شہادت بڑی عمدگی سے نظم کئے ہوتے ہیں۔ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں سے کلام میں بلا کی تاثیر و دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ رخصت اور شہادت کا منظر انتہائی درد انگیز ہوتا ہے۔ زبان سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ واقعہ نگاری میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

پیاس کی شدت سے حضرت سکینہ کی جان لبوں پہ آگئی ہے۔ یہ درد انگیز حالت دیکھ کر حضرت عباس حضرت سکینہ کے پاس جاتے ہیں اور انھیں تسلی دیتے ہیں۔ اس واقعہ کی تصویر کشی نانک کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے ؎

ناگہاں خیمۂ عصمت سے اٹھا شور و بکا گوش سرور میں گئی ہائے سکینہ کی صدا
پردہ خیمہ کا اٹھا تب یہ پکاری فضہ لیجئے آکے سکینہ کی خبر جلد آقا
کہئے عباس علی سے کہ سفر کرتی ہے
تم بہت چاہتے ہو جس کو وہ اب مرتی ہے

نہ رہا ضبط کا غازی کو یہ سن کر یارا پہلے سب سے وہ جری خیمے کے اندر آیا
جا کے بالیں سکینہ پہ یہ عالم دیکھا غش سے بیہوش ہے وہ گرد ہیں سب اہل عزا

صبر کہتا ہے کہ مشکل کا خدا مالک ہے
ماں ہے خاموش مگر دل کا خدا مالک ہے

بڑھ کے عباس نے آغوش میں شفقت سے لیا　　لب جو سوکھے خشک تو دیدی انھیں دامن کی ہوا
نبض دیکھی کبھی ماتھے کا پسینہ پوچھا　　رو کے فرمایا کہ اس پیاس کے قرباں ہیں چچا

ضد ہے کس چیز کی کچھ منھ سے تو بولو بی بی
پانی ہم لاتے ہیں تم آنکھ تو کھولو بی بی

س۔ اردو ادب میں ہندوؤں کے مذہبی عنصر کی تکمیل

کسی قوم کا ادب اس کی سماجی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ مذہب اور مذہبی اعتقادات، روایات اور رسوم سماجی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم عنصر ہوتا ہے۔ اس لئے کسی قوم کے مذہبی رسوم و روایات اس کی زبان و ادب کا سب سے بڑا جزو ہوتے ہیں۔ حالانکہ اردو زبان و ادب اہل اسلام اور اہل ہنود کے اتفاق و اتحاد کی ایک مشترکہ یادگار ہے۔ لیکن مسلم شعرا نے عموماً اپنی توجہ محض اسلامی روایات و رسوم کو اردو ادب میں شامل کرنے کی طرف محدود رکھی۔ اسی وجہ سے انیسویں صدی کے نصف حصے تک اردو ادب میں ایک بڑی خامی موجود تھی وہ محض اہل اسلام کے مذہبی اعتقادات اور رسوم و روایات کی آئینہ داری کرتا تھا۔ اردو زبان کو قبول عام کا شرف بخشنے اور اور ہر دل عزیز بنانے

ہیں یہ خامی ایک سنگ راہ کا کام کر رہی تھی۔ ہندو شعرا نے جو اردو زبان کی شیرینی و فصاحت کے دلدادہ تھے۔ اس خامی کا احساس کر کے اسے دور کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ چنانچہ منشی سورج نراین مہر دہلوی، سرور جہان آبادی، منشی بنواری لال شعلہ علی گڈھی چکبست اور منشی مہاراج بہادر برق وغیرہ نے علاوہ نیچرل، وطنی، قومی و اخلاقی نظمیں لکھنے کے مذہبی نظمیں بھی خوب لکھیں۔ مگر اس طرف اپنی خاص توجہ دینے والے شعرا میں منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی، منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی، منشی گور سہائے ہلیجی کاکوروی، منشی رام سہائے تمنا اور منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کے کارنامے نہایت گرانقدر اور ناقابل فراموش ہیں۔ انہی شعرا کی جانفشانیوں اور ادبی خدمات کی بدولت اردو ادب کی پیشانی سے اس کلنک کا ازالہ ہوا۔ جس سے اردو ادب اہل اسلام اور اہل ہنود کا مشترک ادب کہلانے کا مستحق ہو گیا۔ اردو ادب میں ہندوؤں کے مذہبی عناصر کی تکمیل ہندو شعرا کا ایک خاص اور گرانقدر اضافہ ہے۔

۱۔ جگن ناتھ سہائے خوشتر لکھنوی

منشی جگن ناتھ خوشتر، قوم کائستھ سریواستو، لالہ منا لال کے لڑکے تھے۔ بزرگوں کا وطن قصبہ بڈہرہ ضلع اناؤ تھا۔ تلاش معاش میں ان کے بزرگ لکھنؤ آ کر شانہ سازوں کے محلہ میں سکونت پذیر ہوئے اور سرکار شاہی میں ملازم ہوئے۔

ان کی ولادت غالباً ۱۸۰۹ء میں ہوئی تھی۔ وہ واجد علی شاہ کے دفتر میں متصدی تھے۔ بے مثل خوشنویس تھے ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا۔

شاعری میں خوشتر کا میلان طبع مذہبیات کی جانب تھا۔ غالباً انھوں نے کسی اور صنف شاعری کو ہاتھ نہیں لگایا۔ انھوں نے سری مد بھاگوت منظوم، مثنوی چترگپت، کتھاست نراین منظوم اور سداماچرتر وغیرہ کتابیں تصنیف کیں۔ جو مطبع نول کشور سے طبع ہو چکی ہیں۔ مگر خوشتر کی معرکۃ الآرا تصنیف رامائن خوشتر ہے۔ انھوں نے ۱۸۵۱ء میں ۴۳ سال کی عمر میں تلسی کرت رامائن کا حرف بہ حرف ترجمہ نہایت دلکش انداز سے کیا۔ چنانچہ رامائن خوشتر میں فرماتے ہیں ؎

چہل سے سن مرا افزوں تھا یکسال	کیا تب میں نے رامائن کا اشغال
مشقت سے جگر میں نے کیا آب	تب آیا ہاتھ یہ لولوے نایاب
اٹھایا سخت میں نے رنج و تکلیف	ہوئی یکسال میں یہ نظم تصنیف
نہیں ہیں شعر یہ سلک گہر ہیں	غدوبت میں برنگ نیشکر ہیں
نگاہ غور سے دیکھیں خردمند	کہ دریا میں نے کوزے میں کیا بند

خوشتر کی یہ رامائن جو ۲۵۵ صفحات اور تقریباً ۴۸۰۰ اشعار پر مشتمل ہے اپنی فصاحت زبان اور خوبیٔ بیان کے باعث اس قدر پسندیدہ اور مقبول عام ہوئی کہ کئی بار چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۴ء میں وہ مطبع نول کشور سے سولھویں مرتبہ طبع ہوئی۔ اتنا بڑا شرف مقبولیت بجز مثنوی گلزار نسیم اردو ادب کی کسی اور تصنیف کو نہیں حاصل ہوا۔

نمونہ کلام رامائن خوشتر

حمد باری میں خوشتر نے چودہ شعر نہایت دلاویز انداز سے لکھے ہیں۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مناسب ہے بشر کو وقت حاجات — کرے درگاہ باری میں مناجات
وہی حاجت روائے دوجہاں ہے — کرم فرمائے عالم بیگماں ہے
وہی آمرزگار ہر خطا ہے — وہی رزق دہ شاہ وگدا ہے
اسی کی ذات ہے غفار وستار — اسی کا نام ہے قہار وجبار
وہی دوزخ وہی دیتا ہے جنّت — وہی ذلت وہی دیتا ہے عزت
بوقت رنج گر فریاد وزاری — کرے کوئی سوئے درگاہ باری
شتابی رفع ہوں سب اس کی حاجات — زروئے بید ہے منقول یہ بات

رامائن خوشتر بھی تلسی داس کی رامائن کی طرح دلکش تشبیہات واستعارات اور دیگر صنائع وبدائع اور محاسن کلام سے ہمدوش ہے۔ مندرجہ ذیل چند متفرق اشعار میں تشبیہات واستعارات کی لطافت ونزاکت ملاحظہ ہو۔

یہ اشعار اس موقع پر لکھے گئے ہیں جب راجہ رام چندر ولچھمن جی باغِ جنک میں پھول لینے جاتے ہیں اور جانکی جی اپنی سہیلیوں کے ہمراہ گرجا جی کی پوجا کے لئے آتی ہیں ؎

وہ آئی باغ میں یوں ناز پرور — نسیم آئے چمن میں جس روش پر
کوئی زہرہ تھی کوئی مشتری تھی — کوئی تھی حور اور کوئی پری تھی

کوئی شبو تھی کوئی یاسمن تھی | کوئی نسریں تھی کوئی نسترن تھی
کوئی شکل سمن تھی نازک اندام | کوئی سورج مکھی تھی کوئی گلفام
زبس ہر نازنیں تھی غیرت گل | دل لالہ نے کھایا شرم سے گل
جو دیکھے ان کے گیسو پیچ در پیچ | کہا سنبل نے اب ہے زندگی ہیچ
نظر آئے وہاں پر رام و لچھمن | بشکل آفتاب و ماہ روشن
خدا جانے ملک ہیں یا بشر ہیں | بظاہر صورت شمس و قمر ہیں
ہوا سیتا پہ جب یہ آشکارا | ہوئی سو دل سے مشتاق نظارہ
زبس وہ ہم نشیں تھی شوخ و گستاخ | دکھائے دونوں گل در پردۂ شاخ
نظر آئے جو رشک گل وہ رخسار | ہوئی مانند بلبل عاشق زار
جو دیکھے اس نے روئے شوخ و طناز | تو آنکھیں شکل نرگس رہ گئیں باز
نظر آئے جو قد بے ساختہ وہ | ہوئی قمری صفت دل باختہ وہ
ہوئی سیتا جو روئے رام سے شاد | نہ کی جنبش وہاں سے شکل شمشاد
ادھر سے رام نے سیتا کو دیکھا | ہوئے سو جان و دل سے اس پہ شیدا
جو گل تھے ہو گئے مانند بلبل | جو بلبل تھے ہوئے وہ صورتِ گل

شکوہ الفاظ و چستیِ بندش سے ساری راماین مزین ہے۔ مثلاً دھنک جگ کے موقع پر کلام کا آغاز یوں کیا ہے :-

ہوا جب مطلع خورشید روشن | گلستان جہاں میں جلوہ افگن
ہوا مشرق سے ظاہر عارضِ حور | رخِ عالم پہ چمکا پرتوِ نور
اڑا زاغ سیاہ شب جہاں سے | ہمائے روز نکلا آسماں سے

ہوئی قوس ہلال شب شکستہ　　عروس صبح نکلی دست بستہ
فلک پر شاہد خورشید آیا　　در شبنم کا زیبا ہار لایا
ہوئی بس دھوم آئے رام لچھمن　　اودھ کے شاہزادے صید افگن
وہ شاہوں میں نظر اس طرح آئے　　ستاروں میں قمر جس طرح آئے
نہ ہو کس طرح شاہوں میں مفخر　　کہ وہ ذرے تھے یہ خورشید انور

دھنک ٹوٹنے پر تلسی داس نے پرسرام اور لچھمن کی تکرار کو نہایت دلچسپ انداز سے پیش کیا ہے۔ خورسند نے بھی تلسی داس کی رامائن کا ہو بہو چربہ نہایت کامیابی کے ساتھ اتارا ہے۔ تمثیلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ پرسرام یوں کہتے ہیں ؎

ادب سے روبرو مرشد کے کر بات　　نہیں زیبا ہے گستاخانہ ہر بات
برادر کا نہیں تجھ کو ادب ہے　　یہ گستاخی ترے حق میں غضب ہے
نہیں واقف ہے میرے زور و بل سے　　کہ دشمن چھتری کا ہوں ازل سے
تبر ہو جس طرف میرا شرربار　　قیامت اس جگہ پر ہو نمودار
تو ہے کج فہم از بس شوخ و ناداں　　رواں ہے گو شمالی تیری اس آں
کہا لچھمن نے اے فخر برہمن　　ترا احوال ہے عالم میں روشن
تری شائستگی ظاہر ہے سب پر　　کہ اپنی قتل کی بے وجہ مادر
ڈراتا ہے مجھے تو کیا تبر سے　　حذر کر میرے تیر تیز پر سے
خبر رکھتے ہیں تیرے زور سے ہم　　نہیں ہے کوہ کو کچھ کاہ سے غم
جو کی یہ گفتگو لچھمن نے بیباک　　ہوا آتش غضب سے عابد پاک

ہوا غصے سے لرزاں صورتِ برق ہوا افروختہ وہ پا سے تا فرق
ہوا از بسکہ بسوا متر سے گرم کہا یہ بے ادب ہے سخت بے شرم
اسے دہشت نہیں میرے تبر سے مگر عاجز ہے یہ جان و جگر سے
اب اس کا سر ہے اور میرا تبر ہے نہیں میری خبر اسے نامور ہے
تمھارا پاس بسوا متر ہے سب اجل نے ورنہ گھیرا ہے اسے اب
اگر ہے پاس میرا تم کو منظور کرو میری نظر سے تم اسے دور

اودھ سے رام چندر جی جب صحرا کی جانب روانہ ہوئے تو راجہ دسرتھ اور اہل اجودھیا کو بیحد رنج و غم ہوا۔ اس جانکاہ واقعہ کی عکاسی خوشتر نے نہایت پُرسوز طریقہ سے کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جدا جس دم ہوئے وہ غیرتِ باغ دل دسرت نے کھایا لالہ سا داغ
پڑا شہر اودھ میں شور و شیون چلے ہمراہ گریاں مرد اور زن
اودھ میں یہ ہوا رونے کا سیلاب ہوئے ہر جا لبالب نہر و تالاب
زبس تھے غم سے گریاں سقف و دیوار نظر آتے تھے روزن چشمِ خونبار
مکان شاہ کے ہر طاق و منظر بے گریہ تھے شکلِ دیدۂ تر
ہزاروں چشم سے روتا تھا دریا حباب اس کے ہوئے دیدے سراپا
کیا غم سے سحر نے پیرہن چاک اڑائی سر پہ اپنے شام نے خاک
جہاں گریاں تھا سب آہ و فغاں سے فرشتے گل فشاں تھے آسماں سے
دکھوں آنکھ ایسی شہ نے کی بند یکایک جب کہ چھوٹے دونوں فرزند
زمیں پر شاہ تھا اس طرح بیتاب کہ ہو جس طرح سے آتش پہ سیماب

فزوں تھے ہر گھڑی دردِ غم و آہ | بہے لختِ جگر اشکوں کے ہمراہ

میدان جنگ کا نقشہ کھینچنے میں بھی خوشتر نے کمال دکھایا ہے۔ افواج راجہ رام چندر اور کنبھ کرن کے جنگ کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہوا جب کنبھ کرن صہبائے مدہوش | برنگ برق تڑپا وہ بلا نوش
سوئے میداں ہوا راون سے رخصت | چلا دیو لعیں شکل قیامت
لئے ہمراہ لاکھوں دیو خونخوار | ہزاروں کافر و شیطان غدار
ستم گر سنگ دل روئیں بدن سب | شبیہ گرگ و شکل کرگدن سب
ہوا وارد بہ شکل غول ناگاہ | بیابان وغا میں دیو گم راہ
صدائے کوس و قرنا ہر طرف تھی | ندائے قتل و کشتن صف بہ صف تھی

غرض پہونچی ردار و فوج میموں | سر میداں برنگ سیل جیحوں
ادھر سے لشکر دیو سیہ دل | ہوا افواج میموں کے مقابل
مچائی بندروں نے دھوم رن میں | ہوا محشر بپا گویا کہ رن میں
اڑائی خاک دیوں نے زمیں پر | اندھیرا چھا گیا چرخ بریں پر
کیا دیوں نے حملہ بندروں پر | گرے ریچھوں پہ کافر شکل اژدر
بچا باقی نہ کوئی بندروں سے | کئے زخمی جز و کل خنجروں سے
رواں تھے تیر و خنجر ہر طرف سے | صدا تھی دھر پکڑ کی ہر طرف سے
یہ اس دم گرم بازار قضا تھا | قیامت خیز میدان وغا تھا
بہم لڑتے تھے قرس و دیو مدہوش | قضا کھولے ہوئے پھرتی تھی آغوش

صفائی زبان و روانی کلام

چلے جس وقت اودھ سے رام لچھمن
گرا لنکا میں سر سے تاج راون

ہوئی بیداد گر کو بدشگونی
دکھائی نیک بختی نے زبونی

سفر میں رنج ہے اندوہ و غم ہے
وطن کا چھوٹنا یار و ستم ہے

نہ دکھلائے خدا رنجِ غریبی
کہ ہے رہنا وطن کا خوش نصیبی

رامائن خوشتر پر تبصرہ

گذشتہ ایک صدی کے اندر اردو ادب نے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ ہمہ گیر ترقی کی ہے، جس کی بدولت آج اردو زبان و ادب دنیا کے بڑے سے بڑے ترقی یافتہ ادب کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف حصے تک اردو ادب کے خزانے میں ایک نظم کی ایک بہت بڑی کمی تھی۔ اس میں ہومر کی ایلیڈ، ورجل کی اینیڈ، ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ، ویاس کی مہابھارت، والمیک کی رامائن اور فردوسی کے شاہنامہ کی طرح کی کوئی تصنیف نہ تھی۔ یہ کمی کسی قدر انیس کے مراثی سے دور ہوئی۔ مگر مراثیٔ انیس کو ہم درحقیقت ایک نظم نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان میں ایک نظم کی بہت سی خصوصیات کی کمی ہے۔

منشی جگن ناتھ سہائے خوشتر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ رامائن کی مسلسل داستان کو اردو میں نظم کر کے انھوں نے اردو ادب کے خزانے میں

ایک ایپک نظم کا بیش بہا اضافہ کیا۔ یہ نظم والمیک کی راماین کی طرح ایپک نظم کی تمام خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کے کردار وہ غیر معمولی اور عظیم المرتبت افراد ہیں جن کا شمار ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ کے کردار کی طرح ملائک وجنات میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملائک وجنات کے مابین جو کشیدگی اور جنگ ہوگی وہ ایک عظیم جنگ ہوگی۔ جس کے بیان میں ایک قادر الکلام شاعر حسب دلخواہ اپنا زور بیان اور گرمیٔ کلام صرف کر سکتا ہے۔

پُر شکوہ الفاظ و تراکیب، دل آویز و نادر تشبیہات و استعارات، چستیٔ بندش، صفائی کلام اور اعلیٰ تخیل و بلند مضامین کے لحاظ سے بھی رامائن خوشتر ایک مایہ ناز تصنیف ہے۔ اپنے محاسن کلام اور خوبیٔ بیان کے باعث ہی یہ تصنیف بیحد مقبولیت و شہرت سے سرفراز ہوئی۔ اس گرانقدر تصنیف کو دیکھنے کے بعد کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں رہ گیا کہ اردو ادب میں ہندوؤں کے مذہبی عناصر کی خامی ہے۔ اس تصنیف نے اردو ادب میں ہندوؤں کے مذہبی عناصر کی ایک بڑی حد تک تکمیل کی ہے۔ اپنی اس معرکتہ الآرا تصنیف کے باعث خوشتر بلاشبہ اردو کے مشہور ہندو شاعروں میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔ جب تک یہ غیر فانی تصنیف باقی رہے گی خوشتر کا نام زندہ رہے گا۔

شنکر دیال فرحت لکھنوی

منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی ولد منشی پورن چند کائستھ سکسینہ فن شاعری کے نامی گرامی استاد تھے۔ وہ رائے جواہر سنگھ جوہر کے شاگرد تھے۔ ان کے آبا و اجداد قصبہ بھوگاؤں ضلع مین پوری کے قانون گو تھے۔ ان کے دادا منشی جہان سنگھ نے فرخ آباد میں بود و باش اختیار کی۔ ان کے باپ منشی پورن چند مدت العمر لکھنؤ کے نوابوں اور رئیسوں کی سرکاروں میں عہدہ ہائے جلیلہ پر سرفراز رہے۔

منشی شنکر دیال فرحت لکھنؤ میں غالباً ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی زبانوں کی واقفیت حاصل کی۔ وہ مطبع امریکن مشن لکھنؤ میں بعہدۂ منصرمی مطبع سنگی عرصہ دراز تک ملازم رہے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر تھی۔ جن میں منشی لالتا پرشاد شفق، منشی رام سہائے تمنا اور منشی دوارکا پرشاد افق وغیرہ بہت مشہور شاعر ہوئے ہیں۔

خوشتر کی طرح فرحت کا بھی فطری میلان مذہبی واقعات کو منظوم کرنے کی طرف تھا۔ فرحت نے ۱۸۶۶ء میں راماین منظوم کہہ کر دنیائے سخن میں ناموری حاصل کی۔ علاوہ اس کے شیو پران منظوم، پریم ساگر منظوم، جانکی بجے منظوم، گنیش پران منظوم، گوری منگل، پدم پران، ادبھت راماین، سکست چالیسی اور بشنو سہسر نام وغیرہ بھی تصنیف کیں جو طبع ہو کر مقبول ہوئیں[1]۔

---

[1] ماخوذ از تذکرہ شعرائے ہنود مرتبہ دیبی پرشاد بشاش ص۱۱۰، ص۱۱۱

بشنو سہسر نام کی خاص صفت یہ ہے کہ ہزار نام ضبط ہیں اور صرف ناموں ہی سے اشعار موزوں ہیں۔ موزونی شعر قابل تعریف ہے اس میں ایک لفظ بھی زائد نہیں ہے۔
رامائن فرحت راقم الحروف کو مطالعہ کے لئے دستیاب نہ ہو سکی۔ محض تذکروں میں جو انتخاب ملا اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔

انتخاب از رامائن فرحت[1]

جانکی جی شری رام چندر جی کے ساتھ صحرا کو جانے کے لئے رانی کوشلیا سے اجازت مانگتی ہیں۔ لیکن کوشلیا بضد ہیں کہ وہ رام کے ہمراہ نہ جائیں کیونکہ جنگل میں جانا اپنے اوپر تباہی و بربادی لانا ہے ؎

جناب جانکی نے جب سنا حال
تو جوش گریہ سے آنکھیں ہوئیں لال

ہوئی آسائش خاطر فراموش
اڑا اوج ہوا پر طائر ہوش

نہ تھا ضبط شکیبائی کا یارا
ہوئی شوہر کی فرقت ناگوارا

حیا نے آکے گو دامن لیا تھام
مگر جوش محبت نے کیا کام

خیال آیا کہ ہمراہی میں رہیئے
صبا بن کے ہوا خواہی میں رہیئے

پئے پابوسی خوش دامن خاص
ہوئیں حاضر براہ لطف و اخلاص

کہا مجھ کو بھی ارشاد سفر ہو
کہ تسکینِ دل و جان و جگر ہو

سنی جس دم یہ خوش دامن نے گفتار
کئے دامن کے پرزے جیب کے تار

کہا رو کر کہ اے سرمایۂ عیش
بنائے ناز کی پیرایۂ عیش

---
[1] تذکرہ ہندو شعرا مولفہ منشی شیام سندر لال برق سیتاپوری

تمھیں ہو رونق کاشانۂ دل　　تمھیں نورِ چراغ خانۂ دل
مکان بادشاہی میں کرو چین　　رہو دل میں مثال مردم عین
متاع ننگ و ناموس شہنشاہ　　کرو غارت نہ بن میں جاکے ہمراہ
سفر میں حاصل بیم و ضرر ہے　　حقیقت میں سفر مثل سقر ہے
کہاں پائے حنائی رشک گلزار　　کہاں نشتر صفت نوک سر خار
رگ گل پائے نازک میں جو گڑ جائے　　جبیں پر چین شکن ابرو میں پڑ جائے
گراں ہے جبکہ خوشبوئے گل تر　　سہے گی کب غبار بادِ صرصر

دھنک توڑنے کے موقع پر جو ہنگامی کیفیت ہوئی ہے اس کی تصویر کشی کس حسن و خوبی سے کی ہے ؎

دھنک کو توڑ کر پھینکا زمیں پر　　اندھیرا چھا گیا عرش بریں پر[1]
ہوا آثار محشر مچ گیا شور　　چھپے گوشوں میں مرغ و ماہی و مور
پرندوں کے اڑے ہاتھوں کے طوطے　　یکایک چونک اٹھے دریا کے سوتے
جو من میں دیوتا پھولے جزو کل　　تو کی اوج فلک سے بارش گل
پھڑک اٹھے جنک سیتا ہوئیں شاد　　خوشی سے خانۂ خاطر تھا آباد
بہمراہ جلیساں حسب آئین　　جناب جانکی محفل میں آئیں
لباس نو عروسی زینت بر　　بسا عطر و گلاب و مشک و عنبر
جناب رام کے پاس آکے فی الحال　　پنہا دی پھول کے پھولوں کی جیمال
ہوئے شاداں دل ناشاد ہر سو　　مچا شور مبارک باد ہر سو

---

[1] تذکرہ شعرائے ہنود مرتبہ منشی دیبی پرشاد بشاش صلا

فرحت اپنے زمانے کے ایک نامور شاعر، فن سخن کے استاد اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ ان کے شاگردوں میں منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی ایک قادر الکلام شاعر ہوئے ہیں۔ فرحت کا گرانقدر ادبی کارنامہ ہندوؤں کی متعدد مذہبی کتب کو اردو نظم کا دلکش جامہ پہنانا ہے۔ اس طرح اردو زبان میں ہندوؤں کی مذہبی کتب کا منظوم ترجمہ کرنے کا جو نیک اور اہم کام خوشتر لکھنوی نے شروع کیا تھا اس کی ایک بڑی حد تک تکمیل فرحت کے ہاتھوں ہوئی۔ فرحت کا کلام بھی محاسن زبان اور لطافت بیان سے مالامال ہے۔ چنانچہ منشی دیبی پرشاد بشاش فرحت کے کلام کی نسبت یوں رطب اللسان ہیں[1] "ان کی نظم میں ایک خاص لطف ہے۔ اس میں فصاحت اور بلاغت دونوں موجود ہے اور صنائع و بدائع مزید برآں۔ لفظوں کی چستی اور قافیوں کی درستی جو ان کے اشعار میں دیکھی جاتی ہے اس کی تعریف کہنے میں نہیں آتی۔ گویا سخن کا ایک دریا جوش مار رہا ہے۔ اس سے جو موج اٹھتی ہے وہ معانی کے شاہوار موتیوں کا مینہہ برسا جاتی ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ کلام مختصر اور مطلب سے پُر ہے۔ مضمون عالی اور خیال نازک، بندش چست، ردیف و قافیہ سے درست اور فضول و زوائد سے خالی ہے۔"

---

[1] تذکرۂ شعرائے ہنود مرتبہ بشاش صفحہ ۱۱

۴۔ گور سہائے ملتجی کاکوروی

منشی گور سہائے ملتجی قوم کائستھ سری واستو قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے باشندہ تھے۔ وہ کلکٹری ضلع اناؤ میں ناظر تھے۔ کرشن جی کے بہت بڑے بھگت تھے۔ پنشن سے فیضیاب ہو کر بندابن میں عزلت نشینی اختیار کی۔ سنہ ۱۹۱۰ء کے قریب داعی اجل کو لبیک کہا۔ اردو، فارسی، ہندی اور سنسکرت زبانوں کے ماہر تھے۔

ملتجی کی مایہ ناز تصنیف نظم "سدا ماچرتر" ہے جسے انھوں نے سمبت ۱۹۶۶ بکری مطابق سنہ ۱۹۰۹ء میں تصنیف کی تھی۔ اس وقت تک سداما چرتر پر سب سے اچھی کتاب یہی ہے۔ سداما چرتر مسدس کی شکل میں ہے جس کے بیچ بیچ میں غزلیں، گیت، دوہا اور سورٹھا وغیرہ بھی لکھ کر نظم کی دلچسپی اور تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔ یہ نظم چھیاسی صفحات پر مشتمل ہے۔ سداما چرتر ایک گلستان تصوف ہے جس میں شاعر نے اردو، فارسی اور ہندی کے خوش نما پھولوں کی کیاریاں سجائی ہیں اور جن کی سیر سے دل کو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ فصاحت و بلاغت، انتخاب الفاظ اور چستیٔ بندش و روانی کے لحاظ سے بھی یہ نظم نہایت قابل تعریف ہے۔ اس نظم میں شاعر نے استعارات کے استعمال میں انتہائی جدت و ندرت سے کام لیا ہے۔

انتخاب کلام از سداماں چرتر

ایک ہر بھگت برہمن تھا سداماں مفلوک　　　جز دولت کے وہ رکھتا تھا جبیں محکوک
عیش و عشرت تھی زمانہ کی سب اس کی متروک　　　کرشن کے دھیان میں لگتی تھی اسے پیاس بھوک
رات دن کنج قناعت میں گذر کرتا تھا
زندگی زہد و ریاضت میں بسر کرتا تھا

فکر تھی اس کی خواہی میں الم خدمت گار　　　فقر و فاقہ وہ عصا دار تھے فرمانبردار
بوریا مسند و قالین تھے ہم قصر و حصار　　　گرم رہتا تھا غم و درد کا ہر دم دربار
خامشی لب پہ جو تھی مہر سلیمانی تھی
ضبط سے باب توکل کی نگہبانی تھی

خرقہ بر دوش نہ تنزیب نہ کمخواب سے کام　　　کملی رہتی تھی دو شالے کی طرح سر پہ مدام
علم تھا اس کی عملداری میں اور حلم غلام　　　دین و ایمان سے تن و جاں کا تھا انجام مدام
تنگ اس کے لئے ساعت ویرانہ تھا
جھونپڑا غلغلۂ زہد سے خسخانہ تھا

ایک روز سوشیلا (سداماں کی بیوی) اپنی بے سر و سامانی کا گلہ سداماں سے کرتی ہے۔ اس واقعہ کی ملتجی نے نہایت موثر تصویر کھینچی ہے۔ دو بند نمونہ کے لئے ملاحظہ ہوں ؎

ایک دن اس نے کہا اے شہ بے برگ و نوا　　　گھر میں لوٹا ہے نہ تھالی نہ پتیلی نہ توا
آپ کے ہوتے یہ تکلیف نہیں مجھ کو روا　　　اس مرض کی نہیں کیا آپ کی حکمت میں دوا

فقر و فاقہ سے تو ہلک کوئی آزار نہیں
پر یہ حیرت ہے کہ تم کو خلش خار نہیں

تم تو صحرا ئے قناعت کے ہوئے گوشہ گزیں — میں ہوں خدمت کے لئے آپ کی اک پردہ نشیں
دکھ کہاں تک یہ زمانے کے سہے جان حزیں — حیف صد حیف فلک دور ہے اور سخت زمیں

کیا گلہ کیجئے اس بے سروسامانی کا
اپنی کمبختی کا اور آپ کی نادانی کا

سداماں اپنی بیوی سوشیلا کو صبر و قناعت اور زہد و ریاضت کی تلقین کرتے ہیں۔ اس عنوان پر بلتجی کے معجز نگار قلم نے جو کرشمے دکھائے ہیں اس کے تین بند ملاحظہ ہوں ؎

تجھ کو ہے رغبت زر مجھ کو نہیں اس کی ہوس — تجھ کو ہے میل گہر مجھ کو نہیں اس کی ہوس
تجھ کو درکار ہے گھر مجھ کو نہیں اس کی ہوس — تجھ کو راحت پہ نظر مجھ کو نہیں اس کی ہوس

میں کسی رخت مسرت سے نہیں ہوں ناکام
مل گیا ہے مجھے جس روز سے ہیرا ہر نام

یہ وہ ہیرا ہے کہ دن رات درخشاں ہے یہ — درۃ التاج شہ کشور عرفاں ہے یہ
زینت نور تن ساعد ایماں ہے یہ — قشقۂ ناصیہ ماہ جبیناں ہے یہ

چھوڑ کر اس کو ٹری حرص ہوا کے پالے
کچھ بھی غیرت ہو جو تجھ کو تو یہ ہیرا کھالے

فکر میں عمر گرانمایہ تو کیوں کھوتی ہے — اس قدر زر کے لئے زار تو کیوں ہوتی ہے
غور کر دیکھ تو ہر نام بھی کیا موتی ہے — اس کا دکھ کچھ بھی نہیں سکھ کے لئے روتی ہے

سود مند تو نہ ایں آہ و فغاں خواہد بود
آنچہ بر لوح نوشت است ہماں خواہد بود

سداماں مانگنے کی برائی سوشیلا سے یوں بیان کرتے ہیں ؎

مانگنا خوب نہیں جان مرا کہنا مان — کیوں بنی جاتی ہے نادان مرا کہنا مان
اس سے گھٹ جاتی ہے سب شان مرا کہنا مان — اس سے راضی نہیں بھگوان مرا کہنا مان

مانگ ہے سر پہ ترے مانگ تو کیا دیتی ہے
مانگ چھوٹے ہوئے بالوں کو بندھا دیتی ہے

سوشیلا مانگنے کو روا سمجھنے کے لئے جو دلیلیں پیش کرتی ہے اس کے متعلق ملتجی نے کئی دلچسپ بند لکھے ہیں۔ صرف دو بند ملاحظہ فرمایئے ؎

مانگنا ان سے نہیں خوب جو ہوں آپ سے کم — مانگنا ان سے نہیں خوب جو کرتے ہیں ستم
مانگنا ان سے نہیں خوب جو رکھتے ہوں الم — مانگنا ان سے نہیں خوب جو ہوں ہیچ ادھم

مانگ وہ شے ہے کہ موتی سے بھری جاتی ہے
اپنے دولہا کی دلہن مانگ سے کہلاتی ہے

چاہتا کون نہیں ناموری دنیا میں — کون ہے بار تعلق سے بری دنیا میں
کون کرتا نہیں دریوزہ گری دنیا میں — طبع نعمت سے کہو کس کی بھری دنیا میں

عین دریا میں صدف تشنہ رہا کرتی ہے
ابر کو دیکھ کر حسرت سے گھٹا کرتی ہے

سدا ماں چرتر کی غزلوں کے چند شعر

زمیں کے پیسنے کو چال ہے چرخ ستمگر کی
کبھی اس کے سوا چلتی نہ دیکھی آسیا گھر کی

تہی رہتا نہیں گوہر سے دم بھر دامن حسرت
سخاوت آج کل ہے یہ ہمارے دیدۂ تر کی

نگاہ لطف سے ہو جس کے بے غم عمر بھر رہنا
روا ہے کیجئے خدمت جو ایسے کیمیا گر کی

غم دوراں سے کیا ہے غم اگر زیر فلک ہوں
بسی ہے بھگتی کے دل میں صورت شیام سندر کی

آہن ہے گر یہ بخت سیہ کچھ الم نہیں
سنگ در نگار بھی پارس سے کم نہیں

دلبر ہو دلبری پہ تو بیدل ہوں کس لئے
ہے یار غمگسار تو کچھ ہم کو غم نہیں

صد شکر بھگتی کہ بجز آستان شیام
اپنا سر نیاز کہیں اور خم نہیں

۴۔ منشی رام سہائے تمنا لکھنوی

منشی رام سہائے تمنا ساکن محلہ نوبستہ لکھنؤ ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ تمنا خاندانی شاعر تھے۔ چنانچہ ان کے پردادا منشی اودے راج مطلع اور دادا منشی ایشری پرشاد شعاعی فارسی کے مستند شاعر تھے۔ تمنا کے والد کا نام پورن چند تھا جنھوں نے ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔ سولہ برس کی عمر میں اودھ کے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں ملازم ہوئے۔ سررشتۂ تعلیم کی طرف سے اردو میں ایک گزٹ بھی نکالا گیا جس کی ادارت بھی تمنا کے سپرد کی گئی۔ اس گزٹ کو وہ تقریباً

ستائیس برس تک نکالتے رہے۔ ان مشغلوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے شعر و سخن کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ تیرہ سال تک ضلع اناؤ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد مئی ۱۹۱۰ء میں پنشن پائی۔

تمنا شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ اپنے کلام کی اصلاح زیادہ تر اپنے ماموں شنکر دیال فرحت سے لیا کرتے تھے۔ اشاعتِ علم کی غرض سے انھوں نے اپنے والد کی نگرانی میں تمنائی پریس جاری کیا اور اخبار تمنائی نکالا۔ اور ان کے چھوٹے بھائی آفق نے نظم اخبار جاری کیا جو شروع سے آخر تک نظم میں ہوتا تھا۔ یہ اخبار بھی تمنائی پریس میں چھپتا تھا۔

تمنا نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ رسالہ دربار میں جسے انھوں نے پنشن پانے کے بعد جاری کیا تھا۔ خود تحریر فرماتے ہیں: "واضح رہے کہ میرا زیادہ تر کلام ایسا ہے جو تاریخی واقعات، مثنوی، مسدس، مخمس، رباعیات اور دیگر مضامین اخلاقی و مذہبی وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ غزلیں کسی خاص موقع پر لکھنا پڑی ہیں۔ تاہم اگر کل غزلیات فراہم ہو سکیں تو ان کی بھی کافی تعداد ہو سکتی ہے۔"

تمنا کی شاعری کا خاص رخ مذہبی اور اخلاقی تھا۔ چونکہ اردو زبان میں اہل ہنود کی مذہبی کتب کی بہت ضرورت تھی اس لیے تمنا نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں کئی قسم کی رامائنیں، بھجن اور استتیں وغیرہ شامل ہیں۔ تمنا ایک ایک بڑے شاعر ہونے کے علاوہ بڑے نثار بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے مدارس کے لیے متعدد کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تمنا کی جملہ تصنیفات کی تعداد قریب

دو سو ہے جن میں چند خاص خاص کتابوں کے نام یہ ہیں:-

کتب مذہبی

بھگوت گیتا منظوم، رام لیلا منظوم، بشن لیلا منظوم، سری رام لیلا، خلاصہ رامائن، رام سجیون بوٹی، بچتر رامائن، تسکشا دلی رامائن، نغمۂ رامائن، ترانۂ رامائن، سیتا پرتیاگ، گنگا جی کی توتیر، دھروکا جیون چرتر، ہنومان چالیسا، بجرنگ ساٹھکا، بجرنگ چالیسا، بشن چالیسا، گیتا مہاتم، کرشن استت، چندر کا استت، نورتن استوتر، دھرم درپن، سداماں چرتر مع سبری چرتر، کرشن چرتر، سناتن دھرم ساگر، کرشن چمتکار بال کانڈ، سندر کانڈ، کرم بپاک، رہس پنچ ادھیائی اور گوپال چرتر وغیرہ۔

قومی نظمیں

کائستھ پرکاش، کائستھ سنگیت، چترگپت جنم، سناتن دھرم مہاسبھا اور یادگار کائستھ کانفرنس وغیرہ۔

ادبی و اخلاقی کتب

نظم دل پذیر، گلدستۂ باغ کشمیر، آرائش خلوت، گلزار فرنگ (رومیو و جولیٹ کا اردو ترجمہ عاشقانہ مثنوی کی شکل میں)، سلک گہر (ایک دلچسپ مثنوی)، ہیملن کے تونبی باز کا اردو میں منظوم قصہ، طلسم بنگال، فریاد بیگان ہند،

نظم مفید الترکیب، زیور حیات، نافع صحت اور تشریح رباعیات عمر خیام وغیرہ۔

درسی کتب

رسالہ اردو نویسی، رسالہ خط شکست، تعلیمی جنتری، اسکول ڈکشنری اور رسالہ مضامین اخلاقی وغیرہ۔

تاریخی کتب

احسن التواریخ اودھ، افضل التواریخ اودھ، اشرف التواریخ اودھ، نیپال سماچار، گلگشت باغ لکھنؤ، یادگار دربار تاج پوشی ۱۹۱۱ء، یادگار ریاست الور اور یادگار جوبلی راجہ صاحب دربھنگہ وغیرہ۔

گلزار فرنگ (شیکسپیر کے مشہور عاشقانہ ڈرامہ رمیو و جولیٹ) کو نہایت دلچسپ انداز سے اردو مثنوی کی شکل میں نظم کیا ہے۔ طلسم بنگال یعنی سرلا کا بنگالی ڈرامہ یا زن مریدی کا اعمال نامہ تمنا کی ایک نہایت قابل قدر تصنیف ہے۔ یہ بیس ورق کا ایک منظوم ڈرامہ ہے۔ شاعر نے تمام ڈرامہ کو چند غزلوں کی شکل میں منظوم کر کے اپنی استادی اور قادر الکلامی کا جوہر دکھایا ہے۔ زبان کی لطافت اور روزمرہ و محاورہ کی چاشنی سے سارا ڈرامہ ایک طلسم سا بن گیا ہے۔

ان کی مذہبی و دیگر نظموں کا انداز حقانی ہونے کے علاوہ اخلاقی اور ناصحانہ بھی ہے۔ بقول حضرت منور لکھنوی وہ فطرت سے ایک خدا پرست، اخلاق پسند اور پاکیزہ طینت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ہر قسم کے واقعات کو نظم

کرنے میں تمنا کو بیحد مشاقی اور کمال حاصل تھا۔

تمنا کی اہلیہ شریمتی کشن پیاری بھی ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتی تھیں۔

تمنا کے سب سے بڑے اور ہونہار فرزند پروفیسر سیتلا سہائے کا انتقال صرف ستائیس برس کی عمر میں ۱۹۰۶ء میں ہو گیا جس کا انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ ان کے بقیہ دو صاحبزادے ڈاکٹر لکشمی سہائے اور ڈاکٹر گوری سہائے ہیں۔ تمنا نے مئی ۱۹۳۲ء میں انتقال کیا۔ تمنا کے دو اور چھوٹے بھائی تھے۔ ایک منشی ماتا پرشاد نیساں اور دوسرے منشی دوارکا پرشاد افق تھے۔ افق بہت مشہور و معروف شاعر ہوئے ہیں۔ ان کی تصنیفات کی تعداد بھی کثیر ہے۔ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی افق کے صاحبزادے ہیں۔

تمنا کے مذہبی کلام کا نمونہ

تلسی داسی رامائن سے چند بند ملاحظہ ہوں جو ان کے اس میدان میں کمال کا نمونہ ہیں ؎

اس طرف خالی جو میدان ہوا راون آیا
دان لینے کے لئے بن کے برہمن آیا

جانکی سمجھیں نہ ہرگز کہ یہ رہزن آیا
تھیں تو عورت ہی نہ جانا کوئی بدظن آیا

خط تھا محدود حفاظت کو وہ اندر ہی رہیں
کہا راون نے دیا جاتا ہے یوں دان کہیں

جانکی جی نے دیا صدمے سے نکل کر جب دان — بن گیا اہل دغا بس وہیں پورا شیطان
جانکی جی کو اٹھائے گیا فوراً نادان — اب تو فرقت کا نظر آ گیا پورا سامان

رام و لچھمن جو پھرے دشت سے گھر خالی تھا
جانکی جی تھی نہاں کیسۂ زر خالی تھا

اس جدائی کا اب احوال قلم کیا لکھے — حالت کلفت و اندوہ و الم کیا لکھے
کلک پر درد یہ کیفیت غم کیا لکھے — حال بیتا بی ارباب حشم کیا لکھے

خلق کو واقعہ جانکاہ یہ سمجھاتا ہے
کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہی پیش آتا ہے

راون کی بد فعلی کا حال سنئے

یہ نہ دیکھا کہ ہنسیں گے مجھے دنیا والے — چند دن بعد ہی جینے کے پڑیں گے لالے
کب وہ سادھو ہیں جو آفت کے بنے پرکالے — غیر کے ٹھگنے کو مالے ہیں گلے میں ڈالے

راون ایسے بنے جو سادھو ہیں دھکار ان پر
قہر خالق کا چلا کرتا ہے ہتھیار ان پر

بیجا نہ ہوگا اگر تمنا کی مثنوی کے بھی چند اشعار نمونتاً پیش کیے جائیں تاکہ ان کے کلام کی دیگر خوبیوں کا بھی اندازہ ہو سکے۔ روزمرہ و محاورات کے استعمال میں تمنا کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

مثنوی "سلک گہر" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ یہ اس موقع پر لکھے گئے ہیں جب لندن کے ایک جوہری سے ایک جعلی ڈیوک نے تین لاکھ روپے کی قیمت کا موتیوں کا ایک ہار بنوایا اور ہار اس کے ہاتھ سے لے کر اسے اپنے

ایک ساتھی کے ساتھ ایک مکان نما غبارے میں آسمان پہ اڑا دیا۔

غبارے نے ہوش ادھر اڑایا — جیت ان کی ہوئی جو ہار پایا
وہ اونچا ہوا ادھر کئی ہاتھ — اندھے کے بٹیر لگ گئی ہاتھ
بلی کے جو بھاگوں چھینکا ٹوٹا — بے رحموں نے مال نعمت لوٹا
گردوں پہ تھا جوہری ناکام — موتی آندھی کے ہو گئے آم
غبارہ اڑا جو بے تحاشا — دیکھا گھر پھونک کر تماشا
یاد آئی جو ہار کی صفائی — اڑنے لگی چہرے پر ہوائی
ہم چال سے اپنی ہو گئے مات — پو بارہ ہیں دشمنوں کے ہیہات

مثنوی "گلزار فرنگ" (رومیو و جولیٹ کا اردو ترجمہ) تمنا کی مایہ ناز تصنیف ہے جس میں انھوں نے تشبیہات و استعارات اور دیگر صنائع و بدائع کے استعمال سے کلام کے لطف کو بیحد بڑھا دیا ہے۔

جولیٹ کے حسن کا بیان اور اس کے حسن پہ رومیو کے عاشق ہو جانے کا ذکر نہایت دلکش پیرایہ میں کیا ہے۔ چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں ؎

تھا جولیٹ اس کا نام مشہور — تھی مایۂ حسن چشم بد دور
اختر تھے سب اور اہل محفل — یہ بیچ میں مثل ماہ کامل
وہ قد کہ قیامت اس سے پیدا — وہ سرو کہ فاختہ ہو شیدا
گھونگھر والے تھے بال سر کے — الجھے دل، پائے ہوش سر کے
جوڑا نہ وہ فرق پہ بندھا تھا — عاشق کا دل کسا ہوا تھا
تھے صورت دام سوئے پیچاں — تل دانہ تھا بہر طائر جاں

ابرو شمشیر خونفشاں تھی / خمدار تھی صورت کماں تھی

اس آنکھ سے جو آنکھ لڑائے / اندھا قسمت کا آنکھیں پائے

پلکوں پہ نثار ہر نظر تھی / چلمن درِ چشم یار پر تھی

ہر نوک مژہ تھی سربسر تیز / برچھی تھی کہ نشتر شرر ریز

تھے گال گلاب کی طرح لال / یا سرخ شراب کی طرح لال

رخساروں کا وصف کب بیاں ہو / دو ماہوں کا سامنا جہاں ہو

لب دونوں ہلال چرخ امید / چمکاتے تھے خود ہی قسمت عید

نازک گوری عجب کلائی / جس نے دیکھی نہ پھر کل آئی

سائے میں تھے دو حباب پنہاں / یا ابر میں آفتاب پنہاں

پتلی پتلی تھیں انگلیاں نرم / تھی پنجۂ آفتاب کو شرم

سایہ جو اٹھا اٹھا کے چلتی / سایہ کا بھی اپنے دل کچلتی

القصہ وہ سر سے لے کے پا تک / سرمایۂ دلبری تھی بے شک

انساں تھی کہ صورت پری تھی / ہر عضو میں نازکی بھری تھی

دیکھی جو یہ رومیو نے صورت / پیش آگئی عشق کی ضرورت

در پردہ لگا وہ عشق کا تیر / تڑپا سرِ خاک مثل نخچیر

آنکھوں میں بسی جو اس کی تصویر / دلدادہ ہوا اسی کا دلگیر

قابو نہ رہا دل و جگر پر / ٹوٹا کوہِ ملال سر پر

جی رہ گیا بس ترس ترس کے / بڑھنے لگے حوصلے ہوس کے

دل پہلو میں اس طرح تھا بیتاب / آتش پہ نہ ٹھہرے جیسے سیماب

بول اٹھا نہ تاب ضبط لایا — اس بت کو یہ حال دل سنایا
محفل کی تو ہی آبرو ہے — ان آنکھوں میں میرے تو ہی تو ہے
ہے جسم کی میرے جان تو ہی — ہے حُسن کی آن بان تو ہی
تو روح ہے میں ہوں قالب خاک — تو دافع رنج میں ہوں غمناک
تو قاتل صف شکن میں بسمل — تو دلبر مہ جبیں میں بیدل
تو گل ہے تو میں ہوں بلبل زار — تو سرو میں قمری دل افگار
تو باد سحر غبار ہوں میں — تو غنچۂ باغ خار ہوں میں
پروانہ میں تو ہے شمع محفل — دیوانہ میں تو حسین کامل
تو صاحب زر میں زار ہوں میں — تو فخر زمانہ خوار ہوں میں
تو بحر ہے، نقش آب ہوں میں — تو آب رواں حباب ہوں میں
میں مثل کتاں ہوں ماہ ہے تو — میں شکل گدا ہوں شاہ ہے تو
تو مہر صفت ہے زیب افلاک — میں صورت ذرہ برسر خاک
ہو حسن کا تیرے بول بالا — میں ناز ترا اٹھانے والا

تمنا کی نیچرل و قومی نظمیں، رباعیات و غزلیں بخوف طوالت یہاں نظر انداز کی جاتی ہیں۔

۵- دوارکا پرشاد افق لکھنوی

ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ محلہ نوبستہ لکھنؤ کے رہنے والے اور قوم کے کائستھ سکسینہ تھے۔ افق منشی پورن چند کے تیسرے اور سب سے چھوٹے لڑکے تھے۔ منشی رام سہائے تمنا اور منشی ماتا پرشاد نیساں ان کے بڑے بھائی تھے۔ چنانچہ افق کو خاندانی شاعر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ دورِ حاضر کے نامور شاعر منشی بشیشور پرشاد منور افق کے فرزند ہیں۔

افق کی ابتدائی تعلیم کیننگ کالج میں ہوئی۔ فارسی، اردو اور ہندی کی تعلیم گھر پر پائی۔ انگریزی زبان کی تعلیم کم حاصل کی۔ افق منشی شنکر دیال فرحت کے شاگرد اور طرز سخن میں شیخ ناسخ اور خواجہ وزیر کے پیرو تھے۔ نہایت خلیق اور بردبار تھے، مگر شاعرانہ خودداری بہت رکھتے تھے۔ کبھی اپنے کلام پر کسی کا اعتراض برداشت نہیں کرتے تھے۔ کثرتِ مے نوشی کے باعث آخر عمر میں ان کی صحت بگڑ گئی اور ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء کو بعارضہ اسہال انتقال کیا۔

افق ایک مذہبی شاعر تھے۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ افق نہ صرف اپنے خاندان کے لئے بلکہ ساری قوم کے لئے ایک مایۂ ناز ہستی تھے۔ تمام ملک نے ان کے زورِ قلم کا لوہا مانا ہے۔ والیانِ دکن کی شان میں انھوں نے متعدد قصیدے فارسی میں کہے ہیں۔ ان کے کمالات کے اعتراف میں شاہ ایران کے داماد نے حیدرآباد دکن

میں ایک سند عطا فرمائی تھی۔

ابتدا میں آفق امیر اور داغ کے رنگ سے متاثر ہو کر غزلیں کہتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد انھوں نے اپنی خاص توجہ نظم گوئی اور ٹھوس ادبی کارناموں کی طرف مبذول کی۔ قصیدہ، مثنوی، مسدس، نوحہ، غزل، تاریخ رباعی وغیرہ جملہ اصناف سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔

جس کی بدولت آفق کو شہرت ملی وہ "نظم اخبار" ہے۔ اردو میں 'نظم اخبار' نکالنے کا فخر صرف آفق ہی کو حاصل تھا۔ 'نظم اخبار' بارہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ آٹھ صفحات میں منظوم خبریں شایع ہوتی تھیں جو بیشتر آفق کی نظم کی ہوئی ہوتی تھیں۔ یہ اخبار مہینہ میں دو مرتبہ شایع ہوتا تھا اور ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۶ء تک جاری رہا۔

رامائن یک قافیہ، مہابھارت، گرو گوبند سنگھ کی منظوم سوانح عمری، اور ٹاڈ راجستھان کے تراجم آفق کی لاثانی یادگار ہیں۔ الف لیلیٰ کا ترجمہ اردو نظم و نثر میں کیا جس کی ضخیم جلدیں نول کشور پریس میں موجود ہیں جو شائع نہ ہو سکیں۔

افق نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر ہی تھے بلکہ ایک فاضل ادیب اور صحیفہ نگار بھی تھے۔ شعر گوئی کے علاوہ انھیں نثر نگاری میں بھی زبردست ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ انھوں نے کئی ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ناولوں میں کادمبری، عالم تصویر، زلف لیلیٰ، عشق وفا اور طلسم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ زلف لیلیٰ میں بیگماتی زبان کا لطف پایا جاتا ہے۔ طلسم ایک ناول

چند کانتا کی قسم کا ہے۔ ناول نگاری کے علاوہ آفق کو ڈرامہ نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء کے درمیان جب وہ پنجاب سماچار کے ایڈیٹر تھے، رام ناٹک کلب کی فرمائش پر رامائن کو ڈرامہ کی شکل میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کرشن سداما اور بھیشم پتامہ نامی دو ڈرامے اسی کلب کے لئے لکھے تھے۔ الغرض افق نے عجیب وغریب دماغ پایا تھا۔ ایسی ذہین اور باکمال ہستیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔

آفق کا مایہ ناز شاہ کار رامائن آفق ہے جس میں تقریباً تیرہ سو اشعار ہیں جو ایک ہی قافیے میں ہیں۔ رامائن آفق میں فصاحت زبان اور روانیٔ کلام اس زور کی ہے کہ تمام رامائن میں کہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہو پاتا کہ کوئی شعر فضول یا زائد ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے آپ کی طبیعت اکتائے گی نہیں اور آپ کی دلچسپی میں فرق نہیں آنے پائے گا۔ چند اشعار بطور مثال پیش کئے جا رہے ہیں۔ رام کا حلیہ کتنے حسین پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

دل کو خواہش ہے کہ رگھبر کا سراپا ہو بیاں | کھینچتا ہے رام کی تصویر یوں کلک رواں
نور کی تصویر سر سے پاؤں تک ہیں رام چندر | سانوری صورت پہ سب کو مردمک کا ہے گماں
کان میں کنڈل، مکٹ سر پر، تلک زیب جبیں | مال بیجنتی گلے میں ہاتھ میں تیر و کماں
کان وہ جس نے سنی پہلاد کی آواز درد | دروپدی کی ٹیر گج کی آہ و فریاد و فغاں

بیجا نہ ہوگا اگر آفق کی غزلوں کے بھی چند اشعار نمونہ کے لئے یہاں پیش کئے جائیں تاکہ شاعر کی ہمہ گیر طبیعت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔

تشبیہات کی جدت و ندرت

ہے آنسو چشمِ تر میں عکسِ چشمِ تر ہے آنسو میں
دُرِ غلطاں صدف میں ہے صدف ہے دُرِ غلطاں میں

عاشقِ بے ساز و ساماں سے نہ تم اے مہرباں
رشتۂ اُلفت کو توڑو عہد و پیماں کی طرح

ساتھ غیروں کے نہایا جس گھڑی وہ بحرِ حسن
پھٹ گیا دریا کا دل عاشق کے داماں کی طرح

مضمون آفرینی و شوخیِ بیان

دم میں پھر جائے جو وہ چشم عنایت کیسی
ایک نقطے سے جو زحمت ہو وہ رحمت کیسی

ہوس حور میں بیکار ہے اللہ کی یاد
عاشقی جس سے ہو پیدا وہ عبادت کیسی

شیخ تم حور پہ ہم اپنے صنم پر قرباں
خود فضیحت ہو تو اوروں کی نصیحت کیسی

اشک پینے کو دیئے یار نے غم کھانے کو
کی ہے اس شوخ نے عشاق کی دعوت کیسی

دل بیتاب کو ہے شعلۂ عارض پہ قرار
دنگ ہوں آگ پہ سیماب کو راحت کیسی

عمر کیوں زہد میں اے شیخ گنوائیں عشاق
حور دنیا میں جو مل جائیں تو جنت کیسی

یہی کہتا ہے جو اشعارِ آفق سنتا ہے
پائی ہے اس نے خدا جانے طبیعت کیسی

منزلِ اول کے چلنے سے تھکا میں ناتواں
قبر بیٹھی دست دیا میرے دبانے کے لئے

سوز و گداز

جہاں گلزار میں تم چنتے ہو بکھرے ہوئے تنکے
کبھی میرا ابھی دو دن ہوئے عصفیر و آشیانہ تھا

طیورِ باغ کیوں صیاد تیرے جال میں پھنستے
وہیں تقدیر سے آئی جہاں کا آب و دانہ تھا

آفق ایک نہایت ذہین طبع اور عالی فکر شاعر تھے۔ ان کے کلام سے ان کی شوخیٔ طبع، جدت تخیل اور ندرت بیان کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ زبان کی فصاحت، بندش کی چستی اور روانی بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آفق ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا شمار صف اوّلیں کے ہندو شعرا میں ہوتا ہے۔

د۔ ہندو شعرا کے فارسی کی مشہور کتب کے منظوم تراجم

ہندو شعرا نے اردو زبان کی خدمت انجام دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ انھوں نے نہ صرف ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتب کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا بلکہ فارسی زبان کی مشہور کتابوں کا بھی ترجمہ اردو میں نظم کی شکل میں کر کے اردو کے خزانہ میں گرانقدر اضافہ کیا۔ ایسے شعرا میں منشی مول چند منشی دہلوی اور منشی طوطا رام شایاں لکھنوی کی خدمات نہایت اہم ہیں۔ ان کے مفصل حالات اور ادبی کارناموں پر تنقیدی جائزہ اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

امول چند منشی دہلوی

منشی مول چند منشی قوم کائستھ ماتھر، باشندہ دہلی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ وہ حضرت شاہ عالم بادشاہ دہلی کے دربار میں عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ ایک کہنہ مشق اور باکمال شاعر تھے۔ صاحب دیوان بھی تھے۔ ۱۸۳۲ء میں انتقال فرمایا[1]

مول چند منشی نے شمشیر خانی اور فردوسی کے شاہنامہ کا اردو نظم میں ترجمہ کرکے اردو ادب میں رزمیہ نظموں کا اضافہ کیا ہے۔ اپنے ان منظوم تراجم سے انھوں نے اہل ملک کی رگوں میں شجاعت کی لہر دوڑائی۔ شاہنامۂ اردو منظومۂ منشی ایک سو اسی[۱۸۰] باتصویر صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر تقریباً چوّن[۵۴] سطور اور ہر سطر میں دو شعر درج ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں منجملہ ۱۹۴۰۰ کے قریب اشعار درج ہیں

بہ لحاظ فصاحت زبان اور شیرینیٔ کلام منشی مول چند کی مثنوی شاہنامہ اردو ان کی اعلیٰ زبان دانی اور زبان فارسی پر کمال دست گاہی کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ تمام مثنوی میں فارسی زبان کے فصیح شیریں اور مستعمل الفاظ و تراکیب جاری و ساری ہیں۔ اشعار سے شکوہ الفاظ اور چستیٔ بندش ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہ کتاب جسے مول چند منشی نے ۱۸۰۸ء میں تصنیف کی تھی[2]، اپنے زمانے

---

[1] تذکرہ شعرائے ہنود مولفہ دیبی پرشاد بشاش صفحہ ۱۳۵۔ [2] راقم الحروف کو یہ کتاب الہ آباد میں پنڈت منوہر لال زتشی مرحوم کے کتب خانے میں دیکھنے کو ملی تھی۔

کی اردو زبان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ شیخ سعدی کی بوستاں کی طرح اس مثنوی میں روانی اور صفائی غضب کی ہے۔

چونکہ منشی مول چند کی یہ کتاب اب کمیاب ہے اس لئے بہتر ہوگا اگر اس کا انتخاب کم سے کم اتنا پیش کیا جائے جس سے ان کی قادر الکلامی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

بادشاہ اکبر شاہ کے متعلق چند مدحیہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جہاں دار اکبر شہ بے نظیر　　خداوند تاج و کلاہ و سریر
فروزندہ خورشید برج ہمی　　گرامی در درج شاہنشہی
ہمایوں خصائل شہِ نامور　　خجستہ شمائل فرشتہ سیر
جہانبان و دیں پرور و حق پژوہ　　حقائق شنو شاہ والا شکوہ
محبت رکھے ہے وہ درویش سے　　مروت ہے اس کو وفا کیش ہے
شناور ہے دریائے عرفان کا　　دل اس کا ہے مثل گوہر صفا
فزوں شفقت و خلق و ہمت بلند　　مروت میں یکتا شہِ ارجمند
در دولت شاہ عالم پناہ　　فقیر و غنی کا ہے امید گاہ
بنے کام یاں ہر کسی کا شتاب　　یہاں آکے ہر کوئی ہو کامیاب
یہ وہ بارگہ ہے کہ امیدوار　　نہ محروم یاں سے گیا زینہار
سخاوت میں دیکھا تو بحر سحاب　　حضور اس کے خجلت سے ہے غرق آب
جھکایا یہاں جو سر انکسار　　تو چرخ بریں نے یہ پایا وقار

ابلیس کے ورغلانے سے ضحاک اپنے باپ کو ایک کنوئیں میں گرا کر مار ڈالتا

ہے اور خود تخت نشین ہو کر ملک تازیان کا فرمانروا بن بیٹھتا ہے۔ وہ شیطان کے کہنے پر عمل کرتا ہے اور آخرش ملعون قرار پاتا ہے۔ اس واقعہ کو شاعر نے نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نمونہ کے لئے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

پھر ابلیس بدذات نے یوں کہا — کہ صد شکر اے شاہ کشور کشا
ہوا میری تدبیر سے اب تو شاہ — مبارک تجھے تخت و تاج و کلاہ
مری دانش و عقل و تدبیر پہ — عمل تو کرے ہر شب و روز اگر
تو ہو بادشاہ ہفت اقلیم کا — خداوند ہو تخت و دیہیم کا
سراسر جہاں کی تجھے خوبیاں — میسر ہوا اے بادشاہ جہاں
یہ سن کر ہوا شاد ضحاک شاہ — تملق لگا کرنے شام و پگاہ
نوازش بہت اس پہ مصروف کی — کلید خورش خانہ پھر اس کو دی
پکا ایک دن بیضۂ مرغ واں — خورش کو وہ لایا تو شاہ جہاں
ہوا کھا کے اس کو بہت شادکام — کہ تھا خوشتر و نغز نیکو طعام

اس کے بعد کیا کیفیت ہوتی ہے۔ کس طرح ابلیس اسے ورغلا کر اس کے کندھوں کو بوسہ دیتا ہے اور وہاں دو کالے سانپ پیدا ہو جاتے ہیں اور ابلیس غائب ہو جاتا ہے۔ یہ سب واقعہ منشی کی زبان قلم سے سنئے ؎

وہ ضحاک نے جبکہ کھایا طعام — نہایت ہوا خرم و شادکام
ز روئے عنایت کہا یوں کہ اب — جو کچھ چاہیے مجھ سے کر تو طلب
کیا عرض ابلیس نے پھر شتاب — کہ اے شاہ ضحاک عالیجناب
مری آرزو ہے یہ شام و پگاہ — کہ دوں ایک بوسہ سر کتف شاہ

یہ ضحاک بولا کہ اے نیک خو — ترے دل کی بر لاؤں یہ آرزو
جو کتف اپنے شہ نے برہنہ کئے — تو شیطان نے اس پہ بوسے دیئے
دئے جبکہ بوسے سر کتف شاہ — ہوئے وہیں پیدا دو مار سیاہ
یہ کردار بد کرکے واں آشکار — نظر سے وہ غائب ہوا نابکار

دختر داری زابلستان کا سراپا نہایت دلکش کھینچا ہے۔ مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سپہ دار اور بنگ زابل کا شاہ — رکھے ایک تھا دختر رشک ماہ
سو مہر سے حسن میں خوب تھی — دل آرام و دلدار و محبوب تھی
وہ زلف دوتا اس کی دام بلا — گرفتار جن کا نہ ہوئے رہا
وہ ابرو تھے یا تیغ بران تھے — وہ مژگاں نہ تھے بلکہ پیکان تھے
کئے سیکڑوں اک نگہ سے ہلاک — ہزاروں ملائے تہہ خون و خاک
وہ قامت کہوں یا قیامت کہوں — قیامت سے بالا وہ قامت کہوں
وہ چشم اس کی خونریز مردم مدام — ہوئی جس سے ترکوں کی ترکی تمام
کہوں کیا کہ رفتار نے کیا کیا — کہ ہر گام پر فتنہ برپا کیا
برس پندرہ کی تھی وہ دلستان — خردمند دانشور و نکتہ داں
جواں تھی ولیکن بہ تدبیر پیر — شعور و فراست میں تھی بے نظیر

۲۔ طوطا رام شایاںؔ لکھنوی

طوطا رام شایاںؔ خلف منشی آتما رام سریواستوا باشندۂ لکھنوٗ ایک نامور شاعر تھے۔ ان کے دادا من سکھ رائے اور پردادا رائے منسا رام بڑے نامی گرامی شخص تھے۔ منشی طوطا رام شایاںؔ نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں عہدہ بخشی گری فوج پر ممتاز تھے۔ بعد میں انھوں نے مطبع نول کشور میں ایک عرصہ تک اودھ اخبار کی ادارت کی۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں انتقال فرمایا۔ مہابھارت منظوم، قصہ امیر حمزہ منظوم معروف بہ طلسم شایاں اور الف لیلیٰ منظوم وغیرہ ان کی تصنیفات سے ہیں[1]۔

منشی طوطا رام شایاںؔ بڑے نازک خیال اور خوش گو شاعر تھے۔ طبیعت میں آمد غضب کی تھی۔ رزمیہ نظم لکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ اپنی علمی استعداد ولیاقت سے اردو ادب کو فیضیاب کیا۔

شایاںؔ کی کتاب مہابھارت منظوم[2] تین سو دو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں منجملہ دس ہزار اشعار کے قریب درج ہیں۔ اس مثنوی کی زبان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ فارسی زبان کے مرکبات اور تراکیب کا استعمال بہت کم کیا ہے۔ صنائع وبدائع اور تشبیہات واستعارات کا بھی

---

[1] ماخوذ از تذکرہ شعرائے ہنود مؤلفہ بشاش ۱۹۳۰ء ، [2] راقم الحروف کو یہ کتاب الٰہ آباد میں پنڈت منوہر لال زتشی کے کتب خانے میں دیکھنے کو ملی تھی۔

استعمال بہت کم کیا ہے۔ البتہ روزمرہ و محاورہ کا استعمال بہت خوب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۲ء میں طبع ہوئی ہے۔

نمونہ کلام از مہابھارت

پریچھت نے اک روز بہر شکار
اٹھایا ہرن کی طرف راہوار

ہرن چوکڑی بھر کے پنہاں ہوا
پریچھت نہایت پریشاں ہوا

سیں ایک عابد تھا بیٹھا وہاں
ہرن کا پریچھت نے پوچھا نشاں

وہ عابد تھا بحر عبادت میں غرق
نہ بولا کہ ہوگا ریاضت میں فرق

پریچھت کو فرط غضب سے وہاں
نہ باقی رہا دل میں کچھ خوف جاں

کہ اک سانپ بے جان آیا نظر
نہ تھی پر اسے عاقبت کی خبر

جو نوک کماں سے اوٹھایا اسے
قریب اس رکھیشر کے لایا اسے

حمائل کیا اوس کی گردن میں آہ
لیا اپنی گردن پہ بار گناہ

رکھیشر کا فرزند عالی مقام
کہ کہتے تھے سنگی رکھ اوس کو تمام

جو آنکھوں سے دیکھا بد احوال زار
گلوے پدر میں ہے افعی کا ہار

طبیعت نہایت ہوئی خشمناک
دعا اوس نے کی اے خداوند پاک

ہوا جس سے سرزد یہ کار زبوں
نہ کوئی چلے اس کا مکر و فسوں

جو تچھک بڑا سانپ ہے زہر دار
اسی سات دن میں ہوا اسے دوچار

شمش و پنج کچھ دل میں اصلا نہ لائے
ڈسے اوس کو رستہ فنا کا دکھائے

آخر میں ان کی غزل کے بھی چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اس

فن میں بھی ان کے کمالات اور جوہر کا اندازہ ہو سکے۔ طرزِ ادا نہایت بیباکانہ اور پر شوخ ہے جو اشعار کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے ؎

رحم دل ہم سا کہاں میکدۂ عالم میں — آنکھیں بھر آئیں جو بھرتے کہیں ساغر دیکھا

مصری کرے ذبات ترے لب کے روبرو — کیا کہیے کس قدر ترا شیریں کلام ہے

آئی نہ نظر خواب میں بھی یار کی صورت — دیکھی نہ کبھی طالعِ بیدار کی صورت

دھوم ہے جب سے تمہارے حسن کی — مصر میں یوسف کا ہے بازار بند

بام پر بیٹھو نہ کھڑکی کھول کر — راستہ ہو جائے گا اے یار بند

دیگر ہندو شعرا کے منظوم تراجم

منشی مول چند منشی اور منشی طوطا رام شایاںؔ نے فارسی زبان کی مشہور کتابوں کو اردو زبان میں منظوم ترجمہ کرنے میں کافی شہرت حاصل کی۔ ان کی ادبی خدمات نہایت گرانقدر ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہندو شعرا ہیں جنھوں نے اس طرف خاص توجہ کی۔ چنانچہ منشی شادی لال چمن لکھنوی نے کتاب الف لیلہ جلد چہارم کو نظم کیا جو ۱۸۶۵ء میں طبع ہوئی۔ منشی لالتا پرشاد شفقؔ لکھنوی شاگرد منشی شنکر دیال فرحتؔ نے 'قصۂ چہار درویش' کو نظم میں 'بہارِ شفق' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ دیوان جانی بہاری لال رئیس آگرہ (متوفی ۱۸۹۵ء) کی تصنیفات گلستاں بوستاں اور انوار سہیلی اردو میں طبع ہو چکی ہیں۔ منشی ماتا پرشاد نیساںؔ

لکھنوی (منشی رام سہائے تمنا کے چھوٹے بھائی) نے 'فسانۂ عجائب' کو نظم کیا ہے۔
ان شعرا کے کلام کا نمونہ طوالت کے خوف سے پیش نہیں کیا جا سکا۔

اختتامیہ

اردو زبان کی اہمیت اور تخلیق و ارتقا

اردو زبان ہندوستان کی ایک نہایت مقبول عام اور اہم زبان ہے جو کشمیر سے دکن تک اور افغانستان سے بنگال تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ اہل اسلام اور اہل ہنود کے گذشتہ چھ صدیوں کے اتحاد و ارتباط کا ایک گرانقدر سرمایہ ہے۔

اردو زبان کی تخلیق اس کے ارتقا اور اس کی توسیع و اشاعت میں سیکڑوں ہندو شعرا و ادبا نے ہر دور میں اپنے مسلمان بھائیوں کے دوش بدوش کام کیا ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی، چک بست لکھنوی، منشی پریم چند، سدرشن، علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی، منشی تلوک چند محروم، پروفیسر رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کی بیش بہا تصنیفات سے کون اردو داں واقف نہیں ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی گرانقدر تحقیق کے مطابق اردو زبان کا آغاز ۱۰۰۰ء کے قریب ہوتا ہے جب مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے اور

بہت جلد شمالی ہند کو زیر تسلط کر کے انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ یہاں سکونت اختیار کی۔ کھڑی بولی (اردو) قدیم زمانہ سے دہلی اور اس کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ یہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے[۱] بقول مولانا حالی اردو زبان کی بنیاد ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے اور اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسمار کا ہندی سے ماخوذ ہیں[۲]

مسلمانوں نے شمالی ہند میں سب سے پہلے ۹۸۶ء کے قریب سکونت اختیار کی جب سبکتگین نے پنجاب کے راجہ جے پال کو شکست دے کر پنجاب سے پشاور تک اپنے قبضہ میں کر لیا۔ سبکتگین کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۰ء سے ۱۰۲۷ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کر کے پیشاور، ملتان، کالنجر، قنوج، متھرا اور گجرات پر قبضہ کر لیا۔ پنجاب پر خاندان غزنوی کی حکومت کم و بیش ایک سو ستر سال تک رہی۔ باہمی گفتگو کے لئے علاوہ فارسی کے ہندوستانی زبان کا سیکھنا اور اس میں اپنی زبان کے الفاظ ملا کر بولنا ناگزیر تھا۔ پنجاب میں مختلف اقوام اور ممالک کے مسلمان (عرب، ترک، مغل، ایرانی اور افغانستانی) مقیم تھے اور انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ میل جول اور معاشرتی تعلقات پیدا کیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی مغربی ہندی کے الفاظ اپنی زبان میں اور ہندوؤں نے فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں باہمی گفتگو کے لئے شامل کرنا شروع کئے جس سے ایک

---

[۱] مقدمہ تاریخ زبان اردو از ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص۳۸، ص۴۹، ص۸۳، ص۸۵

[۲] مقدمہ شعر و شاعری (پہلا ایڈیشن) ص۱۰۰

مخلوط زبان (اردو) کی تخلیق کا آغاز ہوا۔ یہی نہیں بلکہ مختلف اقوام کے افراد نے ایک دوسرے کی زبان کو سیکھنا شروع کیا۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ دربار غزنوی میں تلک ہندی اور بہرام ایسے زباندان موجود تھے جو ہندوستانی اور ایرانی دونوں زبانوں کے ماہر تھے اور بآسانی ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ کر دیتے تھے۔

اس عہد کی زبان کا مستند نمونہ چند بردائی (۱۱۵۹ء-۱۱۹۲ء) کی تصنیف پرتھوی راج راسو ہے۔ اس کتاب کی زبان قدیم اپ بھرنش کہلاتی ہے جس پر راجستھانی کا اثر نمایاں ہے۔

قطب الدین ایبک نے جب ۱۲۰۶ء میں دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو مسلمان بہت بڑی تعداد میں لاہور سے ہجرت کر کے دہلی آئے اور یہاں سکونت اختیار کی۔ وہ لاہور میں فارسی آمیز زبان بولتے تھے۔ دہلی آکر انھیں کئی بولیوں سے روشناس ہونا پڑا۔ دہلی کے شمال میں ہریانی، شمال مشرق میں (دہلی اور میرٹھ کی) پرانی کھڑی بولی اور جنوب مشرق میں (متھرا کے آس پاس) برج بھاشا بولی جاتی تھی۔ انھوں نے برج بھاشا کی بہ نسبت کھڑی بولی اور ہریانی کو اپنی زبان سے ملتا جلتا پایا جسے وہ بہت جلد سیکھ گئے۔

خاندان غلام کے سلاطین کے زمانہ میں اس مخلوط زبان کی بڑی اشاعت ہوئی۔ صوفیائے کرام نے اپنے عقاید کی تبلیغ کے لیے یہاں کی مقامی زبان کو اپنایا۔ چنانچہ اس وقت قدیم اردو کے جتنے فقرے دریافت ہوئے وہ صوفیائے کرام کے ملفوظات ہیں۔ اردو کی بہت سی قدیم مذہبی کتابیں خواہ وہ دکنی ہوں یا

گجراتی صوفیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔

مخلوط ہندوستانی کے قدیم نمونے امیر خسرو (۱۲۵۳ء - ۱۳۲۵ء) کی تصنیفات میں ملتے ہیں۔ شمالی ہند میں خسرو کے بعد سکندر لودی (۱۴۸۹ء - ۱۵۱۷ء) کی تخت نشینی کے زمانہ تک ریختہ کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ سکندر لودی شاعر تھا اور گلرخ تخلص کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں علم کی بڑی ترقی ہوئی۔ ہندو خاص کر کایستھ فارسی پڑھ کر دفاتر میں ملازم ہوئے۔ ان کے ذریعہ فارسی وعربی اصطلاحات کو ملک میں پھیلنے کا زیادہ موقع ملا۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ کبیر کے دوہوں، گرونانک کے گرو گرنتھ صاحب اور تلسی داس کی راماین میں عربی وفارسی کے بہت الفاظ ملتے ہیں۔

شاہان مغلیہ کے عہد میں ہندو فارسی وعربی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرنے لگے تھے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں زبان فارسی کی تعلیم حصول ملازمت کے لئے لازم قرار پائی۔ اس لئے ہندوؤں نے خاص کر کائستھوں، چھتریوں اور کشمیری پنڈتوں نے اس عہد میں بڑے ذوق وشوق سے فارسی زبان پڑھنا شروع کی اور اس زبان میں کافی مہارت پیدا کی۔ ان لوگوں نے فارسی کے شیریں الفاظ کو اردو میں شامل کر کے اسے توسیع وترقی کے راستے پر لگایا۔

شاہجہاں کے عہد میں اس مخلوط زبان کی جسے اب تک ہندی، ہندوی، زبان دہلوی یا ریختہ کہتے تھے بڑی ترقی ہوئی۔ اس عہد میں یہ زبان بات چیت کے درجہ سے ترقی کر کے خط وکتابت کی بھی زبان ہو گئی۔ چونکہ یہ زبان شہرپناہ کے اندر بازار لشکر میں خاص طور سے بولی جاتی تھی اس لئے ریختہ کے بجائے

اس کا نام اس وقت سے اردو ہوا۔

شمالی ہند میں عہد عالمگیر تک شعراء وادبا نے اردو کو جولانگاہ فکر نہیں بنایا تھا۔ دفتری و درباری زبان فارسی تھی۔ اس لئے ادبی، علمی اور تاریخی تصانیف و نیز نظم و نثر پر فارسی کا قبضہ تھا۔ اردو یا ریختہ کی ابھی تک کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں تمام مشہور شعراء فارسی کے تھے۔

دکن میں اردو کی نشو و نما

اردو ادب کی تاریخ چودھویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک دکن سے خاص طور پر تعلق رکھتی ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے جب گجرات اور دکن کو ۱۳۱۰ء تک اپنے قلمرو میں داخل کر لیا تو مسلمان دکن میں جا کر آباد ہو گئے اور ان کے ساتھ اردو زبان بھی دکن پہنچی۔ سلطان محمد تغلق نے جب ۱۳۳۵ء تک سارے ہندوستان کو اپنے زیر حکومت کر لیا تو اس نے دیوگری کو پایہ تخت بنایا اور دہلی کے تمام باشندوں کو حکم دیا کہ وہ دہلی چھوڑ کر دیوگری چلے جائیں اور وہاں آباد ہوں۔ اس واقعہ سے زبان دہلوی کی دوسری بڑی لہر دکن پہنچی جس سے وہاں اردو زبان کی نشو و نما میں بڑی مدد ملی۔ دکن میں شاہان گولکنڈہ و بیجاپور کے عہد میں اس زبان نے بڑی ترقی اور مقبولیت حاصل کی۔ قطب شاہی خاندان کا پانچواں فرمانروا سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء-۱۶۱۱ء) فارسی اور ریختہ کا زبردست شاعر تھا۔ اسی زمانے میں بیجاپور بھی زبان اردو کا گہوارہ تھا۔ وہاں عادل شاہی خاندان

کے کئی بادشاہ شاعر اور ادب نواز تھے۔ ابراہیم عادل شاہ نے اردو کو ۱۵۳۶ء کے قریب عدالت کی زبان قرار دی۔ شاہان گولکنڈہ و بیجاپور کی ادب نوازی نے دکن میں کثرت سے شعراء پیدا کئے جن میں وجہی، خاکی، نوری، غواصی اور ولی ممتاز شاعر تھے۔

دکن سے اردو شاعری کے مرکز کا تبادلہ

محمد شاہ کے عہد میں ۱۷۲۲ء میں ولی اپنا دیوان ریختہ لے کر جب دوبارہ اورنگ آباد سے دہلی آئے تو اہل دہلی نے ان کے اردو کلام کی خوب قدر کی۔ جس سے یہاں کے فارسی گو شعراء آبرو، مضمون، جانجاناں، حاتم، ناجی، یکرنگ اور فغاں وغیرہ اردو شعر گوئی کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ اہل دہلی کو اردو شاعری سے اس قدر دلچسپی پیدا ہو گئی کہ ولی کے سیکڑوں متبع پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے دہلی میں اب اردو شاعری فارسی کے دوش بدوش ترقی کر کے اس کی حریف بن گئی اور اردو شاعری کا مرکز دکن سے تبدیل ہو کر شمالی ہند میں پھر آ گیا۔

اردو ادب میں ہندو شعرا کی خدمات

غزل:- غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ یہ سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ مشکل صنف بھی ہے۔ غزل کے فرسودہ اور مبتذل اشعار کہنا بہت آسان ہے۔ مگر ایسے اشعار کہنا جو دلچسپ و موثر ہوں

اور جن میں تخیل کی بلندی اور مضامین کی جدت ہو بہت مشکل ہے۔غزل کے اچھے اشعار کہنا مبتدی اور معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔اچھی غزلیں کہنے کے لیے قابلیت اور لیاقت کے علاوہ بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہے۔

اردو غزل گوئی کے ہر دور میں مسلم اساتذہ کے دوش بدوش ہندوؤں میں بھی متعدد نامور اور قابل قدر شاعر گزرے ہیں۔

اردو شاعری کا دور اول (۱۷۰۰ء-۱۷۵۰ء)

آبرو اور حاتم کا زمانہ

اردو شاعری کے دور اول میں نامور اور ممتاز مسلم شعرار آبرو، حاتم، مضمون، یکرنگ اور مظہر جانجاناں تھے۔ اسی دور میں ہندوؤں میں علاوہ دیگر شعرار کے لالہ ٹیک چند بہار اور رائے آنند رام مخلص بڑے نامور شاعر ہوئے ہیں۔ انھیں شعرار نے شمالی ہند میں اردو غزل گوئی کی داغ بیل ڈالی۔ شعر و سخن کی جس شمع کو انھوں نے روشن کیا اس کی روشنی نہ صرف برابر پھیلتی رہی بلکہ وہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ برابر بڑھتی چلی گئی۔ لالہ ٹیک چند بہار نے اردو زبان کی خدمت ایک مستند لغت "بہار عجم" لکھ کر بھی کی۔

دور دوم (۱۷۵۰ء-۱۸۰۰ء)

یہ دور میر و سودا کا زمانہ کہلاتا ہے۔ میر اور سودا اردو شاعری کے

رکن رکیں اور اساتذہ محترم مانے جاتے ہیں۔ ان کا زمانہ اردو شاعری کا زریں عہد تصور کیا جاتا ہے۔ جس میں تمام اصناف سخن کو انتہائی عروج حاصل ہوا۔ غزل گوئی میں میر کی غزلوں، قصیدہ گوئی میں سودا کے قصائد، صوفیانہ شاعری میں خواجہ میر درد کی غزلیات اور مثنوی نگاری میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا اردو شاعری میں جواب نہیں ملتا۔ میر اور سودا آسمان شاعری کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ان کے کلام کی روشنی سے آج بھی اردو تابندہ و روشن ہے۔

اسی عہد سے تذکرہ نویسی کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے میر نے ۱۷۵۲ء میں تذکرہ 'نکات الشعرا' لکھا۔ اس کے بعد میر حسن نے تذکرہ 'شعرائے اردو' لکھا۔ ہندوؤں میں لالہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے بھی ۱۷۶۱ء میں تذکرہ 'چمنستان شعرا' لکھا جس میں اردو کے ۲۱۲ شعرا کا ذکر بہ زبان فارسی کیا گیا ہے۔

اس عہد کے ہندو شعرا نے بھی اپنے ہمعصر مسلم شعرا کی طرح اردو ادب کی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ انھوں نے بھی مسلم اساتذہ کی طرح ثقیل ہندی الفاظ کو متروک قرار دیا اور زبان کی صفائی پر توجہ دی۔ فارسی الفاظ و تراکیب کو اپنے کلام میں استعمال کر کے زبان کو وسعت و ترقی بخشی۔ اس دور میں ممتاز ہندو شعرا کی تعداد ۶ ہے جن میں سرب سنگھ دیوانہ لکھنوی نے استادی کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ ہندو شعرا نے اپنے دل حبیب کلام سے ہندو اور مسلمان دونوں میں اردو کا عام مذاق پیدا کیا جس سے اس کی مقبولیت

اور دلفریبی میں اضافہ ہوا۔

دور سوم۔ انشاؔ اور مصحفیؔ کا زمانہ (۱۸۰۰ء-۱۸۲۴ء)

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے پیہم حملوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار سے جب سلطنت مغلیہ برباد اور دہلی تباہ ہو گئی تو لوگ دہلی چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اس دور میں لکھنؤ میں آصف الدولہ کے دربار کے علاوہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار شعرائے دہلی کی جائے پناہ تھی۔ چنانچہ دہلی سے میرؔ اور سوداؔ کے بعد انشاؔ اور مصحفیؔ بھی لکھنؤ چلے آئے جس سے اس دور میں اردو شاعری کا مرکز دہلی سے ہٹ کر لکھنؤ آ گیا۔ مصحفیؔ اور انشاؔ اس دور کے سب سے بڑے شاعر اور مسلم الثبوت استاد تھے۔

اس دور میں اردو شاعری نوابان اودھ اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئی جس کا اردو شعرا کے مذاق شاعری پر بہت برا اثر پڑا۔ شاعری میں ابتذال اور شہوت پرستی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ حسرتؔ، جرأتؔ، انشاؔ اور رنگینؔ وغیرہ مبتذل اشعار اور معاملہ بندی کے بڑے دلدادہ تھے۔ مگر مذاق شاعری میں پستی نمودار ہونے کے ساتھ ساتھ اس دور میں فن شعر کی بڑی ترقی ہوئی۔ اہل لکھنؤ اس زمانہ میں شاعری کے پیچھے اتنا دیوانہ ہوئے کہ مشاعرے گھر گھر اور روزانہ ہونے لگے۔ ایک ایک استاد کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ انشاؔ اور مصحفیؔ اپنے شاعرانہ کمالات کے اظہار کے لئے بیشتر سنگلاخ زمینیں اختیار کرتے تھے اور اکثر دو غزلہ

وسہ غزلہ کہہ کر اپنی طبیعت کا زور دکھاتے تھے۔ فن شعر کی ترقی کے ساتھ ساتھ اصلاح زبان کا کام بھی اس عہد میں جوش و خروش کے ساتھ جاری تھا۔ بہت سے بھدے اور ثقیل الفاظ جو میر اور سودا کے زمانے میں باقی رہ گئے تھے زبان سے خارج کر دیے گئے اور ان کی جگہ فارسی و عربی کے نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لے لی۔ جس سے زبان میں صفائی اور روانی پیدا ہو گئی۔ انشا نے زبان کی ترقی و توسیع کے لیے بڑی جد و جہد کی۔

منشی سدا سکھ نثار دہلوی شاگرد مرزا سودا، منشی موجی رام موجی لکھنوی، اور راجہ جسونت سنگھ پروانہ لکھنوی اس دور کے ممتاز ہندو شعرا ہیں۔ لکھنوی شاعری کی عام پست مذاقی سے بالاتر ہونا اس دور کے ہندو شعرا کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ہندو شعرا نے ایسے ماحول میں بھی میر اور سودا کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہندو شعرا فارغ البال ہونے کے باعث شاہی دربار سے الگ رہتے تھے۔ اس دور کے ہندو شاعر منشی سدا سکھ نثار دہلوی کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ شریمد بھاگوت کو اردو نظم کی شکل میں پیش کرنا ہے۔ اس کتاب میں تقریباً پچاس ہزار اشعار ہیں۔ اردو کی پہلی مربوط اور طولانی نظم ہونے کی وجہ سے یہ ایک بڑی گرانقدر تصنیف ہے۔

دورِ چہارم۔ ناسخ اور آتش کا عہد (۱۸۲۴ء-۱۸۳۷ء)

لکھنؤ اسکول کا آغاز

اس دور میں ناسخ کی جدت پسند طبیعت نے شعرائے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ کر اظہار جذبات کے لئے ایک نیا راستہ نکالا جس سے لکھنؤ اسکول کے شعرا کی خاص توجہ شعر کو ظاہری حسن سے آراستہ کرنے پر ہوئی۔ چنانچہ ناسخ اور شاگردانِ ناسخ نے پرشکوہ الفاظ، رعایت لفظی، تکلف و تصنع آمیز زبان، فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت، دور از کار تشبیہات و استعارات کی بھرمار، فضول مبالغے اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی وغیرہ کو شاعری کے محاسن میں داخل کیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان شعرا کے کلام میں لطافت اور تاثیر کا فقدان نظر آتا ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ اصلاح زبان کی تکمیل ہے جو ناسخ کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ ناسخ نے ثقیل اور بھدے الفاظ و افعال کو شاعری کے لئے متروک قرار دیا اور ان کی جگہ فصیح الفاظ کو رواج دیا۔

اس دور میں ہندو شعرا نے نہایت گرانقدر ادبی خدمات انجام دیں۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم کہہ کر میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے بعد ایک دوسری بے نظیر مثنوی کا اردو ادب میں اضافہ کیا۔ منشی چھنو لال دلگیر نے مرثیہ گوئی میں خوب نام پیدا کیا۔ ان کے مراثی چار ضخیم جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں۔ منشی مول چند منشی نے شاہنامہ فردوسی کا منظوم ترجمہ کر کے اردو ادب میں ایک گرانقدر رزمیہ نظم کا اضافہ کیا۔ اس دور میں منشی خوب چند ذکا دہلوی نے اردو

شعرار کا ایک بہت بڑا تذکرہ معروف بہ 'عیار الشعرار' تالیف کیا۔ اسی دور میں مہاراجہ چندو لال شاداںؔ وزیر اعظم و مدار المہام سرکار دکن نے شعرار و نیز دیگر ارباب کمال کی سرپرستی، فیاضی اور مہماں نوازی میں بڑی شہرت حاصل کی۔

دور پنجم۔ ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کا زمانہ (۱۸۲۷ء - ۱۸۶۷ء)

یہ دور اردو ادب کی تاریخ کا بہترین عہد تصور کیا جاتا ہے جس میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ ایسے شعرائے باکمال اور عدیم المثال کی خدمات نے اردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ غالبؔ اور مومنؔ نے علوئے تخیل اور معنی آفرینی کے دریا بہا کر گلستان شاعری کی آبیاری کی تو ذوقؔ اور ظفرؔ نے پاکیزگی تخیل اور سلاست زبان کے چشمہائے نکال کر اس کو شادابی بخشی۔ ان شعرار کے دم سے اردو شاعری کا مرکز لکھنؤ سے ہٹ کر ایک بار پھر دہلی میں قائم ہوا۔

اس دور میں ہندو شعرار میں منشی مینڈو لال زارؔ لکھنوی، منشی گھنشیام لال عاصیؔ دہلوی، تجرؔ لکھنوی، بیقبرؔ سکندر آبادی اور راجہ بلوان سنگھ اکبر آبادی نے غزل گوئی میں شہرت حاصل کی۔ منشی مینڈو لال زارؔ لکھنؤ میں ایک نامی گرامی استاد گزرے ہیں۔ عاصیؔ شاہ نصیرؔ کے مایہ ناز شاگرد اور مرزا غالبؔ اور استاد ذوقؔ کے ہمعصر تھے۔ عاصیؔ کو مختلف اصناف سخن پر پوری قدرت حاصل تھی۔ منشی بالمکند بیقبرؔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور اپنے زمانہ میں ایک نامی گرامی استاد تھے۔ یہ ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، تفتہؔ اور شیفتہؔ وغیرہ شعرار کے

ہم عصر اور ہم مشاعرہ تھے۔ پنڈت بشمبر ناتھ تجر لکھنؤ کے ایک نامور اور خوشگو شاعر تھے۔ ان ہندو شعرار کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لفظی رعایت، ابتذال اور رکاکت سے پاک ہے۔ معنی آفرینی، علاوہ تخیل اور زبان کی صفائی وسلاست ان کے کلام کے جوہر ہیں۔

دورِ جدید طبقہ اول (تقریباً ۱۸۶۸ء لغایت ۱۸۹۰ء)

اردو شاعری کی اصلاح وترقی کا عہد

پہلی جنگ آزادی اور تباہی دہلی نے عیش ونشاط کی رہی سہی محفلیں بھی برباد کردیں۔ اب لوگ خواب غفلت سے چونک کر عملی دنیا میں مشغول ہوگئے اس کے علاوہ جنگ آزادی کے بعد انگریزی تعلیم نے بھی آزادئ خیال اور وسعت نظر کی ایک نئی روح ہندوستانیوں میں پھونکی۔ اس نے اردو شعرار کا مطمح نظر اور اردو شاعری کا دائرہ وسیع کردیا۔ بقول رام بابو سکسینہ آزاد اور حالی نے اس دور میں طرز قدیم کی اردو شاعری پر کہ جس میں تصنع وتکلف اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں ضرب کاری لگائی اور اسے تصنع وتکلف اور فرسودہ ورسمی روایات سے آزاد کیا۔

آزاد اور حالی کی نظروں میں غزل کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کے لیے تنگ اور ناموزوں پایا گیا۔ فطری مناظر اور مختلف قومی، سماجی اور اخلاقی عنوانات کو قلمبند کرنے کے لیے انھوں نے مسدس کو اپنایا اور نظم نگاری کا رواج بڑھایا۔

غزل گوئی میں امیر مینائی اور داغ دہلوی اس دور کے سر برآوردہ شعراء اور اساتذہ ہیں۔ ہندو شعراء میں منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی اور لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی قابل قدر غزل گو ہوئے ہیں۔ ان شعراء کا کلام فضول مبالغہ، تناسب لفظی، فرسودہ مضامین اور رسمی روایات سے پاک ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں واقعات زندگی اور جذبات قلبیہ کے ساتھ بے ثباتی دنیا اور فلسفہ و حقائق کا اظہار بھی مدنظر رکھا ہے۔

دور جدید طبقہ دوم نظم نگاری کا دور (تقریباً ۱۸۹۰ء-۱۹۳۰ء)

اس دور میں انگریزی تعلیم اور انگریزی ادب کی واقفیت نے اردو نظم و نثر کی اصلاح اور ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ جب اردو شعراء کو یہ معلوم ہوا کہ کس طرح انگلینڈ کے شعراء اپنی نظموں سے اپنے وطن والوں کے دلوں میں حُبِ وطن، آزادی اور ترقی و اصلاح کا جوش بھر دیتے ہیں تو انھوں نے بھی اپنی ناامید اور مصیبت زدہ قوم کی حوصلہ افزائی اور ترقی و اصلاح کے لئے اپنے شبدیز شاعری کا باگ سماجی، قومی، وطنی اور نیچرل نظم نگاری کی طرف موڑا اور انھوں نے بھی اپنی نظموں کو حب وطن اور قومی اصلاح کا محرک بنایا۔

جدید اردو شاعری کے بانی اور نظم نگاری کے محرک مولانا آزاد اور حالی تھے۔ مولانا آزاد نے مئی ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ایک ادبی انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن کے مشاعروں میں غزل کے لئے کوئی طرح دینے کے بجائے کسی نظم کا عنوان یا موضوع دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی انجمن کے

مشاعروں میں پڑھنے کے لئے آزاد نے مثنوی شب قدر، مثنوی حب وطن، مثنوی ابر کرم، صبح امید اور گنج قناعت وغیرہ نظمیں لکھیں۔ اور اس طرح نظم نگاری کو فروغ دیا۔ حالی نے بھی اس انجمن کے مشاعروں میں پڑھنے کے لئے برکھارت، نشاط امید، مناظرہ رحم و انصاف اور حب وطن وغیرہ نظمیں لکھی تھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ حالی نے 'مدو جزر اسلام' لکھ کر نظم نگاری میں مسدس کی اہمیت ثابت کی۔ اور جدید رنگ کی غزلیں کہہ کر انھوں نے طرز قدیم پر جس میں تکلف و تصنع اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں، ضرب کاری لگائی۔ آزاد اور حالی کے بعد نظم نگاری کے صنف کو فروغ اور ترقی دینے والے شعراء میں اسمٰعیل میرٹھی اور سرور جہان آبادی سب سے پہلے آتے ہیں۔ ان کے بعد ڈاکٹر اقبال اور ممتاز ہندو شعراء میں منشی سورج نراین مہر دہلوی، چکبست لکھنوی، منشی مہاراج بہادر برق دہلوی، چودھری جگت موہن لال رواں اناوی اور منشی تلوک چند محروم کا شمار ہوتا ہے۔

اس دور سے قبل اردو شاعری سے نہ کسی عملی زندگی کا سبق ملتا تھا اور نہ اس سے ہماری قومی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی اصلاح و بہتری کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ اس دور کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ دلچسپ اور کار آمد نظموں کا بہت بڑا ذخیرہ پیش کر کے اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کرنا ہے۔ اس دور کے شعراء نے اپنی ملکی، قومی، تاریخی اور اخلاقی نظموں کو لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے اور ملکی آزادی حاصل کرنے کے جوش کو ابھارنے کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے ملکی، قومی، تاریخی اور اخلاقی

عنوانات پر بے شمار ایسی پر جوش اور جذبات انگیز نظمیں لکھیں جنھوں نے قوم کے قلب مردہ میں ایک تازہ روح پھونک دی اور اسے اصلاح و ترقی کے ذریعہ غلامی کی زنجیر توڑ کر آزاد ہونے کے لئے کمر بستہ کیا۔

دور جدید کی ایک نمایاں اور قابل قدر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو شعرار خصوصاً ڈاکٹر اقبال، سرور جہان آبادی، چکبست اور مہاراج بہادر برق وغیرہ نے غیر ملکی اشیار اور روایات کے ذکر سے گریز کر کے اپنے ملک کی اشیار قومی روایات و خصوصیات، قدرتی مناظر اور وحش و طیور کے ذکر سے اپنی نظموں کو دلآویز بنانا اپنا فرض خیال کرنے لگے۔

دور جدید میں غزل گوئی میں بھی نمایاں اصلاح اور ترقی ہوئی غزل میں بے کیف مبالغہ، خلاف واقعہ باتیں اور تکلف و تصنع کے بجائے شوار اب اصلیت اور صداقت کا لحاظ رکھنے لگے اور غزل کے خارجی پہلو کے بجائے وہ داخلی پہلو پر زیادہ توجہ دینے لگے۔

ہندو شعراء کی دیگر ادبی خدمات

۱۔ مثنوی :۔

ہندو شعرار کی خدمات غزل اور نظم نگاری کے علاوہ مثنوی نویسی میں بھی نہایت اہم اور گرانقدر ہیں۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے ۱۸۳۶ء میں مثنوی گلزار نسیم لکھ کر میر حسن دہلوی کی مثنوی سحر البیان کے جواب میں ایک دوسری بے نظیر مثنوی کا اردو ادب کے خزانہ میں اضافہ کیا۔ گلزار نسیم اردو کی ایک

مایہ ناز مثنوی ہے جو اپنی شاعرانہ خوبیوں کے باعث نہایت مقبول اور مشہور ہوئی۔

منشی بنواری لال شعلہؔ کی مثنوی برج چھب حالانکہ ہندوؤں کے ایک مذہبی موضوع پر لکھی گئی ہے، مگر وہ اپنی زبان اور طرز بیان کی خوبیوں کے باعث ہر مذہب اور ہر فرقہ کے صاحب ذوق و شوق کے لئے ادبی خوبیوں سے مالا مال ملے گی۔ مثنوی برج چھب شعلہ کی ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔

ہندو شعراء کی ادبی مثنویوں میں مثنوی گلزار نسیم کے بعد منشی جوالا پرشاد برقؔ کی مثنوی بہار، کا نمبر آتا ہے۔ اپنی خوبیٔ زبان، اختصار اور دلچسپ پیرایۂ بیان کے باعث یہ مثنوی بھی بہت مقبول اور مشہور ہوئی۔

متذکرہ بالا شعراء کے علاوہ متعدد دیگر ہندو شعراء نے بھی مثنویاں لکھی ہیں جو طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

ب۔ مرثیہ

ہندو شعراء نے اپنے تخیل کی جولانیاں نہ صرف غزل، رباعی، مسدس، قصیدہ اور نظم نگاری وغیرہ اصناف سخن میں بلکہ مرثیہ نویسی میں بھی دکھلائی ہیں۔ ہندو شعراء میں منشی چھنو لال دلگیر نے مرثیہ گوئی میں خوب نام پیدا کیا حتیٰ کہ وہ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے زمانہ کے مرثیہ گویوں کے سرتاج سمجھے جاتے تھے۔ ان کے مراثی چار ضخیم جلدوں میں مرتب ہو کر طبع ہو چکے ہیں۔

دلگیر کے علاوہ منشی کنور سین مضطر لکھنوی، راجہ الفت رائے لکھنوی اور

لالہ نانک چند لکھنوی وغیرہ نے بھی مرثیہ گوئی میں شہرت حاصل کی۔

س۔ ہندو شعراء کا اردو ادب میں ہندوؤں کے مذہبی عنصر کی تکمیل کرنا:۔

اردو ادب انیسویں صدی کے نصف حصہ تک محض اہل اسلام کے مذہبی اعتقادات اور رسوم و روایات کی آئینہ داری کرتا تھا۔ اس میں ہندو مذہب کے اعتقادات اور روایات و رسوم کے اظہار کا فقدان تھا۔ یہ ایک بڑی خامی تھی جو اردو کو مقبول عام اور ہر دل عزیز بنانے میں سنگ راہ کا کام کر رہی تھی۔ ہندو شعراء اس خامی کا شدید احساس کر کے اسے جلد دور کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ منشی سورج نراین مہر دہلوی، سرور جہان آبادی، شعلہ علیگڑھی، چکبست اور منشی مہاراج بہادر برق دہلوی وغیرہ نے علاوہ نیچرل، وطنی، قومی اور اخلاقی نظمیں لکھنے کے مذہبی عنوانات پر بھی نظمیں خوب لکھیں۔ مگر اس طرف اپنی خاص توجہ دینے والے شعراء میں منشی جگناتھ خوشتر لکھنوی، منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی، منشی گور سہائے بھگتی کاکوروی، منشی رام سہائے تمنا لکھنوی اور منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کے کارنامے نہایت گرانقدر اور غیر فانی ہیں۔ انھیں شعراء کی جانفشانیوں اور ادبی خدمات کی بدولت اردو ادب میں ہندوؤں کے مذہبی عنصر کی تکمیل ہوئی جو ہندو شعراء کا اردو ادب میں ایک خاص اور گرانقدر اضافہ ہے۔ ہندو شعراء کے اس اہم اضافہ کی وجہ سے اردو ادب اہل اسلام اور اہل ہنود کا مشترکہ ادب کہلانے کا فی الحقیقت مستحق ہو گیا۔

د ۔ ہندو شعرا کا فارسی کی مشہور کتب کا ترجمہ کرنا :۔

ہندو شعرا نے اردو زبان کی خدمات انجام دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا چنانچہ انھوں نے نہ صرف ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتب بلکہ فارسی زبان کی مشہور کتابوں کا بھی اردو میں منظوم ترجمہ کر کے اردو ادب کو مالا مال کیا ۔ منشی مول چند منشی نے شمشیر خانی اور شاہنامہ فردوسی کا ۱۸۰۸ء میں اردو نظم میں ترجمہ کر کے اردو ادب میں رزمیہ نظموں کا اضافہ کیا۔

منشی طوطا رام شایاں لکھنوی نے مہابھارت منظوم (مطبوعہ ۱۸۶۲ء)، قصہ امیر حمزہ منظوم معروف بہ طلسم شایاں اور الف لیلہ منظوم وغیرہ تصنیف کر کے شہرت حاصل کی ۔ ان کے علاوہ چند اور شعرا نے بھی اس طرف اپنی خاص توجہ مبذول فرمائی ۔ منشی شادی لال چمن نے کتاب الف لیلہ جلد چہارم کو منظوم کی جو ۱۸۶۵ء میں طبع ہوئی ۔ منشی لالتا پرشاد شفق لکھنوی شاگرد منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی نے قصہ چہار درویش کو 'بہار شفق' کے نام سے منظوم کیا۔ منشی ماتا پرشاد بسمل نے فسانہ عجائب کو نظم کیا ۔ دیوان جانی بہاری لال رئیس آگرہ (متوفی ۱۸۹۵ء) کی تصنیفات گلستان، بوستان اور انوار سہیلی نظم اردو میں طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں ۔

ر ۔ ہندو شعرا کی تذکرہ نویسی :۔

ہندو شعرا نے اردو زبان کی خدمت نہ صرف شعر و شاعری کے ذریعہ کی بلکہ اس کی مقبولیت اور توسیع و ترقی کے لئے شعرا کے تذکرے بھی لکھے ۔ چنانچہ سب سے پہلے دور دوم میں میر تقی میر کی طرح لالہ لچھمی نراین شفیق

اورنگ آبادی نے بھی ۱۸۵۸ء میں تذکرہ 'چمنستان شعراء' لکھا جس میں تمام ہندوستان کے تقریباً ۲۱۳ شعراء کا ذکر بزبان فارسی تحریر کیا گیا ہے۔

منشی درگا پرشاد نادر دہلوی (متولد ۱۸۳۲ء) نے تقریباً پچاس کتابیں تصنیف کی تھیں۔ انھوں نے دکن کے شاعروں کا ایک تذکرہ بنام 'گلدستہ نادر الافکار' اور شاعرات کے دو تذکرے موسوم بہ 'چمن انداز' اور 'گلشن ناز' مرتب کر کے طبع کرائے تھے۔

منشی دیبی پرشاد بشاش اجمیری نے دس سال کی محنت شاقہ کے بعد تذکرہ 'آثار الشعرائے ہنود' تیار کر کے ۱۸۸۵ء میں طبع کرایا۔ اس تذکرہ میں ۵۲۴ ہندو شعراء کے حالات اور نمونہ کلام درج ہیں۔

منشی شیام سندر لال برق وکیل سیتاپور نے تذکرہ ہندو شعراء موسوم بہ 'بہار سخن' مرتب کیا جو ۱۹۳۲ء میں طبع ہوا۔

لالہ سری رام ایم۔ اے دہلی نے اردو شعراء کے نہایت ضخیم اور گرانقدر تذکرے مرتب کئے جن کی محض پانچ جلدیں 'خمخانہ جاوید' کے نام سے ۱۹۰۸ء میں طبع ہوئیں۔

پنڈت برج موہن کول تجبر اور پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق نے اردو اور فارسی کے کشمیری شعراء کا نہایت ضخیم تذکرہ 'بہار گلشن کشمیر' کے نام سے مرتب کیا جو دو جلدوں میں طبع ہو چکا ہے۔

منشی شام موہن لال جگر بریلوی نے حال ہی چند ممتاز ہندو شعراء کا ایک تذکرہ 'یادِ رفتگاں' کے نام سے لکھ کر طبع کرایا ہے۔

پس مندرجہ بالا سطور کے ملاحظہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تخلیق اور اس کی توسیع و اشاعت میں ہندوؤں کا اتنا ہی ہاتھ رہا ہے جتنا کہ مسلمانوں کا۔ بغیر ہندو اور مسلم اتحاد و اتفاق کے زبان اردو کا وجود میں آنا اور ادب اردو کا انتہائی عروج تک پہنچنا ایک امر محال تھا۔ بلا شبہ مسلمان شعراء و نثار نے اردو زبان کو معراج تک پہنچایا اور وہ کمال دکھایا جس کی کماحقہٗ ثنا و تعریف ممکن نہیں۔ لیکن اس زبان کو صاف کرنے، سنوارنے اور فروغ دینے میں ہندو شعراء و ادباء کی گرانقدر خدمات کو نظر انداز یا فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہندوؤں کی ادبی تصنیفات اردو سے علیحدہ کر دی جائیں تو اس کا ذخیرہ فی الواقعی قلیل اور حقیر نظر آئے گا۔

ہندی زبان و ادب کی نشو و نما بھی ہندو اور مسلم اتحاد کا رہین منت ہے۔ نہ صرف ہندوؤں نے بھاشا کو اپنی زبان سمجھا بلکہ مسلمانوں نے بھی اس زبان کو شوق سے سیکھا اور بعض نے اس میں وہ قابلیت پیدا کی کہ وہ ہندی ادب کے درخشاں ستاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جس طرح اردو ادب کو ہندو شعراء و ادباء نے مالا مال کیا اسی طرح ہندی ادب کو مسلمان کیوں میں خسرو، ملک محمد جائسی، رحیم، رس خان، عالم اور شیخ وغیرہ نے فروغ دیا۔

غرض کہ اردو زبان و شاعری نے ہندو اور مسلم اتحاد و اتفاق کو قایم کرنے اور اسے بڑھانے میں اب تک بڑا حصہ لیا ہے۔ ہندو شعراء نے مسلمان اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور ان کی اپنے ولی یا پیر کی طرح عزت کی۔ مسلمان اساتذہ نے اپنے ہندو شاگردوں کو پدری شفقت و عنایت کی نظر سے

دیکھا۔ اردو زبان و شاعری نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان پردۂ افتراق و نفاق کو یہاں تک ہٹا دیا کہ مسلمانوں نے بھی ہندو اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب شوق سے تہہ کیا۔ اردو مشاعروں میں آج بھی مسلم شعراء کے ساتھ ہندو شعراء بھی بلا امتیاز شریک ہوتے ہیں۔ اور اہل مجلس سے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے ہیں یکساں خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔

پس بعض تنگ خیال اور کوتاہ بیں لوگوں کا یہ قول ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی اور ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہے کتنا غلط اور گمراہ کن ہے۔ سیاسی رہنما انھیں اس طرح علیحدہ رکھنے کی کتنی ہی کوشش کریں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دونوں عوامی زبانیں ہیں۔ عوام نے انھیں پروان چڑھایا۔ عوام نے ان کی نشو و نما میں حصہ لیا اور عوام ہی ان کی آبیاری کرتے رہیں گے۔ ہندی اور اردو کی نشو و نما میں ہر قوم و ملت کا ہاتھ رہا ہے۔ ہندی کے ارتقا میں برابر مسلمانوں نے ہاتھ بٹایا اور اردو کے تحفظ و بقا کے لئے ہندوؤں نے کوششیں کیں۔ اردو ان کی اپنی زبان ہے اس کا ادب ان کا اپنا ادب ہے۔ کچھ لوگوں کے نفرت پھیلانے سے ہندوستانی عوام اردو سے نفرت نہیں کر سکتے ہندوستانی عوام کا آغوش محبت جیسے پہلے کشادہ تھا ویسے ہی آئندہ بھی کشادہ رہے گا۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

گنپت سہائے سریواستوا

اگست ۱۹۶۸ء

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مؤلف
		(ا)
۱	تاریخ زبان اردو	حکیم شمس اللہ قادری
۲	اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبد القادر سروری صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ۔ مطبوعہ ۱۹۵۶ء
۳	داستان تاریخ اردو	حامد حسین قادری
۴	مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ) ڈی۔ لٹ (پیرس)
۵	اردو ادب کی جدید تاریخ	نسیم قریشی (جدید ایڈیشن ۱۹۶۱ء)
۶	تعارف تاریخ اردو	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
۷	صحیفہ تاریخ اردو	سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی
۸	پنجاب میں اردو	حافظ محمود خاں شیرانی
۹	دکن میں اردو	مولوی نصیر الدین ہاشمی
۱۰	مدراس میں اردو	ایضاً

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مؤلف
۱۱	اردو زبان اور ادب	پروفیسر سید محمد ضامن علی ایم۔ اے
۱۲	تاریخ ادب اردو	رائے بہادر رام بابو سکسینہ ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی مترجمہ مرزا عسکری بی۔ اے
۱۳	تاریخ نثر اردو	احسن مارہروی
۱۴	مقدمہ آب حیات	محمد حسین آزاد
۱۵	عرب و ہند کے تعلقات	سید سلیمان ندوی
۱۶	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	جان بیمس مترجمہ پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبہ اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی۔
۱۷	امیر خسرو	محمد وحید مرزا۔ صدر شعبہ اردو و تہذیب و تمدن اسلامی۔ جامعہ لکھنؤ۔
۱۸	آب حیات کا تنقیدی مطالعہ	پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم۔ اے صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی۔
۱۹	داستان اردو	نواب سید نصیر حسین خاں خیال
۲۰	مغل اور اردو	ایضاً
۲۱	اردو زبان کی تاریخ	جوتمل واعظ لال ایم۔ اے
۲۲	تاریخ نظم و نثر اردو	آغا محمد باقر ایم۔ اے
۲۳	صحیفہ تاریخ اردو	سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی
۲۴	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین ایم۔ اے، ڈی۔ لٹ

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مؤلف
۲۵	نئے ادبی رجحانات	ڈاکٹر سید اعجاز حسین ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ
۲۶	جائزہ زبان اردو	انجمن ترقی اردو۔ دکن
۲۷	جدید اردو شاعری	مولوی عبد القادر
۲۸	خالق باری	محمود شیرانی
۲۹	پرتھی راج راسا	ایضاً
۳۰	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام	مولوی عبد الحق
۳۱	انسائیکلوپیڈیا برٹانکا (اردو زبان کی تاریخ)	
۳۲	خطبات گارساں دتاسی	مترجمہ و شائع کردہ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء
۳۳	جدید اردو شاعری	مولوی عبد القادر
۳۴	اردو شاعری	امیر احمد علوی
۳۵	سیر المصنفین (جلد اول)	مولوی محمد عیسیٰ تنہا بی۔ اے
۳۶	شعر الہند (حصص اول و دوم)	مولانا عبد السلام ندوی
۳۷	اردو غزل کی نشو و نما	ڈاکٹر سید رفیق حسین ایم۔ اے۔ بی۔ اے (آنرز)، ڈی فل، لکچرر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مؤلف
		(ث ب)
۳۸	نکات الشعرا	میر تقی میر
۳۹	ریاض الفصحا (تذکرہ ہندی گویاں)	غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق
۴۰	تذکرہ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی
۴۱	طبقات الشعرا (تذکرہ شعرائے اردو کا)	گارساں دتاسی مترجمہ ایف فیلن اور مولوی کریم الدین مطبوعہ ۱۹۴۸ء
۴۲	سخن شعرا	عبدالغفور خاں نساخ مطبوعہ ۱۲۸۱ء
۴۳	تذکرہ گلزار ابراہیم	علی ابراہیم خاں خلیل
۴۴	چمنستان شعرا	رائے لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی (۱۷۶۱ء)
۴۵	مجموعہ نغز۔ تذکرہ شعرائے اردو (بزبان فارسی)	حکیم ابوالقاسم قدرت اللہ قاسم (مطبوعہ ۱۸۰۴ء)
۴۶	تذکرہ ریختہ گویان	فتح علی حسینی گردیزی مرتبہ عبدالحق
۴۷	تذکرہ شعرائے دکن (حصص اول ودوم)	عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری۔ حیدرآبادی
۴۸	سخنوران دکن	مولانا تسکین عابدی
۴۹	محبوب الزمن۔ تذکرہ شعرائے دکن (حصص اول ودوم)	مولوی ابوتراب محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری حیدرآبادی۔ مطبوعہ ۱۳۲۹ھ
۵۰	گل عجائب	اسد اللہ خاں تمنا۔ اورنگ آبادی
۵۱	گل رعنا۔ تذکرہ شعرائے اردو	مولینا حکیم سید عبدالحی
۵۲	مراۃ الشعرا حصص اول ودوم	مولوی محمد یحییٰ تنہا۔